

توجیہ الآخبار فی شرح مشکل الآثار

جلد: دوم

مرتبین

طلبہ شعبہ تخصص فی الحدیث

اضافات و تنقیحات

(حضرت مولانا) قاضی محمد حسن ندوی مدھوبنی (صاحب)

(استاذ حدیث و فقہ: دارالعلوم ماٹلی والاء، بھروچ)

حسب حکم و ارشاد

(حضرت مولانا مفتی) اقبال بن محمد طنکاروی (صاحب)

(مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والاء، بھروچ)

کتاب کے متعلق ضروری معلومات

- کتاب کا نام : توجیہ الاخبار فی شرح مشکل الآثار
 مرتبین : طلبہ شعبہ تخصص فی الحدیث
 اضافات و تنقیحات : قاضی محمد حسن ندوی مدھوبنی
 (استاذ حدیث و فقہ: دارالعلوم ماٹلی والا)
 حسب حکم و اشارہ : حضرت مولانا اقبال صاحب ٹنکاروی دامت برکاتہم
 (مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم ماٹلی والا، بھروچ)
 صفحات : ۳۷۳
 سن طباعت : شعبان ۱۴۴۳ھ مطابق اپریل ۲۰۲۲ء

ملنے کا پتہ

مکتبہ: ابوبکر ربیع بن صبیح بصری
 دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، عمید گاہ روڈ، بھروچ
 گجرات، انڈیا۔ ۳۹۲۰۰۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست مضامین توجیہ الآخبار فی شرح مشکل الآثار (جلد دوم)

نمبر شمار	فہرست مضامین	باب	صفحہ
*	مقدمۃ الہ کتاب	*	۲۱
۱	چھینک کے آداب کا بیان	۷۸	۳۱
۲	تعارض		۳۲
۳	جمع و تطبیق		۳۲
۴	اقوال المحدثین		۳۲
۵	حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے مناقب کا بیان	۷۹	۳۶
۶	اشکال و جواب		۳۷
۷	اقوال المحدثین		۳۸
۸	جنابت کی حالت میں روزہ کی نیت کرنے کا بیان	۸۰	۳۹
۹	تعارض		۴۱
۱۰	جمع و تطبیق		۴۲
۱۱	نظیر		۴۳
۱۲	اقوال المحدثین		۴۴

۴۶	۸۱	مامورات و منہیات کے حکم میں فرق کا بیان	۱۳
۴۷		اقوال المحدثین	۱۴
۴۸		اشکال و جواب	۱۵
۵۰	۸۲	ایمان خوف اور رجاء کے درمیان ہے	۱۶
۵۲		اشکال و جواب	۱۷
۵۳		اقوال المحدثین	۱۸
۵۶	۸۳	سورہ آل عمران (۱۲۸) ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ﴾ کے شان نزول کا بیان	۱۹
۶۰		اقوال المحدثین	۲۰
۶۱	۸۴	قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”وَلَنْ يُوتِيَ اثْنَا عَشَرَ الْفَاكِنِ مِنْهُمْ“	۲۱
۶۲		تعارض	۲۲
۶۲		جمع و تطبیق	۲۳
۶۸	۸۵	مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کا عبادت کی غرض سے سفر کرنے کا بیان	۲۴
۷۰		تعارض - جمع و تطبیق	۲۵
۷۳	۸۶	مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی فضیلت کا بیان	۲۶
۷۴		تعارض - جمع و تطبیق	۲۷
۷۵		اقوال المحدثین	۲۸
۷۸	۸۷	احصار اور حج کے فوت ہو جانے کا بیان	۲۹

۷۹		اشکال و جواب	۳۰
۸۱		دوسرا اشکال	۳۱
۸۱		جواب	۳۲
۸۳	۸۸	حرام طریقے سے کسب معاش کا بیان	۳۳
۸۵		تعارض - دفع تعارض	۳۴
۸۶		اشکال و جواب	۳۵
۸۸	۸۹	جنابت کی حالت میں سہواً امامت کرنے کا بیان	۳۶
۸۹		تعارض - جمع و تطبیق	۳۷
۹۱		نظیر	۳۸
۹۲		اقوال المحدثین	۳۹
۹۴	۹۰	غصہ کی حالت میں قاضی کا فیصلہ کرنے کا بیان	۴۰
۹۵		تعارض - جمع و تطبیق	۴۱
۹۶		اقوال المحدثین	۴۲
۹۷	۹۱	الفاظ کنایہ سے وقوع طلاق کا بیان	۴۳
۹۸		اشکال و جواب	۴۴
۱۰۰		سوال و جواب	۴۵
۱۰۲	۹۲	الفاظ کنایہ میں سے لفظ ”فَخَلَى سَبِيلَهَا“ کا حکم اور اس کا بیان	۴۶

۱۰۳		اشکال و جواب	۴۷
۱۰۴		دوسرا اشکال و جواب	۴۸
۱۰۵		تیسرا اشکال اور جواب	۴۹
۱۱۱	۹۳	اللہ تعالیٰ ثواب دینے میں تھکتے نہیں	۵۰
۱۱۲		اشکال و جواب	۵۱
۱۱۳		نظیر	۵۲
۱۱۴		اقوال المحدثین	۵۳
۱۱۶	۹۴	ازواج مطہرات کے مناقب کا بیان	۵۴
۱۱۹		اشکال و جواب	۵۵
۱۲۱	۹۵	اکراہ کی حالت میں طلاق و عتاق کا بیان	۵۶
۱۲۱		اغلاق کا معنی	۵۷
۱۲۳		اشکال و جواب	۵۸
۱۲۴		اقوال المحدثین	۵۹
۱۲۵	۹۶	طلاق معلق اور عتاق معلق کا بیان	۶۰
۱۲۶		اشکال و جواب	۶۱
۱۲۸		نظیر	۶۲
۱۳۰	۹۷	یمین (قسم) کا بیان	۶۳
۱۳۳		اقوال المحدثین	۶۴

۱۳۴		اشکال و جواب	۶۵
۱۳۵		نظیر	۶۶
۱۳۶	۹۸	خواب کی تعبیر کا بیان	۶۷
۱۳۷		اقوال الحدیث	۶۸
۱۳۸		راج قول	۶۹
۱۳۹	۹۹	قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”لا تُقسِمُ“ کا مفہوم	۷۰
۱۴۰		اشکال و جواب	۷۱
۱۴۱		اقوال الحدیث	۷۲
۱۴۳	۱۰۰	تعبیر سے پہلے خواب کی حیثیت کا بیان	۷۳
۱۴۴		اشکال و جواب	۷۴
۱۴۵		دوسرا اشکال اور جواب	۷۵
۱۴۷	۱۰۱	فطرت کا معنی اور مفہوم کا بیان	۷۶
۱۴۸		تعارض - جمع و تطبیق	۷۷
۱۴۹		اقوال الحدیث	۷۸
۱۵۲	۱۰۲	عہد اول میں اسلام کی حیثیت کا بیان	۷۹
۱۵۴		اقوال الحدیث	۸۰
۱۵۵	۱۰۳	دودھ چھڑانے کے بعد مرضہ کو انعام و بخشش دینے کا بیان	۸۱
۱۵۶		سوال و جواب	۸۲

۱۵۷		اقوال المحدثین	۸۳
۱۵۹	۱۰۴	شق قمر واقعہ کا بیان	۸۴
۱۶۰		سوال و جواب	۸۵
۱۶۱		حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قول کی توجیہ	۸۶
۱۶۲		سوال و جواب	۸۷
۱۶۵	۱۰۵	قفیز طحان کی حیثیت کا بیان	۸۸
۱۶۶		مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ کی توجیہ	۸۹
۱۶۸	۱۰۶	جلسہ کے وقت کی دعاء کا بیان	۹۰
۱۷۱	۱۰۷	غلام آزاد کرنے کی فضیلت کا بیان	۹۱
۱۷۲		سوال و جواب	۹۲
۱۷۳		اقوال المحدثین	۹۳
۱۷۵	۱۰۸	قصاص کے وجوب کا بیان	۹۴
۱۷۶		تعارض	۹۵
۱۷۶		جمع و تطبیق	۹۶
۱۷۷		اقوال المحدثین	۹۷
۱۷۸	۱۰۹	ضیاع مال پر وعید کا بیان	۹۸
۱۷۹		سوال	۹۹
۱۷۹		جواب	۱۰۰

۱۸۰		اقوال المحدثین	۱۰۱
۱۸۱		دوسرا سوال جواب	۱۰۲
۱۸۳		اقوال المحدثین	۱۰۳
۱۸۴	۱۱۰	حلال و حرام اور امور مشتبہ کا بیان	۱۰۴
۱۸۵		سوال و جواب	۱۰۵
۱۹۰		اقوال المحدثین	۱۰۶
۱۹۲	۱۱۱	مسکوت عنہ امر کی حیثیت اور حکم کا بیان	۱۰۷
۱۹۳		تعارض و دفع تعارض	۱۰۸
۱۹۴		اقوال المحدثین	۱۰۹
۱۹۶	۱۱۲	دوسرے کے مال پر ظلماً قبضہ کرنے کا بیان	۱۱۰
۱۹۸		تعارض - جمع و تطبیق	۱۱۱
۱۹۸		اقوال المحدثین	۱۱۲
۲۰۱	۱۱۳	اہل بیت کی فضیلت کا بیان	۱۱۳
۲۰۲		سوال و جواب	۱۱۴
۲۰۵		تعارض اور دفع تعارض	۱۱۵
۲۰۷		اقوال المحدثین	۱۱۶
۲۱۰	۱۱۴	عورت، گھوڑا اور گھر سے بدشگونی لینے کا بیان	۱۱۷
۲۱۰		تعارض - جمع و تطبیق	۱۱۸

۲۱۲		اقوال المحدثین	۱۱۹
۲۱۳	۱۱۵	قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”لا غول“ کا مفہوم اور آیت الکرسی کی تلاوت کا اثر	۱۲۰
۲۱۵		سوال و جواب	۱۲۱
۲۱۶		اقوال المحدثین	۱۲۲
۲۱۸		”اقتروا الطیر علی مکناتھا“ کا معنی اور مفہوم کا بیان	۱۲۳
۲۲۰		اقوال المحدثین	۱۲۴
۲۲۱	۱۱۷	قصاب کو اجرت کے طور پر ذبیحہ کا گوشت دینے کا بیان	۱۲۵
۲۲۲		تعارض۔ جمع و تطبیق	۱۲۶
۲۲۲		اقوال المحدثین	۱۲۷
۲۲۳		سوال و جواب	۱۲۸
۲۲۵	۱۱۸	یمن والوں کے ایمان کی فضیلت کا بیان	۱۲۹
۲۲۶		تعارض۔ جمع و تطبیق	۱۳۰
۲۲۷		اقوال المحدثین	۱۳۱
۲۳۰	۱۱۹	قاری رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اُبی بن کعب، حضرت زید بن حارثہ اور حضرت معاذ بن جبیلؓ کے مناقب کا بیان	۱۳۲
۲۳۱		اشکال و جواب	۱۳۳
۲۳۲		نظیر	۱۳۴
۲۳۵	۱۲۰	غیر اللہ کے نام کی قسم کھانے کا بیان	۱۳۵

۲۳۶		تعارض - جمع تطبیق	۱۳۶
۲۳۷		اقوال المحدثین	۱۳۷
۲۳۹	۱۲۱	غیر اللہ کے نام کی قسم کھانا شرک ہے	۱۳۸
۲۴۰		اشکال و جواب	۱۳۹
۲۴۱		اقوال المحدثین	۱۴۰
۲۴۳	۱۲۲	لات و عزیٰ کی قسم کھانے کا بیان	۱۴۱
۲۴۴		اشکال و جواب	۱۴۲
۲۴۵		اقوال المحدثین	۱۴۳
۲۴۸	۱۲۳	عمل حرام پر معلق کر کے قسم کھانے کا بیان	۱۴۴
۲۵۰		اقوال المحدثین	۱۴۵
۲۵۲	۱۲۴	نذر کا بیان	۱۴۶
۲۵۲		تعارض و دفع تعارض	۱۴۷
۲۵۳		اقوال المحدثین	۱۴۸
۲۵۵	۱۲۵	قول رسول ﷺ ”سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ“ کی تشریح اور مفہوم کا بیان	۱۴۹
۲۵۹		اقوال المحدثین	۱۵۰
۲۶۳	۱۲۶	کسی مسلمان کو ”یا کافر“ (اے کافر) کہنے کا بیان	۱۵۱
۲۶۴		اقوال المحدثین	۱۵۲

۲۶۷	۱۲۷	نملۃ، ہدہد، اور صرد کو قتل کرنے کا بیان	۱۵۳
۲۶۹		تعارض - دفع تعارض	۱۵۴
۲۶۹		اقوال المحدثین	۱۵۵
۲۷۱	۱۲۸	دعا کی قبولیت کے آداب کا بیان	۱۵۶
۲۷۱		اشکال و جواب	۱۵۷
۲۷۲		اقوال المحدثین	۱۵۸
۲۷۵	۱۲۹	حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے میں تاخیر کرنے کا بیان	۱۵۹
۲۷۶		اشکال و جواب	۱۶۰
۲۷۸		اقوال المحدثین	۱۶۱
۲۸۰	۱۳۰	کبیرہ گناہوں کا بیان	۱۶۲
۲۸۱		تعارض و جمع و تطبیق	۱۶۳
۲۸۳		تعارض و دفع تعارض	۱۶۴
۲۸۴		اقوال المحدثین	۱۶۵
۲۸۸	۱۳۱	”فزارون اور عگارون“ کا معنی اور مفہوم کا بیان	۱۶۶
۲۸۹		اعتراض - جواب	۱۶۷
۲۹۰		اعتراض ثانی اور اس کا جواب	۱۶۸
۲۹۲		اقوال المحدثین	۱۶۹

۲۹۳	۱۳۲	فضائل اعمال	۱۷۰
۲۹۴		اشکال و جواب	۱۷۱
۲۹۵		اقوال المحدثین	۱۷۲
۲۹۶		اشکال و جواب	۱۷۳
۲۹۸	۱۳۳	قرآن مجید کی حفاظت اور معجزہ کا بیان	۱۷۴
۲۹۸		اشکال و جواب	۱۷۵
۳۰۰		اقوال المحدثین	۱۷۶
۳۰۲	۱۳۴	قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”ولد الزنا شر الثلاثة“ کی توجیہ کا بیان	۱۷۷
۳۰۳		اشکال و جواب	۱۷۸
۳۰۴		اقوال المحدثین	۱۷۹
۳۰۷	۱۳۵	ولد الزنا کا جنت میں داخل نہ ہونے کا بیان	۱۸۰
۳۰۸		اعتراض اور جواب	۱۸۱
۳۱۲	۱۳۶	علامات قیامت کا بیان	۱۸۲
۳۱۳		اشکال و جواب	۱۸۳
۳۱۴		اقوال المحدثین	۱۸۴
۳۱۵	۱۳۷	ولد الزنا کی آزادی کی فضیلت کا بیان	۱۸۵
۳۱۶		تعارض - جمع تطبیق	۱۸۶
۳۱۸	۱۳۸	”ریح، اور ریاح“ کا معنی اور دونوں میں فرق کا بیان	۱۸۷

۳۲۱		اقوال المحدثین	۱۸۸
۳۲۳	۱۳۹	عزت و آبرو کی حفاظت اور زنا کی ثبوت کی شرطوں کا بیان	۱۸۹
۳۲۵		اشکال و جواب	۱۹۰
۵۲۶		اقوال المحدثین	۱۹۱
۳۲۸	۱۴۰	دوسرے کے گھر میں جھانکنے کی سزا کا بیان	۱۹۲
۳۲۹		اشکال و جواب	۱۹۳
۳۳۱		اقوال المحدثین	۱۹۴
۳۳۲	۱۴۱	میدان جہاد میں کافر کو کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کر دینے کا بیان	۱۹۵
۳۳۵		اشکال و جواب	۱۹۶
۳۳۶		اقوال المحدثین	۱۹۷
۳۳۹	۱۴۲	قاتل سے قصاص کا مطالبہ کرنے کے بجائے معاف کرنے کا بیان	۱۹۸
۳۴۰		تعارض - جمع و تطبیق	۱۹۹
۳۴۱		اقوال المحدثین	۲۰۰
۳۴۳	۱۴۳	لعان کی صورت اور اس کا بیان	۲۰۱
۳۴۴		تعارض و جمع و تطبیق	۲۰۲
۳۴۷	۱۴۴	مدیون کو سب و شتم کرنے کا بیان	۲۰۳

۳۲۸		اشکال و جواب	۲۰۲
۳۵۰		اقوال المحدثین	۲۰۵
۳۵۱	۱۳۵	بالا خانہ بنانے کا بیان	۲۰۶
۳۵۲		سوال و جواب	۲۰۷
۳۵۳		تعارض - جمع و تطبیق	۲۰۸
۳۵۴		اقوال المحدثین	۲۰۹
۳۵۶	۱۳۶	قیامت سے پہلے آسمان وزمین کے درمیان دھواں کا نظر آنے کا بیان	۲۱۰
۳۵۹		اعتراض و جواب	۲۱۱
۳۶۲		اقوال المحدثین	۲۱۲
۳۶۵	۱۳۷	جنازہ کی دعاء	۲۱۳
۳۶۶		اشکال و جواب	۲۱۴
۳۶۷		اقوال المحدثین	۲۱۵
۳۷۰	۱۳۸	میت کے لئے دعا خیر کرنے کی ترغیب	۲۱۶



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست مضامین توجیہ الاخبار فی شرح مشکل الآثار (جلد دوم)
(ابواب کے اعتبار سے)

صفحہ	عناوین	نمبر شمار
کتاب الإیمان والعقيدة		
۲۲۵	ایمن والوں کے ایمان کی فضیلت کا بیان	۱
۵۰	ایمان خوف اور رجا (امید) کے درمیان ہے	۲
۳۱۸	رتح اور ریح کا معنی اور دونوں میں فرق کا بیان	۳
۲۱۰	عورت، گھوڑا اور گھر کے سلسلہ میں بدشگونی لینے کا بیان	۴
۲۱۴	قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”لا تُعْمَلُ“ کا مفہوم اور آیۃ الکرسی کی تلاوت کا اثر	۵
۲۵۵	قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”سبأب المومنین فسوقٌ وِقْتَالُهُ كُفْرٌ“ کا معنی اور مفہوم کا بیان	۶
۲۱۸	قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”اقتروا الطیْر علی مکناتہا“ کے معنی اور مفہوم کا بیان	۷
۳۱۲	علامات قیامت کا بیان	۸
۱۵۹	شق قمر واقعہ کا بیان	۹
۲۶۳	کسی مسلمان کو ”یا کافر“ کہنے کا بیان	۱۰

۱۵۲	عہد اول میں اسلام کی حیثیت کا بیان	۱۱
-----	------------------------------------	----

کتاب الصلوة

۸۸	جنابت کی حالت میں سہواً امامت کرنے کا بیان	۱
۱۴۷	فطرت کا معنی اور مفہوم کا بیان	۲
۱۷۸	مال کے ضیاع پر وعید کا بیان	۳
۲۹۳	فضائل اعمال	۴

کتاب الصوم

۳۹	جنابت کی حالت میں روزہ کی نیت کرنے کا بیان	۱
----	--	---

کتاب الحج

۷۸	احصار اور حج کے فوت ہونے کا بیان	۱
۷۳	مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ میں نماز کی فضیلت کا بیان	۲
۶۸	عبادت کی نیت سے مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کا سفر کرنے کا بیان	۳

کتاب النکاح

۱۵۵	دودھ چھڑانے کے بعد مرضعہ کو انعام و بخشش دینے کا بیان	۱
-----	---	---

کتاب الطلاق

۱۲۱	اکراہ کی حالت میں طلاق و عتاق کا بیان	۱
۱۲۵	طلاق معلق اور عتاق معلق کا بیان	۲
۱۰۲	الفاظ کنایہ سے لفظ ”فَخَلِّي سَبِيلَهَا“ کا بیان	۳
۹۷	الفاظ کنایہ سے وقوع طلاق کا بیان	۴

۳۴۳	لعان کی صورت اور اس کا بیان	۵
-----	-----------------------------	---

کتاب البيوع

۱۶۵	تفہیز طحان کا معاملہ اور اس کی حیثیت	۱
۲۲۱	قصاب کو ذبیحہ کا گوشت اجرت کے طور پر دینے کا بیان	۲

کتاب الادعية

۳۵۶	جنازہ کی دعاء کا بیان	۱
۳۶۸	جلسہ کے وقت کی دعاء کا بیان	۲
۳۷۰	میت کے حق میں دعاء خیر کی ترغیب	۳
۲۷۱	دعا کی قبولیت کے آداب	۴

کتاب التفسیر

۵۶	سورہ آل عمران (۱۲۸) ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ﴾ کے شان نزول کا بیان	۱
----	---	---

کتاب اليمين والنذر

۲۳۹	غیر اللہ کے نام کی قسم کھانا شرک ہے	۱
۲۴۳	لات و عزیٰ کی قسم کھانے کا بیان	۲
۱۳۰	یمین (قسم) کا بیان	۳
۱۳۹	قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”لا تُقسِمَ“ کا معنی اور مفہوم کا بیان	۴
۲۴۸	عمل حرام پر یمین کو معلق کرنے کا بیان	۵
۲۵۲	نذر اور اس کا حکم	۶

کتاب المناقب

۳۶	حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے مناقب کا بیان	۱
۱۱۶	ازواج مطہرات کے مناقب کا بیان	۲
۱۳۶	خواب کی تعبیر کا بیان	۳
۲۰۱	اہل بیت کی فضیلت کا بیان	۴
۲۳۰	قاری رسول حضرت ابی بن کعبؓ، زید بن حارثہؓ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم کی فضیلت	۵
۲۶۷	”نملۃ، ہدہ اور صرد“ پرندہ کو قتل کرنے کا حکم	۶

کتاب الحدود والقصاص

۱۷۵	قصاص کے وجوب کی شرطیں	۱
۳۳۹	قاتل سے قصاص کا مطالبہ کرنے کے بجائے مقتول کے ورثہ کا معاف کر دینا	۲
۳۲۸	دوسرے کے گھر میں اجازت کے بغیر جھانکنے کی سزا	۳
۳۳۴	میدان جہاد میں کافر کو کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کرنے کا حکم	۴
۳۴۷	قرض خواہ مدیون کو سب و شتم کر سکتا ہے	۵

کتاب الرقاق

۱۷۱	غلام آزاد کرنے کی فضیلت	۱
۳۰۲	”ولد الزنا شر الثلاثہ“ کی توجیہ	۲
۳۰۷	ولد الزنا جنت میں داخل نہیں ہوگا	۳
۳۱۵	ولد الزنا کی آزادی کی فضیلت کا بیان	۴

کتاب القضاء

۹۴	غصہ کی حالت میں قاضی کا فیصلہ کرنے کا بیان	۱
۱۹۶	مدعی کا دعویٰ اس کی چرب زبانی سے ثابت ہونا پھر قاضی کا اس کے حق میں فیصلہ کرنے کا بیان	۲

کتاب المتفرقات

۳۱	چھینک کے آداب کا بیان	۱
۴۶	مامورات و منہیات کے حکم میں فرق کا بیان	۲
۶۱	قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”وَلَنْ يُوتِيَ اثْنَا عَشَرَ الْقَامِنِ قِلَّةٍ“ کا مفہوم	۳
۸۳	حرام طریقہ سے مال حاصل کرنے کا بیان	۴
۱۴۳	تعبیر سے پہلے خواب کی حیثیت کا بیان	۵
۱۸۴	حلال و حرام اور امور مشتبہ کے حکم کا بیان	۶
۱۹۲	مسکوت عنہ امر کی حیثیت	۷
۲۷۵	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد میں تاخیر کرنے کا بیان	۸
۲۸۰	کبیرہ گناہوں کا بیان	۹
۲۹۸	قرآن مجید کی حفاظت کا بیان	۱۰
۳۵۱	بالا خانہ بنانے کا بیان	۱۱



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمة الكتاب

حضرت مولانا مفتی اقبال بن محمد صاحب ٹنکاروی دامت برکاتہم

(مہتمم و شیخ الحدیث: دارالعلوم ماٹلی والا، بھروچ)

الحمد لله الخبير البصير والصلوة والسلام على البشير النذير وعلى آله وأصحابه
واتباعه السائرين على نهجة النير الذين قعدوا السنة المطهرة وعلومها القواعد، وضبطوا
لحفظها كل شارد ووارد، وردوا عنها كيد كل مفتر وكائد، وحفظوها وحافظوا عليها
من الاقارب والأباعد، وبذلوا في تحقيق ذلك النفس والنفيس من كل كريم وماجد.
فجزاهم الله خيرا عن الامة والاسلام واقريعونهم برضوانه العظيم في دار
السلام، ورزقنا السير على منهاجهم لبلوغ المرام.

مسلمانوں نے آغاز اسلام سے قرآن کریم کے بعد علم حدیث کو اپنے سینہ سے
لگایا اور اپنی پوری محنت، قابلیت اور اخلاص و عقیدت کے ساتھ اس کی ایسی خدمت کی کہ دنیا کی
کوئی قوم اپنی قدیم روایات و اسناد کی حفاظت کی مثال پیش نہیں کر سکتی اور ایسا ہونا ضروری تھا
؛ کیوں کہ اسلام قیامت تک کی زندگی لے کر آیا ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کی زندگی کے ہر حرف کو دوام بخشا اور علم حدیث کے
اوراق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی اہل بصر کو چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لئے
بزرگوں کا مقولہ ہے، جس گھر میں حدیث کا مجموعہ ہے، فکأنما فیہ نبی یتکلم، اس گھر میں نبی
صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی تکلم فرما رہے ہیں۔

اسی بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مبارک قول میں ظاہر فرمایا۔ انی توکت

فیکم امرین، لن تضلوا ما تمسکتہم بہما، کتاب اللہ، وسنة رسولہ۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے پاس قرآن کریم اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم دونوں مل کر قیامت تک یہ ہدایت کا سرچشمہ رہے گا۔

اسی لئے ماحول کی درستگی میں قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث شریف کا بھی بنیادی کردار رہتا ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور ارشادات و ہدایات (جن کے مجموعہ کا معروف نام حدیث و سنت ہے) دین کے لئے وہ فضا اور ماحول مہیا کرتے ہیں، جس میں دین کا پودہ سرسبز و بار آور ہوتا ہے، دین کسی خشک اخلاقی ضابطہ یا قانونی مجموعہ کا نام نہیں، جو خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق اور حالات زندگی سے ماخوذ ہو، یہودی اور عیسائی نیز ایشیاء کے دوسرے مذاہب اس لئے بہت جلد مفلوج ہو کر رہ گئے کہ ان کے پاس اپنے پیغمبروں کی زندگی کے مستند واقعات اور ایمان آفریں کلام کا مجموعہ محفوظ نہیں رہا تھا، انہوں نے بالآخر اس کی ضرورت تسلیم کر کے اس خلاء کو ”پیروان مذاہب“ و ”پیران طریقت“ کے واقعات و ملفوظات سے پر کیا، مگر اس ”خانہ پوری“ نے رفتہ رفتہ مذاہب کو بدعت و رسوم اور نئی نئی تفسیروں کا مجموعہ بنا دیا، جس میں اصل مذہب کی تعلیم گم ہو کر رہ گئی۔

غور و فکر کیا جائے اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر علم کی ایک خاصیت ہوتی ہے، اور اس علم سے دل بستگی اور وابستگی کی وجہ سے نفس انسانی میں ایک خاص کیفیت خواہ بری ہو، بھلی۔ پیدا ہو جاتی ہے، علم حدیث سے وابستگی اور مزاولت صحابیت کی شان پیدا کر دیتی ہے، کیوں کہ صحابیت کے معنی دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ احوال سے واقفیت اور ہر عبادت و عادت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوضاع و اطوار کا مشاہدہ کرنے کے ہیں، اور یہ بات امتداد زمانہ کی وجہ سے اس شخص کی قوت مدرکہ اور متخیلہ میں۔ جو اس علم سے وابستگی رکھتا ہے۔ ایسی جم جاتی ہے اور راسخ ہو جاتی ہے کہ مشاہدہ کے حکم میں ہوتی ہے۔

چنانچہ حسب ذیل شعر میں اسی طرف اشارہ ہے۔

اهل الحدیث ہم اهل النبی ﷺ وان لم یصبحوا نفسہ انفاہ صبحوا
 اہل حدیث (حدیث سے وابستہ افراد) ہی اہل نبی ہیں، اور انہیں گورسالت مآب صلی
 اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل نہیں، مگر آپ کے انفاس قدسیہ کے ساتھ شرف صحبت حاصل
 ہے۔ (عجالة نافعہ: ۳۲)

حاصل یہ ہے کہ یہ علم وہ نور ربانی ہے، جس کا مشکوٰۃ نبوت مرکز و مخزن ہے، اور سند متصل
 کے تاروں کے ساتھ وہ قلوب علماء میں پہنچ رہا ہے اور ان کے قلوب سے عامۃ المسلمین کے قلوب
 تک پہنچ کر ان کو جگمگ کر رہا ہے، یہ ضروری ہے کہ قلوب کا تعلق اس نور ربانی سے منقطع نہ ہو۔
 ”مشکل الحدیث“ سے مراد یہ ہے کہ دو حدیثیں بظاہر آپس میں معارض ہوں، محدثین
 نے اس قسم کی احادیث جمع کر کے ان کے تعارض کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، اس نوع کے
 بارے میں صرف فقہائے محدثین ہی بات کر سکتے ہیں، جو احادیث کے معانی و مطالب کے
 سمندر میں غوطہ زن ہو چکے ہوں۔

اس فن پر سب سے پہلے امام محمد بن ادریس شافعی متوفی ۲۰۴ھ نے گفتگو کی اور ایک
 کتاب تصنیف کی، جس کا نام ”اختلاف الحدیث“ ہے۔

بعد ازاں امام ابو عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری متوفی ۲۷۶ھ نے اس علم سے
 متعلق کتاب تحریر کی، اس کا نام ”تاویل مختلف الحدیث“ ہے، آپ نے اس کتاب میں اہل
 الحدیث (محدثین) کے دشمنوں کی تردید کی ہے۔

ابن قتیبہ نے علم عربیت میں ماہر ہونے کے اعتبار سے جوابات دیئے ہیں، حدیث

شریف کی تصحیح و تضعیف میں ان کو مہارت نہیں تھی، اور چوں کہ ان کے جوابات علم الکلام پر رد کرنے کے اعتبار سے بھی تعلق رکھتے تھے؛ لہذا ان کی کتاب مشکل الحدیث اتنی مفید ثابت نہیں ہوئی، اسی لیے علامہ ابن کثیر نے فرمایا:

ولابن قتیبة في مشکل الحديث مجلد مفيد، وفيه ما هو غث، وذلك بحسب ما عنده من العلم. (شرح مشکل الآثار: ص: ۱۰)

پھر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ و ابو یحییٰ الساجی متوفی ۳۰۰ھ نے بھی اس فن میں کتابیں لکھیں، ابو جعفر طحاوی متوفی ۳۲۱ھ نے اس موضوع پر کتاب لکھی اور اس کا نام ”مشکل الآثار“ رکھا، یہ آپ کی بہترین تصنیف ہے۔

امام طحاوی نے ہر باب کے ماتحت ایسی دو حدیثیں پیش کی ہیں جن کے ظاہر سے باہمی تعارض معلوم ہوتا ہے، آپ دونوں کی سند، طرق اور روایات، سبب ورود اور وجوہ ترجیح کے ساتھ روایت ذکر کرتے ہیں۔ آپ کو احادیث کی تکثیر نہیں؛ بلکہ جمع و تطبیق مقصود ہوتی ہے؛ لہذا ایک روایت سبب کے ساتھ اور دوسری جس میں سبب ذکر نہ کیا گیا ہو؛ دونوں کو نقل کرتے ہیں یا ایک حدیث مطلق اور دوسری مقید یا ایک عام اور دوسری خاص ہو تو بھی دونوں کو ذکر کرتے ہیں یا تدلیس و اختلاط والی روایت کے ساتھ ارتفاع جہالت و تدلیس والے طرق کو بھی ذکر کرتے ہیں؛ کبھی قیاس شرعی کی طرف بھی۔ مجبور ہونے کی حالت میں۔ رجوع کرتے ہیں۔

حاصل یہ کہ احادیث کی ایسی شرح بیان کرتے ہیں کہ دونوں کے درمیان کا اختلاف و تعارض دور ہو جائے، البتہ اس ترتیب میں انہوں نے شرح معانی الآثار و الاطریقہ نہیں اپنایا ہے؛ کیوں کہ تعارض و اشکال ایک باب کی دو روایتوں کے درمیان نہیں ہوتا ہے، بلکہ مختلف الابواب روایات میں بظاہر اشکال و تعارض نظر آتا ہے، لہذا دونوں کو ایک ساتھ ذکر کر کے تعارض دور کرنا

ہوتا ہے۔

مشکل الآثار سے کوئی فقہی ترتیب ملحوظ رکھنا مقصود بھی نہیں تھی، بلکہ اشکالات دور کرنا تھا، اسی لیے معانی الآثار کی طرح مشکل الآثار میں کسی فقہی مسلک کی تائید بھی نہیں کی، بلکہ مشکل الآثار میں ان پر حدیثی رنگ زیادہ چڑھا ہوا ہے۔

ترجیح میں امام طحاویؒ قواعد علوم حدیث پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے حدیث متصل کو مخالف پر مقدم کرتے ہیں، اسی طرح زیادات پر عمل کرنے کے سلسلے میں بھی محدثین کی وجوہ ترجیح کو بھی مقدم کرتے ہیں۔

نیز بعض ابواب میں ”فقال قائل“ کے ذریعہ حدیث الباب کے بعض شق پر معنوی اعتبار سے جو اشکال و اعتراض وارد ہوتا ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں، پھر ”فکان جوابنا“ یا ”فقیل لہ“ کے ذریعہ اس کا جواب دیتے ہیں۔

ان وجوہ سے امام طحاویؒ کی دونوں کتابیں اپنے فن میں منفرد اور بے مثال ہیں، جس کا ذکر شیخ عوامہ نے ان الفاظ سے کیا ہے:

وللإمام أبي جعفر الطحاوي كتابان عظيمان في هذا الصدر احدهما شرح معاني الآثار، وثانيهما مشكل الآثار وهو آخر مؤلفاته كما قال القرشي ايضا وهو كتاب لم يؤلف مثله في هذا الباب قديما ولا حديثا. (اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الاممۃ الفقہاء ص: ۱۶۵)

دو دلیلوں کے درمیان نفس الامر میں تعارض:

دو دلیلوں کے درمیان، حقیقت اور نفس الامر میں تعارض ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگرچہ اس میں مختلف اقوال ہیں؛ لیکن احناف و شوافع اس پر متفق ہیں کہ نفس الامر میں دو دلیلوں کے درمیان تعارض جائز نہیں، خواہ یہ دونوں دلیلیں قطعی ہوں یا ظنی، جو کچھ تعارض ہوتا ہے وہ صرف

مجتہد کی نظر میں ظاہری تعارض ہوتا ہے، عام فقہاء کا یہی مذہب ہے۔

اس مسئلہ میں شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: ”الأصل أن يعمل بكل حديث إلا أن يمتنع

العمل بالجميع للتناقض، وإنه ليس في الحقيقة اختلاف؛ ولكن في نظرنا فقط“۔

شاہ صاحب نے یہ بات اگرچہ دو حدیثوں کے بارے میں فرمائی ہے، جن میں سے اخبار آحاد (جن کی کثرت ہے) ظنی ہوتی ہے؛ لیکن جب شاہ صاحب دو ظنی دلیلوں کے درمیان نفس الامر میں تعارض کے قائل نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تناقض سے مبرا مانتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بدرجہ اولیٰ تناقض سے منزہ ہوگا اور اس کے کلام میں نفس الامری تناقض بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا۔

تعارض کا حکم:

جب دو دلیلوں کے درمیان ظاہری تعارض واقع ہو جائے تو اس وقت تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کی جاتی ہے: نسخ، ترجیح اور جمع۔

لیکن اگر ان تینوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی ممکن نہ ہو تو دونوں دلیلیں ساقط ہو جاتی ہیں۔

تعارض کے وقت نسخ، ترجیح اور جمع، ان تینوں صورتوں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے پر اگرچہ احناف و شوافع کا اتفاق ہے لیکن ان کی ترتیب دونوں کے یہاں مختلف ہے۔

شوافع میں سے استاذ ابوالسخت شیرازی لکھتے ہیں کہ اگر جمع ممکن ہو تو پہلے جمع کیا جائے گا۔

علامہ ابن ہمام اور ملا محب اللہ وہ ترتیب لکھتے ہیں جو پہلے مذکور ہوئی، یعنی پہلے نسخ، پھر

ترجیح، پھر جمع۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ: اگر حنفیہ کے طرز استدلال پر غور

کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ احناف پہلے تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً: ایک حکم کو

و جب پر اور دوسرے کو استتباب پر محمول کرتے ہیں، جیسے عورت کو چھونے کی وجہ سے وضوء واجب تو قرار نہیں دیتے؛ لیکن مستحب قرار دیتے ہیں، کبھی مختلف حدیثوں کا الگ الگ محل متعین کرتے ہیں، جیسے شرم گاہ کو چھونے کی وجہ سے وضوء واجب قرار نہیں دیتے؛ لیکن اگر اس سے شہوت پیدا ہونے لگے اور مذی کا خروج ہو جائے تو وضوء واجب قرار دیتے ہیں، غرض کہ شرم گاہ چھونے سے وضوء واجب ہونے والی حدیث کو اس خاص صورت پر محمول کرتے ہیں، کبھی عمل کی ایسی کیفیت متعین کرتے ہیں کہ مختلف حدیثیں جمع ہو جائیں، جیسے نماز میں ہاتھ باندھنے کی کیفیت کیا ہو؟ اس میں یہ بات بھی آئی ہے کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو پکڑا جائے اور حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھا جائے، احناف نے ان دونوں حدیثوں کو جمع کرتے ہوئے کہا کہ انگوٹھے اور چھوٹی انگلی سے گٹوں کو پکڑا جائے اور بقیہ تین انگلیاں بچھادی جائیں، اس طرح احناف کے یہاں کوشش ہوتی ہے کہ اگر کسی حدیث کا منسوخ ہونا صراحت کے ساتھ ثابت نہ ہو تو نصوص کے درمیان تطبیق پیدا کی جائے اور کوشش کی جائے کہ کوئی نص عمل سے خالی نہ رہ جائے۔ (چارفتہ مسالک تعارف اور خصوصیات: ۲۳۰-۲۳۱)

الحمد للہ دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا میں کئی سال سے تخصص فی الحدیث کا شعبہ قائم ہے، جس کے تحت ”فرحة اللیب فی تخریج احادیث نشر الطیب“، ”جہود المراجیح“، ”اخبار آحاد اور ان کی استدلالی حیثیت“، ”حدیث کے اصول و مصطلحات منہج حنفی کی روشنی میں“ اور ”فہم مشکلات الحدیث کے قواعد“؛ ”تخصص فی الحدیث کی تاریخ، اہمیت و ضرورت“ اپنے فن کی اہم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، اور اہل علم اور باذوق علماء نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس شعبہ میں مشکل الحدیث کے بابت امام طحاوی کی مشکل الآثار نصاب میں کئی سال قبل داخل کی گئی، اس وقت اس کا پرانا نسخہ تھا، جس سے خاطر خواہ استفادہ دشوار تھا۔ مفکر ملت رئیس

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کا پودروی رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانہ میں جب سعودی عرب سے شیخ شعیب ارناؤوط کی تحقیق کے ساتھ ”مشکل الآثار“ ۱۵ جلدوں میں آئی، اور میری نظر اس کتاب پر پڑی تو محسوس ہوا کہ مشکل الحدیث کو سمجھنے میں اس کتاب کے ذریعہ بڑی سہولت ہوگی، چنانچہ کئی سال قبل حضرت الاستاذ، مفکر ملت سے کتاب حاصل کر کے تخصص فی الحدیث کے نصاب میں داخل کیا۔

بہر حال پہلی جلد کی طرح اس دوسری جلد میں خاص طور پر درجہ ذیل باتیں زیر بحث لائی گئیں ہیں:

[۱] ترجمہ باب اور باب کی پہلی حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے ابتداء میں مختصراً اردو میں تمہیدی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے، تاکہ ترجمہ باب اور حدیث کی غرض اور خلاصہ واضح ہو جائے۔

[۲] ہر باب میں ”قال ابو جعفر“ سے مصنف کی غرض اور مقصد کو نمایاں کیا گیا ہے، اور دو روایتوں میں جو تعارض یا اشکال ہے، دونوں کی وضاحت کی گئی ہے پھر ”فکان جوابنا، فقیل لہ“ کے ذریعہ امام طحاوی نے جو اس کا جواب دیا ہے، اسے قلم بند کیا گیا ہے۔

[۳] امام طحاوی کی تطبیق اور جمع کی صورت قلم بند کرنے کے بعد دیگر محدثین کی رائے مع حوالہ ذکر کی گئی ہے۔

[۴] عام طور پر دیگر محدثین کے وہی اقوال پیش کئے گئے ہیں، جو امام طحاوی کی رائے کے مخالف ہیں۔

[۵] بعض ابواب کی احادیث میں نہ کوئی تعارض ہے اور نہ کوئی اشکال، تو وہاں

نفس مسئلہ کو ترجمہ الباب اور حدیث الباب کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

[۶] کتاب کے آغاز میں دو فہرست دی گئی ہیں، پہلی امام طحاویؒ کی کتاب شرح مشکل

الآثار کے مطابق ہے؛ لیکن دوسری فہرست سہولت و آسانی کے لیے ابواب کے مطابق دی گئی ہے۔

امام طحاویؒ اور شیخ شعیب ارتووط نے مشکلات الحدیث کے ضمن میں جن اصول سے کام لیا ہے، اس کا بھی کچھ نمونہ سامنے آیا، تو اسی وقت ذہن میں یہ بات آئی کہ اصول فقہ اور علوم الحدیث کی کتابوں میں تعارض ادلہ و مشکلات الحدیث کے ضمن میں جو وجوہ ترجیحات ذکر کی ہیں، اگر ان کا احاطہ کر لیا جاوے تو ہمارے طلبہ عزیز کے لیے مشکل الحدیث کی فہم میں آسانی ہو جاوے اور اس کے تمام پہلو مع امثلہ نکھر کر سامنے آ جاوے اور چوں کہ اردو زبان میں اس موضوع پر مستقل کوئی کتاب بھی نہیں ہے تو اس کا نفع عام اہل علم کو بھی پہنچے، اس غرض کے ماتحت میں نے ہمارے دارالعلوم کے موقر استاذ قاضی حسن صاحب مدھوبنی سے درخواست کی اور آپ محترم نے ماشاء اللہ کافی محنت اور لگن کے ساتھ اس سلسلہ کے اصول حضرات اصولیین و محدثین کی عبارتوں سے کھنگال کر مثالوں کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے، اور وہ کتاب الحمد للہ تعالیٰ ”فہم مشکلات الحدیث کے قواعد“ کے عنوان سے چھپ چکی ہے۔

دوسری طرف شرح مشکلات الحدیث کی روایات کے ضمن میں علامہ شعیب ارتووطؒ کی تحقیقات کو طلبہ عزیز نے اردو زبان میں پیش کیا، اور جلد اول کی تکمیل کی تو قاضی حسن صاحب نے اس کی تنقیح کر کے میرے سامنے پیش کیا، تو میں نے مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ صاحب کا پودرویؒ کی خدمت میں پیش کیا، حضرت نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے حکم فرمایا کہ مشکلات الحدیث کی شرح میں امام طحاوی کے علاوہ محدثین نے جو کلام کیا ہے، اور ان کی بھی تصنیفات موجود ہیں، تو ان کی آراء کو بھی شامل کیا جاوے۔ حضرت کے حکم کو بسر و چشم قبول کر کے

میں نے قاضی حسن صاحب کو دیگر محدثین کے اقوال حوالے کے ساتھ جمع کرنے کا مشورہ دیا، اور الحمد للہ حضرت مفکر ملت کے منشا کے مطابق مزید تنقیح کے ساتھ پہلی جلد کی طرح یہ دوسری جلد بھی مزین ہو کر آگئی ہے؛ اللہ تعالیٰ شعبہ تخصص فی الحدیث کی مسلسل دس سالہ نگرانی و خصوصی توجہ کا مفکر ملت کو بہترین بدلہ عنایت فرمائے۔

میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ حضرت مولانا قاضی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہ کام بہت سلیقہ سے احسن الوجوہ اداء کیا، حق تعالیٰ شانہ آپ کی محنت کو قبول فرما کر ہم سب کے لیے دارین میں خیر و فلاح کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

(حضرت مولانا مفتی) اقبال بن محمد ٹنکاروی (صاحب)

شیخ الحدیث و مہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا بھرونج

یکم رجب المرجب ۱۴۴۳ھ = مطابق ۳ فروری ۲۰۲۲ء

باب: ۷۸

باب بَيَانِ مُشْكِلِ مَا زَوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الْعَاطِسِ الَّذِي أَمَرَ بِتَشْمِيْتِهِ أَيُّ
الْعَاطِسَيْنِ هُوَ؟

﴿چھینک کے آداب کا بیان﴾

عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: عَطَسَ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَشَمَّتْ أَحَدَهُمَا وَلَمْ يُشَمِّتِ
الْآخَرَ، فَقِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ عَطَسَ رَجُلَانِ فَشَمَّتْ أَحَدَهُمَا وَلَمْ تُشَمِّتِ الْآخَرَ فَقَالَ: "إِنَّ
هَذَا حَمْدَ اللَّهِ وَإِنَّ هَذَا لَمْ يَحْمَدِ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ". (شرح مشكل الآثار: ۵/۲، ورواه البخاري:
(۲۲۲۱)، ومسلم: (۲۹۹۱) وابوداود: (۵۰۳۹) والترمذي: (۲۷۳۲))

خلاصہ الحدیث:

دنیا کے سارے انسان حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کی اولاد ہیں، سب آپس میں بھائی
بھائی ہیں، اور باہم ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار بھی ہیں، مگر اس ہمدردانہ سلوک اور خیر
خواہانہ کردار کو باقی اور دوام بخشنے اور پروان چڑھانے کے لئے اسلام نے کچھ اور حقوق و ذمہ
داریاں تمام مسلمانوں پر عائد کی ہیں، جو نہ صرف اہم ہیں بلکہ انسانی معاشرہ میں اتحاد و اتفاق اور
ہمدردی و خیر سگالی کے جذبہ کو موجزن کرنے میں ان کا بڑا اہم رول ہے، اس لئے ان کا لحاظ
کرنا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے، مثلاً سلام کا جواب دینا، بیمار کی عیادت کرنا، جنازہ کے ساتھ
ساتھ جانا، کھانے کی دعوت قبول کرنا اور چھینکنے پر الحمد للہ کوئی کہے تو (یرحمک اللہ کی صوت میں)
اس کا جواب دینا، لیکن اگر کوئی مسلمان چھینک آنے کے بعد ”الحمد للہ“ نہیں کہا؛ بلکہ خاموشی

اختیار کی تو دوسرے مسلمان پر ”یرحمک اللہ“ کہنا واجب نہیں، چنانچہ اس باب میں حضرت انس کی حدیث میں یہی مضمون ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو و اشخاص کو چھینک آئی، ایک نے الحمد للہ کہا، مگر دوسرے نے ”الحمد للہ“ نہیں کہا؛ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس صحابی کے جواب میں ”یرحمک اللہ“ کہا جس نے ”الحمد للہ“ کہا تھا، ہاں جس نے الحمد للہ نہیں کہا اس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تعارض:

اس باب میں حضرت انسؓ کے علاوہ ابو بردہ، ابو ہریرہ کی احادیث کو امام طحاوی نے جمع کیا ہے؛ لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں ”وِئْسَمْتَهُ إِذَا عَطَسَ“ ہے، جب کے دوسری حدیث میں یہ روایت اس طرح ہے ”فَعَطَسَ رَجُلٌ فَحَمِدَ اللَّهُ“ الغرض الفاظ کے اعتبار سے تعارض ہے، جس کی طرف امام طحاوی نے نشان دہی کی ہے،

قَالَ: فَهَذَا مُخْتَلِفَانِ؛ لِأَنَّ فِي أَحَدِهِمَا تَسْمِيَتَهُ إِذَا عَطَسَ وَفِي الْآخِرِ مِنْهُمَا تَسْمِيَتَهُ إِذَا عَطَسَ وَحَمِدَ اللَّهُ. (شرح مشکل الآثار: ۹/۲)

جمع و تطبیق:

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل دونوں حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی ہیں، اس لئے الفاظ کے فرق کے بارے میں دونوں احادیث کے الفاظ باہم یکساں ہیں، معنی میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ ”تَسْمِيَتَهُ إِذَا عَطَسَ“ کا جو معنی (یعنی جب چھینکنے والا الحمد للہ کہے) ہے، وہی معنی ”تَسْمِيَتَهُ إِذَا عَطَسَ وَحَمِدَ اللَّهُ“ کا ہے، اس لئے دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

وَكَانَ جَوَابَنَا لَهُ فِي ذَلِكَ بِتَوْفِيقِ اللَّهِ وَعَوْنِهِ أَنَّهُمَا لَيْسَا مُخْتَلِفَيْنِ؛ لِأَنَّ مَعْنَى مَا عَارَضْنَا بِهِ مِنْ قَوْلِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”وَتَسْمِيَتُهُ إِذَا عَطَسَ“ هُوَ عَلَى

تَشْمِيْتِهِ إِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللَّهَ تَعَالَى عَلَى مَا رَوَيْتَنِي أَوَّلِ هَذَا الْبَابِ. (شرح مشکل الآثار: ۲۷۹)

اس کی نظیر:

قرآن مجید میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، یہاں امام طحاویؒ نے کفارہ یمنین والی ایک آیت ﴿ذَلِكَ كَفَّارَةٌ لِّأَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ﴾ (مائدہ: ۸۹) کو بطور استشہاد کے پیش کیا ہے، اور اس میں قسم کا کفارہ بیان کیا گیا ہے، یہ کفارہ حالف پر صرف حلف پر (قسم کھانے پر) واجب نہیں ہے، بل کہ قسم کھانے کے بعد قسم کا لحاظ نہ کرنے پر اس کے خلاف عمل کرے تب وہ حائث ہو جائے گا، اس بنیاد پر حالف پر کفارہ واجب ہے، اس میں تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ جو حالف حائث نہیں ہوا، اس پر کفارہ واجب نہیں۔

لہذا مذکورہ آیت میں ﴿ذَلِكَ كَفَّارَةٌ لِّأَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ﴾ (المائدہ: ۸۹) سے صرف حلف ہی مراد نہیں ہے بلکہ حلف کے ساتھ حائث ہونا اس کے ساتھ مقید ہے، جیسا کہ امام طحاویؒ رقم طراز ہیں:

وَلَمْ يَكُنِ الْمُرَادُ بِذَلِكَ إِذَا حَلَفْتُمْ فَقَطُّ وَإِنَّمَا الْمُرَادُ بِهِ إِذَا حَلَفْتُمْ فَحَسِبْتُمْ؛ لِأَنَّهُ لَا اخْتِلَافَ بَيْنَ أَهْلِ الْعِلْمِ فِيمَنْ حَلَفَ بِيَمِينٍ فَلَمْ يَحْنُثْ فِيهَا أَنَّهُ لَا كَفَّارَةَ عَلَيْهِ. (شرح مشکل الآثار: ۹۲)

اسی طرح ”يَشْمِيْتُهُ إِذَا عَطَسَ“ یہ جملہ ”يَشْمِيْتُهُ إِذَا عَطَسَ وَحَمِدَ اللَّهَ“ کے معنی میں ہے، اس لئے حضرت ابو ہریرہؓ کی دونوں احادیث کے الفاظ میں نہ کوئی فرق ہے اور نہ کوئی تعارض، مِثْلَ ذَلِكَ مَا قَدَّرُوْنَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ: ”وَيُشْمِيْتُهُ إِذَا عَطَسَ“ يُرِيدُ بِهِ: إِذَا عَطَسَ وَحَمِدَ اللَّهَ وَفِيمَا ذَكَرْنَا مَا يَنْفِي التَّضَادَّ عَنْ مَا تَوَهَّمَهُ هَذَا

الْجَاهِلُ فِي حَدِيثِ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِمَّا يُخَالِفُ ذَلِكَ، وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار: ۹/۲)

اقوال المحدثین:

محدث کبیر شیخ خلیل احمد سہارن پوریؒ نے اس مسئلہ میں یہ توجیہ کی ہے کہ چھینکنے والا ”الحمد للہ“ کہے گا تب سننے والوں پر ”یرحمک اللہ“ کہنا واجب ہوگا۔

”وتشمیت العاطس“ أي اذا عطس مسلم فحمد الله فيجيب أن يشمته ويقول: یرحمک اللہ. (بذل المجہود: ج ۱۳، ص: ۲۲۵)

اس طرح امام بخاریؒ نے ایک باب قائم کیا ہے:-

”باب لا يشمت العاطس اذا لم يحمد الله“ اس کے تحت حضرت انسؓ کی روایت کو ذکر کیا ہے۔

نیز امام نوویؒ نے اس کے مقتضی کو اس طرح تحریر کیا ہے کہ اگر چھینکنے والا الحمد للہ نہیں کہتا ہے، تو دوسرے ”سننے والے مسلمان“ پر ”یرحمک اللہ“ کہنا واجب نہیں۔

مقتضاه أن من لم يحمد لم يشمت. (بحوالہ حاشیہ: بذل المجہود: ج ۱۳، ص: ۲۳۲)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؒ سے مسلم شریف میں ایک روایت ہے جس میں اس طرح صراحت کے ساتھ ہے:

”إِذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ فَحَمِدَ اللَّهَ فَشَمِّتُوهُ وَإِنْ لَمْ يَحْمِدِ اللَّهَ فَلَا تُشَمِّتُوهُ“.

حاشیہ: بذل المجہود: ج ۱۳، ص: ۲۳۲)

صاحب بذل نے معجم طبرانی کے حوالہ سے عامر بن الطفیل بن مالک بن جعفر بن کلاب الفارس کی مدینہ میں آمد کا واقعہ ذکر کیا ہے، اس واقعہ سے بھی مذکورہ مضمون کی تائید ہوتی ہے۔

وكان قدم المدينة وجرى بينه وبين ثابت بن قيس بحضرة النبي ﷺ كلام ”ثم عطس ابن اخيه فحمد فشتمه النبي ﷺ ثم عطس عامر فلم يحمد فلم يشتمه. (بذل المجهود: ۱۳/۲۲۳)

”وہ مدینہ آئے، ان کے اور ثابت بن قیس کے مابین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں گفتگو ہوئی، پھر اس کے بھتیجے کو چھینک آئی، الحمد للہ کہا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یرحمک اللہ کہا، لیکن جب عامر بن طفیل کو چھینک آئی مگر انہوں نے الحمد للہ نہیں کہا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ”یرحمک اللہ“ نہیں کہا۔



باب: ۷۹

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي صِدْقِ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ

﴿ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے مناقب کا بیان ﴾

عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: " مَا أَظَلَّتِ الْخَضِرَاءُ، وَلَا أَقَلَّتِ الْعَبْرَاءُ عَلَى ذِي لَهْجَةٍ أَصْدَقَ مِنْ أَبِي ذَرٍّ ". (شرح مشکل

الآثار: ۱۰/۲، رواه الحاكم: ۴/۹۷۴، وأبو داود في "الحديث": ۱/۲۷۲، تاريخ واسط: ۱۴۱)

خلاصہ الحدیث:

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دنیا میں حضرات انبیاء کرام کے بعد اگر کسی کو کوئی مقام و مرتبہ حاصل ہے، تو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ذات گرامی ہیں، جنہیں انبیاء کرام کے بعد سب سے اونچا مقام حاصل ہے، اور مجموعی اعتبار سے تمام صحابہ کرام کا مقام یکساں ہے، لیکن اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض صحابہ کو دوسرے صحابہ پر کچھ خاص صفات و کمالات میں ترجیح اور تفوق حاصل ہے، مثلاً حضرت ابو بکرؓ کو صداقت میں، حضرت عمرؓ کو حق گوئی اور موقع شناسی میں، اور حضرت عثمانؓ کو حیا و وقار میں اسی طرح حضرت ابو ذر غفاریؓ کو صاف گوئی اور اظہار حق میں نمایاں مقام حاصل تھا، اسی بنا پر، حضرت علیؓ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابو ذرؓ سے بڑھ کر کسی راست باز صداقت پسند شخص پر نہ نیلگوں آسمان نے سایہ کیا اور نہ غبار آلود زمین نے اٹھایا۔

الغرض حضرت علیؓ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی ہے، اس سے

حضرت ابوذر غفاریؓ کی امتیازی شان اور انفرادی صفت (راست گوئی اور حق گوئی) نمایاں ہوتی ہے؛ نیز یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ مذکورہ صفات میں دوسرے صحابہ کرام پر انہیں اولیت اور فوقیت حاصل تھی۔

اشکال:

حدیث الباب کی عبارت ”مَا أَظَلَّتِ الْخَضِرَاءُ، وَلَا أَقَلَّتِ الْغُبَرَاءُ“ سے یہ عیاں ہو رہی ہے کہ روئے زمین پر حضرت ابوذر سے زیادہ کوئی راست باز اور حق گو نہیں تھا، فَوَجَدْنَا هَذَا قَدْ أُخْبِرَ فِيهِ أَنَّ الْخَضِرَاءَ مَا أَظَلَّتْ، وَأَنَّ الْغُبَرَاءَ مَا أَقَلَّتْ مِنْ ذِي لَهْجَةٍ أَصْدَقَ مِنْ أَبِي ذَرٍّ. (شرح مشکل الآثار: ۲۱/۲) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صداقت، حق گوئی اور حق بات کی تصدیق کرنے میں اولیت کا مقام حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے۔

چنانچہ قرآن مجید کی متعدد آیات مبارکہ آپ کی شان میں نازل ہوئیں ہیں، خاص طور پر سورہ زمر آیت ۳۳ میں ”وَصَدَقَ بِهِ“ سے حضرت ابو بکر مراد ہیں کہ آپ نے سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی باتوں کی تصدیق کی: ﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ اور جو نبی سچی بات لے کر آئے اور جس نے ان کی تصدیق کی وہی لوگ پریزگار ہیں۔ (سورہ الزمر: ۳۵)

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

أن المراد شخص واحد فالذي جاء بالصدق محمد والذي صدق به هو ابو بكر وهذا القول مروى عن علي رضي الله عنه وجماعة من المفسرين. (التفسير الكبير، سورہ زمر: ص ۲۴۳)

جواب:

یہاں پر فی نفسہ صداقت و سچائی میں دوسرے کی نفی کرنا مقصود نہیں؛ بلکہ یہاں اس بات کو ثابت کرنا ہے کہ صداقت و سچائی کے مراتب و درجات میں سب سے اعلیٰ و ارفع درجہ پر حضرت ابوذر غفاریؓ فائز تھے، اس اعتبار سے وہ یکتائے روزگار تھے اور اس میں وہ بے مثال تھے۔

رہا سچ بولنے کا مسئلہ تو ہر دور اور ہر طبقہ میں سچ بولنے والوں کی ایک تعداد ضرور ملتی ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ امام طحاویؒ نے اس اشکال کا جواب لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے:

وَلَمْ يَكُنْ فِي ذَلِكَ مَا يَنْفِي أَنْ يَكُونَ قَدْ كَانَ فِي أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ هُوَ فِي الصِّدْقِ مِثْلَهُ، فَكَانَ الَّذِي فِي هَذَا الْحَدِيثِ إِثْبَاتٌ أَعْلَى مَرَاتِبِ الصِّدْقِ لِأَبِي ذَرٍّ، وَلَيْسَ فِيهِ نَفْيٌ غَيْرِهِ مِنْ تِلْكَ الْمَرْتَبَةِ إِنَّمَا فِيهِ نَفْيٌ غَيْرِهِ أَنْ يَكُونَ فِي مَرْتَبَةٍ مِنْ مَرَاتِبِ الصِّدْقِ، أَعْلَى مِنْهَا، وَاللَّهُ نَسَأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ج: ۲، ص: ۱۲)

اقوال المحدثين:-

اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ یہ مبالغہ کے طور پر ہے:

وهذا على سبيل المبالغة وقيل المراد أنه لا يذهب الى التورية والمعارض في الكلام ولا يواسى مع الناس ولا يسامحهم في الحق، ويقول الحق ان كان مراً كما يحكى عن احواله. (حاشية ترمذي: ج: ۲، ص: ۲۲۰، ابواب المناقب)

اصدق مبالغه في صدقه لا أنه اصدق من كله على الاطلاق لان أباذر لا يكون اصدق من ابى بكر بالا جماع۔ (مرقاة جامع المناقب: حديث نمبر: ۶۳۹، فصل ثانی)



باب: ۸۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رَوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي مَنْ أَصْبَحَ جُنُبًا فِي يَوْمٍ
مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ هَلْ يَصُومُ ذَلِكَ الْيَوْمَ أَمْ لَا؟

﴿جنابت کی حالت میں روزہ رکھنے کی نیت کرنے کا بیان﴾

عَنْ شَمِيِّ مَوْلَى أَبِي بَكْرٍ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا بَكْرٍ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ يَقُولُ: كُنْتُ أَنَا وَأَبِي عِنْدَ
مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ - وَهُوَ أَمِيرُ الْمَدِينَةِ - ، فَذَكَرَ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ: مَنْ أَصْبَحَ جُنُبًا أَفْطَرَ ذَلِكَ
الْيَوْمَ فَقَالَ مَرْوَانُ: أَقْسَمْتُ عَلَيْكَ لَتَذْهَبَنَّ إِلَى أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ عَائِشَةَ، وَأُمِّ سَلَمَةَ تَسْأَلُهُمَا عَنْ
ذَلِكَ قَالَ: فَذَهَبَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ وَذَهَبْتُ مَعَهُ حَتَّى دَخَلْنَا عَلَى عَائِشَةَ، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهَا عَبْدُ
الرَّحْمَنِ، ثُمَّ قَالَ: يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ إِنَّا كُنَّا عِنْدَ مَرْوَانَ فَذَكَرَ لَنَا أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ: مَنْ أَصْبَحَ
جُنُبًا أَفْطَرَ ذَلِكَ الْيَوْمَ فَقَالَتْ عَائِشَةُ: بِسْمَا قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: يَا عَبْدَ الرَّحْمَنِ! أَتُرْغَبُ عَمَّا
كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُ؟ فَقَالَ: لَا وَاللَّهِ، فَقَالَتْ: "فَأَشْهَدُ عَلَى رَسُولِ
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصْبِحُ جُنُبًا مِنْ جَمَاعٍ غَيْرِ احْتِلَامٍ، ثُمَّ يَصُومُ ذَلِكَ الْيَوْمَ"
قَالَ: ثُمَّ خَرَجْنَا حَتَّى دَخَلْنَا عَلَى أُمِّ سَلَمَةَ، فَسَأَلْتُهَا عَنْ ذَلِكَ، فَقَالَتْ كَمَا قَالَتْ عَائِشَةُ،
فَخَرَجْنَا حَتَّى جِئْنَا مَرْوَانَ، فَذَكَرَ لَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ مَا قَالَتْ فَقَالَ مَرْوَانُ: أَقْسَمْتُ عَلَيْكَ يَا أَبَا
مُحَمَّدٍ لَتُرْكَبَنَّ دَابَّتِي فَإِنَّهَا بِالْبَابِ، فَلَتَذْهَبَنَّ إِلَى أَبِي هُرَيْرَةَ، فَإِنَّهُ بَارِئٌ بِالْعَقِيقِ فَلْتُخْبِرَنَّهُ
ذَلِكَ، فَرَكِبَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ، وَرَكِبْتُ مَعَهُ حَتَّى أَتَيْنَا أَبَا هُرَيْرَةَ، فَتَحَدَّثَ مَعَهُ عَبْدُ الرَّحْمَنِ
سَاعَةً، ثُمَّ ذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ فَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: لَا عِلْمَ لِي بِذَلِكَ إِنَّمَا أَخْبَرَنِيهِ مُخْبِرٌ. (شرح مشكل

الآثار: ۱۳/۲، ورواه البخاري: (۱۹۲۵، ۱۹۳۰، ۱۹۲۶، ۱۹۳۱، ۱۹۳۳) ومسلم: (۱۱۰۹)، وأبو داود:

(۲۳۸۸)، والترمذي: (۷۷۹)

خلاصۃ الحدیث:

روزہ بدنی عبادات میں ایک مہتمم بالشان عبادت ہے، اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک اہم رکن روزہ ہے، روزہ کا مقصد جہاں تقویٰ اور خدا ترسی ہے، وہیں روزہ اللہ تعالیٰ سے انعام و اکرام کے مستحق ہونے اور بخشش و مغفرت کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔

روزہ کا وقت صبح صادق سے غروب شمس تک ہے، اس مدت میں کھانا، پانی اور جماع سے دور رہنے کا نام صوم (روزہ) ہے، اسی وجہ سے روزہ کی حالت میں کوئی مسلمان مذکورہ اعمال میں سے کسی عمل کو عمدہ انجام دیدیتا ہے تو روزہ فاسد ہو جاتا ہے، نیز اس کی قضاء کے علاوہ اس پر کفارہ بھی واجب ہوتا ہے۔

لیکن روزہ کی حالت میں خواب میں کسی کو احتلام ہو گیا، اور غسل میں تاخیر ہو گئی، یا رات میں میاں بیوی نے آپسی تعلق قائم کیا، اور کسی عذر کی وجہ سے یا ایسے ہی غسل نہیں کر سکا، اور اسی حالت میں (سحری کھا کر) روزہ کی نیت کر لی، حتیٰ کہ جنابت کی حالت میں صبح کی، پھر دن میں غسل کیا، تو اس صورت میں بالاتفاق روزہ فاسد نہیں ہوگا، البتہ یہ عمل خلاف اولیٰ ہوگا، جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے اس مسئلہ کی تائید ہوتی ہے:

وعن عائشة رضي الله عنها قالت : كان رسول الله ﷺ يدركه الفجر في رمضان وهو جنب من غير تحلّم فيغتسل ويصوم متفق عليه. (رواه البخاري في كتاب الصوم، باب اغتسال الصائم، رقم الحديث: ۱۹۳۰، وفي مسلم: رقم: ۱۱۰۹، وفي مسند احمد: ۳۰۸-۶۳۱۲)

لیکن امام طحاویؒ کی پہلی روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ حالت جنابت میں روزہ کی نیت کو منفسد صوم کا سبب سمجھتے تھے، چنانچہ اس کی تحقیق کے لئے حضرت عبدالرحمنؓ، حضرت عائشہؓ اور ام سلمیٰؓ کی خدمت میں شریف لے گئے اور ان سے حضرت

ابو ہریرہؓ کی رائے کے سلسلہ میں استفسار کیا، تو حضرت عائشہؓ اور ام سلمیٰؓ نے ان کے نظریہ کا انکار کیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا عمل نہیں ہو سکتا، پھر حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس حضرت عائشہؓ اور ام سلمیٰؓ کے قول کو پیش کیا تو حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ وہ دونوں مجھ سے زیادہ جاننے والے ہیں، اس لئے حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے سابق قول سے رجوع کر لیا۔

جیسا کہ علامہ شبرا احمد عثمانی صاحبؒ نے لکھا ہے:

قال: ”من أدرکہ الفجر جنباً فلا یصم“ ثم ذکر انه حین بلغه قول عائشة وأم سلمة صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ کان یصبح جنباً ویتم صومه رجوع ابو ہریرہؓ عن قولہ. (موسوعة فتح الملهم، کتاب الصیام ص: ۲۰۱، ج: ۶، المكتبة الاشرفية، دیوبند)

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ نے ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے تحریر کیا ہے:

وروی ابن ابی شیبہ من طریق قتاده عن سعید بن المسیب ان اباهریرة رجوع عن فتیاء: من أصبح جنباً فلا صوم له. (فتح الباری: ج ۴، ص: ۶۲۷، رقم الحدیث: ۱۹۲۶)

تعارض:

مذکورہ باب کی پہلی فصل کی ہر حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ”من أصبح جنباً أفطر ذلك اليوم“ اور حضرت عائشہؓ کا قول: ”فقلت عائشة: بئسما قال ابو ہریرہؓ۔۔۔ فقلت فاشهد على رسول الله ﷺ كان یصبح جنباً من جماع غیر احتلام ثم یصوم ذلك اليوم“ اور حضرت ام سلمیٰؓ کا قول: ”فقلت: قد کان رسول الله ﷺ یصبح وهو جنب من نکاح غیر احتلام ثم یصوم“ ذکر کیا گیا ہے، بظاہر حضرت ابو ہریرہؓ کا قول حضرت عائشہ اور ام سلمیٰؓ کے قول سے متعارض ہے۔

لیکن کیا وجہ ہے کہ حضرت عائشہ اور ام سلمیٰؓ کے قول پر امت کو عمل کی اجازت ہے؛ مگر

حضرت ابو ہریرہؓ کے قول پر عمل کی اجازت نہیں؟ بلکہ یہ متروک کے درجہ میں ہے؟

جمع اور تطبیق:

اس کا جواب امام طحاویؒ نے اس طرح دیا ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت انسان عام انسانی صفات سے متصف تھے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم عام مسلمانوں کی طرح شریعت کے بھی مکلف تھے، اور جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یسر اور سہولت ملی ہے، اسی طرح عام مؤمنین و مؤمنات کو بھی، البتہ بعض چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت سے یہ بات واضح ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَهُوَ وَاقِفٌ عَلَى الْبَابِ
وَأَنَا أَسْمَعُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أَصْبِحُ جُنْبًا وَأَنَا أُرِيدُ الصَّوْمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ: "وَأَنَا أَصْبِحُ جُنْبًا، وَأَنَا أُرِيدُ الصَّوْمَ فَأَغْتَسِلُ وَأُصُومُ" فَقَالَ الرَّجُلُ: إِنَّكَ لَسْتَ مِثْلَنَا
قَدْ غَفَرَ اللَّهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ، فَعَضِبَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ:
"وَاللَّهِ إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ أَعْمُونَ أَحْشَاكُمْ لِلَّهِ تَعَالَى، وَأَعْلَمَكُمْ بِمَا أَتَقِي" وَلَمَّا وَقَفْنَا بِذَلِكَ....

(شرح مشکل الآثار: ج: ۲، ص: ۱۷)

اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ تشریحی احکام رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عام امت کے لئے یکساں ہیں، تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مذکورہ مسئلہ میں دونوں حکم (حالت جنابت میں روزہ کی نیت کرنا درست ہے یا درست نہیں ہے) من جانب اللہ ہیں، البتہ ایک نسخ ہے اور دوسرا منسوخ، اور حضرت ابو ہریرہؓ اور پہلی فصل کی روایت کے حکم میں عسر و سختی ہے، جبکہ عائشہ و ام سلمہؓ کی حدیث میں یسر و سہولت۔

الغرض پہلی فصل والی روایت منسوخ ہے اور حضرت عائشہؓ و حضرت ام سلمہؓ والی روایتیں ناسخ، اس لئے حضرت عائشہ اور ام سلمہؓ والی روایت پر عمل کرنا درست ہے۔

فَكَانَ جَوَابَنَا فِي ذَلِكَ أَنَا قَدْ وَجَدْنَا عَنْهُ مَا قَدْ دَلَّ عَلَى أَنَّ حُكْمَهُ فِي نَفْسِهِ كَانَ فِي ذَلِكَ كَحُكْمِ سَائِرِ أُمَّتِهِ فِيهِ وَذَلِكَ: (شرح مشکل الآثار: ص: ۱۷۲)

وَلَمَّا وَقَفْنَا بِذَلِكَ عَلَى اسْتِوَاءِ حُكْمِهِ وَحُكْمِ سَائِرِ أُمَّتِهِ فِي ذَلِكَ، عَقَلْنَا أَنَّ ذَيْنِكَ الْمَعْنِيِّينَ قَدْ كَانَا حُكْمَيْنِ لِلَّهِ تَعَالَى نَسَخَ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ، وَكَانَ مَا فِي حَدِيثِ الْفَضْلِ مِنْهُمَا التَّغْلِيظُ، وَمَا فِي حَدِيثِ عَائِشَةَ، وَأُمِّ سَلَمَةَ التَّخْفِيفُ،.... (شرح مشکل الآثار: ص: ۱۸۲)

وَكَانَ فِي ذَلِكَ وَجُوبُ اسْتِعْمَالِ مَا جَاءَ فِي حَدِيثِ عَائِشَةَ، وَأُمِّ سَلَمَةَ دُونَ مَا فِي حَدِيثِ الْفَضْلِ. (حوالہ سابق)

نظیر:

حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ کی حدیث کی موافقت روزہ کی ابتدائی حالت اور حکم سے ہوتی ہے، جس کو امام طحاویؒ نے اپنی کتاب شرح مشکل الآثار میں ذکر کیا ہے۔

اس میں پہلے امت کے لئے عسر و تنگی تھی (یعنی غروب شمس کے بعد سونے سے قبل کھانا، پینا اور میاں بیوی کے تعلقات قائم کرنا درست تھا؛ مگر سونے کے بعد اس کی اجازت نہیں تھی) اس لئے اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ آیت: ﴿أَجَلٌ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ﴾ (البقرة: 187) کو نازل فرما کر یسر و سہولت کی راہ عطا کی، اور رات کو روزہ کے حکم سے مستثنیٰ کیا۔

وَكَانَ فِي ذَلِكَ مَا قَدْ دَلَّ عَلَى إِبَاحَةِ إِثْبَانِ النِّسَاءِ فِي اللَّيْلِ إِلَى طُلُوعِ الْفَجْرِ وَلَا يَكُونُ الْإِغْتِسَالُ الَّذِي يُوجِبُهُ ذَلِكَ الْإِثْبَانُ إِلَّا فِي النَّهَارِ، وَفِي ذَلِكَ مَا يُبَيِّحُ الصَّوْمَ مَعَ الْجَنَابَةِ، وَفِيهِ

مُؤَافَقَةٌ مَا فِي حَدِيثِ عَائِشَةَ، وَأُمِّ سَلَمَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيهِ. (شرح مشکل الآثار: ص: ۱۸، ج: ۲)

اقوال المحدثین:

علامہ شبیر احمد عثمانی نے بھی حدیث ابی ہریرہ اور حدیث عائشہ اور ام سلمہ کی روایت میں تعارض کو دور کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ اور ام سلمہ کی حدیث حضرت ابو ہریرہ کے قول کے مقابلہ میں تین اعتبار سے راجح اور اقویٰ ہے:

(۱) زیادہ اعتماد کے لائق ہے، (۲) حضرت عائشہ اور ام سلمہ دونوں کو زیادہ بصرت حاصل تھی، (۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ دونوں کی حدیث اوفق للقرآن بھی ہے۔

فلما ثبت عنده ان حديث عائشة رضى الله عنها وام سلمة رضى الله عنها على ظاهره وهذا متاويل رجع عنه، وكان حديث عائشة وام سلمة اولى بالاعتماد لانهما اعلم بمثل هذا من غيرهما، ولأنه موافق للقرآن، فان الله تعالى اباح الأكل والمباشرة الى طلوع الفجر، فقال الله تعالى: **فَالآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ** ﴿البقرة: ۱۸۷﴾ (فتح الملهم، كتاب الصيام: ۲۰۱/۶)

محدث کبیر شیخ خلیل احمد صاحب سہارن پوری نے بھی حضرت عائشہ اور ام سلمہ کے قول کو جمہور کا قول اور ناسخ قرار دیا ہے اور حضرت ابو ہریرہ کے قول کو منسوخ قرار دیا ہے۔

قلت: وهذا المذهب هو الذي اجمع عليه الامة وارتضاه الجمهور... كما نقله الترمذي ويقوى قول الجمهور أن قوله تعالى ﴿أَجَلٌ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفْتُ إِلَى نِسَائِكُمْ﴾ (البقرة: 187) يقتضى اباحة الوطء فى ليلة الصيام... ويؤيد دعوى النسخ رجوع أبى هريرة

عن الفتوى بذلك كما في رواية البخاري: انه لما اخبر بما قالت ام سلمة وعائشة فقال:
هما أعلم برسول الله“ وفي رواية ابن جريج ”رجع ابو هريرة مما كان يقول في ذلك“.
(بذل المجهود، كتاب الصيام، ج: ۸، ص: ۵۳۷)



باب: ۸۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ:
 ”إِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَأَنْتَهُوا عَنْهُ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأَفْعَلُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ“

﴿ مامورات و منہیات کے حکم میں فرق کا بیان ﴾

عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، أَخْبَرَنِي ابْنُ الْمُسَيَّبِ، وَأَبُو سَلَمَةَ قَالَا: كَانَ أَبُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ يُحَدِّثُ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُولُ: ”مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوهُ وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَافْعَلُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ مَسَائِلِهِمْ، وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ“ . (شرح مشکل الآثار: ۲۳۷/۲، ورواه مسلم: (۱۳۳۷)، والنسائي: ۱۱۰۶۵، وأحمد: ۲۴۷۲/۲)

خلاصہ الحدیث:

اسلام دین رحمت ہے، دین کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس کے مطابق زندگی گزارنے میں کوئی دشواری نہیں ہے، اسی بنا پر مثبت اور منفی احکام کی بجا آوری میں فرق کیا ہے، مثبت اعمال کی ادائیگی مکلفین کی طاقت و استطاعت پر موقوف کیا ہے، اور معذورین سے ضرر و حرج کو دور کیا ہے، لیکن منفی اعمال سے (یعنی وہ چیزیں، جو امت پر حرام ہیں ان سے) علی الاطلاق اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے، اسی وجہ سے زکوٰۃ، حج کی ادائیگی صرف مستطیع پر فرض ہے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ: ۲۸۶)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں یہی مضمون کو واضح فرمایا ہے کہ مثبت اعمال

اور عبادت مکلفین کی طاقت پر موقوف ہے؛ لیکن منہی عنہ اعمال سے اجتناب علی الاطلاق ہے، یعنی شریعت میں منہیات سے اجتناب کرنے کا حکم مامورات کے مقابلہ میں اشد ہے، کیوں کہ منہیات سے اجتناب کا حکم علی الاطلاق ہے۔

جیسا کہ امام طحاویؒ بھی مذکورہ باب کے تحت احادیث جمع کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: فَتَأْمَلْنَا هَذَا الْحَدِيثَ؛ لِنَقِفَ عَلَى الْمَعْنَى الَّذِي فَتَرَقَّ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَيْنَ مَا يَنْهَى عَنْهُ فَأَمَرَ بِاجْتِنَابِهِ اجْتِنَابًا مُطْلَقًا، وَبَيْنَ مَا يَأْمُرُ بِهِ فَجَعَلَ ذَلِكَ عَلَى مَا يَسْتَطِيعُهُ الْمَأْمُورُونَ، وَلَمْ يَجْعَلْهُ أَمْرًا مُطْلَقًا. (شرح مشکل الآثار: ج: ۲، ص: ۲۵)

اقوال المحدثین:

علامہ شہر احمد عثمانیؒ نے حدیث کے آخری جزء کو اسلام کے اہم قواعد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم میں شامل کیا ہے کہ وہ ایسا جامع کلمہ ہے، جس کے تحت بے شمار احکام آتے ہیں، مثلاً نماز ہے، اس میں کچھ اعمال کی حیثیت ارکان کی ہے، کچھ کی شرائط کی اور بعض اعمال سنن و مستحبات ہیں، اگر کوئی شخص سبھوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز ادا کرتا ہے تو یقیناً اس کی نماز احسان والی ہوگی، لیکن اگر بعض ارکان کو ادا کرنے سے قاصر ہے تو وہ اسے چھوڑ سکتا ہے، اور اس کے لئے رخصت ہے کہ اپنی قدرت کے اعتبار سے نماز کی ادائیگی کرے اسی طرح شریعت کا حکم تمام بدنی اور مالی عبادات میں ہے، اور یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے قول ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ۱۶) کے موافق ہے۔

قوله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ "فَإِذَا أَمَرْتُمْ بِشَيْءٍ فَأَتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ" هَذَا مِنْ قَوَاعِدِ الْإِسْلَامِ الْهَمَّةُ وَمِنْ جَوَامِعِ الْكَلِمِ الَّتِي أَعْطَاهَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ، وَيَدْخُلُ فِيهِ مَا لَا يَحْصِي مِنَ الْأَحْكَامِ كَالصَّلَاةِ بِأَنْوَاعِهَا فَإِذَا عَجَزَ عَنْ بَعْضِ أَرْكَانِهَا أَوْ بَعْضِ شُرُوطِهَا أَتَى بِالْبَاقِي... وَهَذَا

الحديث موافق لقول الله تعالى: ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ۱۶) (موسوعة فتح
القدیر، کتاب الحج، ج: ۶، ص: ۲۸۵، المكتبة: اشرفیہ دیوبند)

امام نووی نے بھی حدیث کی آخری کڑی کو جوامع الکلم اور اسلام کے ایسے قواعد سے
متعلق کیا ہے، جن پر بے شمار احکام متفرع ہوئے ہیں، مثلاً نماز، وضوء، ستر عورت، زکوٰۃ اور روزہ
وغیرہ۔

قال النووي هذا من جوامع الكلم وقواعد الاسلام ويدخل فيه كثير من الاحكام
كالصلوة لمن عجز عن ركن منها أو شرط فيأتي بالمقدور. (فتح الباري بشرح صحيح
البخاري: ج: ۱۵، ص: ۱۹۰)

علامہ ابن حجر نے اس حدیث کی روشنی میں یہ تحریر کیا ہے کہ شریعت میں منہیات سے
اجتناب کرنے کا حکم مامورات کے مقابلہ میں اشد ہے، کیوں کہ منہیات سے اجتناب کا حکم علی
الاطلاق ہے، اگرچہ ترک میں مشقت ہی کیوں نہ ہو۔

واستدل بهذا الحديث على أن اعتناء الشرع بالمنهيات فوق اعتناؤه بالمأمورات
انه اطلق الاجتناب في المنهيات ولو مع المشقة في الترك وقيد في المأمورات بقدر الطاقة.
(فتح الباري، المكتبة الحجاز: ج: ۱۵، ص: ۱۹۰)

اشکال:

یہاں مثبت اعمال (مامورات) میں استطاعت کی قید ہے؛ لیکن منہی عنہ اعمال سے ترک
میں اس کی قید کیوں نہیں ہے؟

جواب:

اس سلسلہ میں علماء اور محدثین نے درجہ ذیل صورتوں میں جواب دیا ہے:

حافظ ابن حجرؒ رقمطراز ہیں کہ اُمر اور نہی میں بڑا فرق ہے، مثلاً اگر شہوت کا داعیہ نہ ہو، تو ہر شخص ”کف عن المعصیة“ پر قادر ہوتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ مثبت فعل اس کے تعاطی سے عجز ایک امر محسوس ہے؛ لیکن منہی عنہ مخفی امر ہے، اس لئے اوامر میں استطاعت کی قید ہے، لیکن نواہی میں اس کی کوئی قید نہیں ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے:

بخلاف الفعل فإن العجز عن تعاطیه محسوس، فمن ثم قید فی الامر بحسب

الاستطاعة دون النهی۔ (فتح الباری، المكتبة الحجاز: ج: ۱۵، ص: ۱۹۰)

علامہ ماوردیؒ نے فرق کی وجہ یہ ذکر کی ہے کہ ”کف عن المعاصی“ (گناہوں کو چھوڑنا) ترک ہے اور یہ آسان ہے، اس کے برخلاف طاعت کا عمل فعل ہے اور یہ مشکل ہے، اس لئے دونوں میں فرق ہے۔ (حوالہ سابق)



باب :- ۸۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الرَّجُلِ الَّذِي أَوْصَى بِنَيْهِ إِذَا مَاتَ أَنْ يَحْرِقُوهُ، ثُمَّ يَسْحَقُوهُ، ثُمَّ يَذْرُوهُ فِي الرِّيحِ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ، وَفِي غُفْرَانِ اللَّهِ لَهُ مَعَ ذَلِكَ۔

﴿ایمان خوف اور رجاء کے درمیان ہے﴾

عَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: أَصْبَحَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ، فَذَكَرَ حَدِيثًا طَوِيلًا مِنْ حَدِيثِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، ثُمَّ ذَكَرَ فِيهِ شَفَاعَةَ الشُّهَدَاءِ قَالَ: "ثُمَّ يَقُولُ اللَّهُ: أَنَا أَزْهَمُ الرَّاحِمِينَ، انظُرُوا فِي النَّارِ هَلْ فِيهَا مِنْ أَحَدٍ عَمِلَ خَيْرًا قَطُّ؟ فَيَجِدُونَ فِي النَّارِ رَجُلًا، فَيَقَالُ لَهُ: هَلْ عَمِلْتَ خَيْرًا قَطُّ؟ فَيَقُولُ: لَا غَيْرَ أَنِّي كُنْتُ أَمْرًا وَلَدِي إِذَا مِتُّ فَأَحْرَقُونِي بِالنَّارِ، ثُمَّ اطْحَنُونِي، حَتَّى إِذَا كُنْتُ مِثْلَ الْكُحْلِ، فَادْهَبُوا بِي إِلَى الْبَحْرِ، فَادْزُونِي فِي الرِّيحِ فَوَاللَّهِ لَا يَقْدِرُ عَلَيَّ رَبُّ الْعَالَمِينَ أَبَدًا، فَيَعَاقِبُنِي، إِذْ عَاقَبْتُ نَفْسِي فِي الدُّنْيَا عَلَيْهِ، قَالَ اللَّهُ تَعَالَى لَهُ: لِمَ فَعَلْتَ هَذَا؟ قَالَ: مِنْ مَخَافَتِكَ، فَيَقُولُ: انظُرْ مُلْكًا بَاعَ عَظْمَ مُلْكٍ، فَإِنَّ لَكَ مِثْلَهُ وَعَشْرَةَ أَمْثَالِهِ". (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۷۲، ورواه الدارمی: ص: ۵۷،

وأحمد: ۱/۵۷-۴، وابن حبان: (۶۴۷۶)

خلاصۃ الحدیث:

یہ بات مسلم ہے کہ ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے، اور "رجاء" کا معنی اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بخشش کی امید کرنا ہے، جو کبھی یقین کی کیفیت تک پہنچ جاتی ہے۔

اور ”رجاء“ کا متضاد ”خوف“ ہے جس کا معنی اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نقصان، دکھ اور عذاب کے ملنے کا اندیشہ ہو، جو کبھی یقین کی حد تک جا پہنچتا ہے، الغرض کامل ایمان والا شخص اللہ کی رحمت اور بخشش کی امید اور اللہ کی ناراضگی اور عذاب کے خوف کے درمیان ہی رہتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دونوں چیزوں کو ذکر کیا ہے۔

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا﴾ (الإسراء: ۵۰)

وہی ہیں (ایمان والے) جو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اسباب اختیار کرتے ہیں اور اللہ کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں، اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شک آپ کے رب کا عذاب ایسا ہے کہ اس سے ڈرا ہی جانا چاہئے۔

جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کریم میں اپنی رحمت کی وسعت اور عظیم بخشش کی خبریں عطاء فرمائی ہیں اور خوف زدہ رہنے کا حکم اور تعلیم بھی دی ہے، وہیں دوسری طرف اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی احادیث سے بھی رحمت اور خوف دونوں کی تعلیم دی گئی ہے۔

چنانچہ خوف خدا کی ایک جھلک بنی اسرائیل کے ایک شخص کی زندگی میں ملتی ہے، جس کا ذکر امام طحاویؒ نے اس باب کی پہلی حدیث میں کیا ہے جو حضرت ابو بکر الصدیقؓ کے واسطے سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے ضمن میں شہداء کی شفاعت کا تذکرہ کیا، پھر فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ میں سب سے زیادہ مہر بانی کرتا ہوں تمام رحم کرنے والوں میں پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جہنم میں دیکھ! کیا اس میں کوئی شخص ہے، جس نے کوئی عمل خیر کیا ہو؟ چنانچہ جہنم میں ایک شخص کو پائیں گے، ان سے عمل خیر کے بارے میں سوال ہوگا، تو وہ نہیں میں جواب دے گا، اور کہے گا کہ میں نے (عمل خیر نہ ہونے کی

وجہ سے) اپنی اولاد کو حکم دیا تھا کہ جب میری موت ہو جائے گی، تو مجھے جلا کر سمندر اور ہوا میں ڈال دینا، خدا کی قسم اللہ تعالیٰ میرے اوپر کبھی بھی قادر نہیں ہوں گے کہ پھر مجھے سزا میں مبتلا کریں چونکہ دنیا ہی میں میں نے نفس کو تنگی میں ڈال کر سزا دیدی ہے، اللہ تعالیٰ اس (بنی اسرائیل) شخص سے کہیں گے تم نے یہ عمل (وصیت کا) کیوں کیا؟ جواب دے گا، تیرے خوف کی وجہ سے۔ (شرح مشکل الآثار: ۲۷/۲)

امام طحاویؒ نے بنی اسرائیل کے اس موصی کی وصیت سے یہ معنی اور مفہوم لیا ہے کہ اس کی شریعت میں ایسے عمل کے ذریعہ خدا کی قربت اور اس کی رحمت کو طلب کرنے اور اس کے عذاب آخرت سے پناہ چاہنے کا یہ طریقہ تھا (جو جائز تھا) جیسے امت محمدیہ میں سے بعض حضرات رحمت الہی کی امید میں اپنی لاش کو ”لحد“ میں رکھنے کی وصیت کرتے ہیں۔

فَوَجَدْنَا ذَلِكَ مُحْتَمِلًا أَنْ يَكُونَ كَانَ مِنْ شَرِيْعَةِ ذَلِكَ الْقَرْنِ الَّذِي كَانَ ذَلِكَ الْمُوصِي مِنْهُ الْقُرْبَةَ بِمِثْلِ هَذَا إِلَى رَبِّهِمْ جَلَّ وَعَزَّ؛ خَوْفَ عَذَابِهِ إِيَّاهُمْ فِي الْآخِرَةِ؛ وَرَجَاءَ رَحْمَتِهِ إِيَّاهُمْ فِيهَا بِنَعَجِيلِهِمْ لِأَنفُسِهِمْ ذَلِكَ فِي الدُّنْيَا كَمَا يَفْعَلُ مَنْ أُمَّتِنَا مَنْ يُوصِي مِنْهُمْ بِوَضْعِ خَدِّهِ إِلَى الْأَرْضِ فِي لِحْدِهِ رَجَاءَ رَحْمَةِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ إِيَّاهُ بِذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۲۸/۲)

اشکال:

حدیث الباب کے آخری جز میں موصی کا قول ”فواللہ لا یقدر علی رب العالمین أبدا“ باری تعالیٰ کی قدرت ”علی احياء الموتی“ اور ”بعث بعد الموت“ کی نفی کا مستلزم ہے، جو کفر کا موجب ہے، اور کافر کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتے، جب کہ حدیث کا آخری کلمہ اور مسلم شریف کی اس ”فقال له ما حملك على ما صنعت و فقال خشيتك يارب أو قال مخافتك، فغفر له بذلك“ عبارت سے یہ بات عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خوف کی وجہ سے معاف کر دیا، تو

اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب اس نے کلمہ کفر زبان سے ادا کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے کس بنیاد پر معاف کر دیا؟

جواب:

امام طحاویؒ نے اس اشکال کا جواب اس طرح دیا ہے کہ موسیٰ کا قول ”فواللہ لا یقدر علی رب العالمین“ باری تعالیٰ کی ”قدرت علی احياء الموتی“ اور ”بعث بعد الموتی“ کی نفی کا مستلزم نہیں، اگر یہ معنی ہوتا، تو موسیٰ کا کافر ہونا لازم آتا، اور کافر کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں تعالیٰ اور نہ جنت میں داخل کرتے، جبکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے ”فغفر له۔۔۔“ کا لفظ ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا، اس لئے یہاں موسیٰ کا قول ”فواللہ لا یقدر علی رب العالمین“ کا معنی ”لا یضییق اللہ علی ابداء“ ہے (یعنی اللہ تعالیٰ مجھ پر کبھی تنگ نہیں کریں گے)

اقوال المحدثین:-

موسیٰ اپنی بات میں ”بعث بعد الموت“ اور قدرت باری تعالیٰ کے منکر نہیں ہے۔ جیسا کہ اشکال میں ذکر کیا گیا ہے؛ بلکہ باری تعالیٰ ”بعث بعد الموت“ اور ”احیاء الموتی“ پر قادر ہے، موسیٰ نے یہ بات جہالت کی بناء پر کہی ہے، اور کفر انکار صفت کی وجہ سے لازم آتا ہے؟ نہ کہ جہالت صفت سے، لہذا باری تعالیٰ کی صفت ”قدرت علی البعث“ کی جہالت مستلزم کفر نہیں ہوگا جنانچہ ابوالحسن اشعریؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔

قال بعضهم: انه لم یجد قدرة الله تعالى، ولكنه جهل صفة من صفات الله تعالى، والكفر انما هو الجھود، أما جهل صفة من صفات الله تعالى، فليس مستلزماً للكفر كما هو مذهب الامام ابی الحسن الاشعری رحمه الله تعالى الخ۔ (تكملة فتح الملهم: ۱۶/۱۲، مکتبہ اشرفیہ)

نیز تکملہ فتح الملہم کی دوسری عبارت سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ موسیٰ قدرت باری تعالیٰ کے منکر نہیں ہے؛ بلکہ غلبہ خوف میں عقل سلب ہونے کی وجہ سے ایسی بات کہی اور مسلوب العقل کی بات شریعت میں معتبر نہیں، جیسا کہ غافل، ذاہل، اور ناسی کی بات شریعت میں معتبر نہیں ہے، اور علامہ تقی عثمانی مدظلہ نے اسی جواب کو احسن کہا۔

وأحسن الأجوبة عندی ان اللفظ علی ظاهره ولكنہ قال ذالك فی حال رحمته وغلبة الخوف علیہ حتی ذهب بعقله ولم یقله قاصداً الحقیقة معناه بل فی حالة كان منها كالغافل والذاهل والناسی الذی لا یؤخذ بما صدر منه. (تکملہ فتح الملہم: ۱۶/۱۲، مکتبہ اشرفیہ)

اور فتح الباری کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ نے وہ کام خشیت خداوندی کی وجہ سے کیا ہے، لہذا اس کا خشیت خداوندی کا اعتراف اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ”بعث بعد الموت“ اور ”قدرت علی الاحیاء“ کا معترف ہے۔

وقد ظهر ایمانه باعترافه بانہ انما فعل ذلک من خشية اللہ۔ الخ۔ (فتح الباری :

۲۰۶/۷)

وَكَانَ جَوَابًا لَهُ فِي ذَلِكَ أَنَّ الَّذِي كَانَ مِنْ ذَلِكَ الْمُوصِي مِنْ قَوْلِهِ لِيَبِيهِ: ”فَوَاللَّهِ لَا يُقَدِّرُ عَلَيَّ رَبُّ الْعَالَمِينَ“ لَيْسَ عَلَيَّ نَفْيُ الْقُدْرَةِ عَلَيْهِ فِي حَالٍ مِنَ الْأَحْوَالِ، وَلَوْ كَانَ ذَلِكَ كَذَلِكَ لَكَانَ كَافِرًا، وَلَمَّا جَازَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُ، وَلَا أَنْ يُدْخِلَهُ جَنَّتَهُ؛ لِأَنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ، وَلَكِنَّ قَوْلَهُ: ”فَوَاللَّهِ لَا يُقَدِّرُ عَلَيَّ رَبُّ الْعَالَمِينَ أَبَدًا“ هُوَ عِنْدَنَا وَاللَّهُ أَعْلَمُ عَلَيَّ التَّضْيِيقَ أَيُّ لَا يُضَيِّقُ اللَّهُ عَلَيَّ أَبَدًا، فَيَعْدُ بِنِي بِتَضْيِيقِهِ عَلَيَّ لِمَا قَدْ قَدَّمْتُ فِي الدُّنْيَا مِنْ عَدَابِي نَفْسِي الَّذِي أَوْصَيْتُكُمْ بِهِ فِيهَا. (شرح مشکل الآثار: ۲۹/۲)

اس معنی کی تائید و استشہاد میں امام طحاوی نے سورہ فجر آیت ۱۶-۱۵ سے کی ہے۔

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ﴿١٦﴾ اور حضرت یونس کے قول: ﴿وَذَا النُّونِ إِذ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٨٧﴾ (الانبیاء: ۸۷) کو پیش کیا ہے۔ (حوالہ سابق)

بہر حال پہلی آیت میں ”فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ“ کا معنی فضیق علیہ ہے اور دوسری آیت میں بھی ”أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ“ کا معنی ”أَنْ لَنْ يَضِيقَ عَلَيْهِ“ ہے۔ (حوالہ سابق)

لہذا موسیٰ کے قول ”فَوَاللَّهِ لَا يَقْدِرُ عَلَيَّ رَبُّ الْعَالَمِينَ“ کا معنی ”لَا يَضِيقُ اللَّهُ عَلَيْهِ ابْدًا“ ہے (یعنی میں نے اپنی زندگی میں اولاد کو وصیت کر کے نفس کو تنگی میں ڈال کر تکلیف دی ہے، اس لئے اب اللہ مجھے کبھی بھی تنگی میں مبتلا نہیں کریں گے)

بلکہ موسیٰ کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کی وجہ سے اس کی جہالت والا عمل کو درگزر کر کے ایمان کی بنیاد پر معاف کر دیا۔

فَكَانَ الْعُقْرَانُ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى لَهُ بِإِيمَانِهِ، وَلَمْ يُؤَاخِذْهُ بِجَهْلِهِ الَّذِي لَمْ يُخْرِجْهُ مِنَ الْإِيمَانِ بِهِ إِلَى الْكُفْرِ بِهِ تَعَالَى، (شرح مشکل الآثار: ۳۸/۲)



باب :- ۸۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ احْتِمَالِ السَّبَبِ الَّذِي نَزَلَتْ فِيهِ: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾

(آل عمران: ۱۲۸)

﴿سوره آل عمران: (۱۲۸) کا شان نزول﴾

عَنْ سَالِمٍ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي صَلَاةِ الصُّبْحِ حِينَ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ التَّرْكَوعِ قَالَ: "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ" فِي الرُّكْعَةِ الْآخِرَةِ، ثُمَّ قَالَ: "اللَّهُمَّ الْعَنْ فُلَانًا وَفُلَانًا" يَدْعُو عَلَى نَاسٍ مِنَ الْمُتَنَافِقِينَ، قَالَ: فَأَنْزَلَ اللَّهُ: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾ الْآيَةَ.

(آل عمران: ۱۲۸) (شرح مشکل الآثار: ۳۹/۲، ورواه البخاری: (۲۰۹۹)، (۲۵۵۹)، (۴۳۲۶)، والنسائی

: ۲۰۳/۲، واحمد: ۱۴۸/۲)

خلاصہ الحدیث:

قرآن کریم کی آیات کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہیں جو کسی خاص واقعہ کے پیش آنے کے بعد نازل نہیں ہوئی ہیں، اور نہ کسی کے سوال کو ان کے نزول کا سبب بنایا گیا ہے، دوسری وہ آیات ہیں، جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی کے سوال کے جواب میں ہوئی ہیں، اور اسی کو آیات کا پس منظر کہتے ہیں، اور مفسرین کی اصطلاح میں "سبب نزول" یا "شان نزول" کہتے ہیں۔

چنانچہ مفتی شعیب اللہ خاں مفتاحی رقمطراز ہیں:

سبب النزول هو حادثة وقعت في زمن النبي ﷺ أو سوال وجه اليه فنزلت الآية أو

الآيات، تتحدث في شان تلك الحادثة أو تجيب على ذلك السؤال.

(نفحات العبير في مهمات التفسير: ۱/۹۵)

بہر حال سورہ آل عمران کی مذکورہ آیت ان آیات کے قبیل سے ہے، جس کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے ہوا ہے، جیسا کہ امام طحاویؒ نے حضرت سالم، حضرت ابوبکر بن عبدالرحمن اور حضرت انس رضی اللہ عنہم کی روایت میں اس کو ذکر کیا ہے، اس لئے یہاں تینوں صحابہ کی روایات کا خلاصہ قلم بند کیا جاتا ہے۔

(۱) حدیث سالم کا خلاصہ:-

حضرت سالمؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب فجر کی دوسری رکعت سے سراٹھاتے تو منافقین کے چند آدمی کے خلاف بددعا فرماتے، ”سمع اللہ“ کے بعد کہتے اے اللہ! فلاں اور فلاں پر لعنت کر، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ”لَیْسَ لَکَ مِنَ الْأَمْرِ شَیْءٌ“ نازل فرمائی۔

(شرح مشکل الآثار: ۲۹/۲)

(۲) حدیث ابوبکر بن عبدالرحمن کا خلاصہ:-

حضرت ابوبکر بن عبدالرحمن سے مروی ہے کہ آپ ﷺ جب فجر کی آخری رکعت سے سراٹھائے، تو ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ربیعہ اور کمزور مسلمانوں کی نجات کیلئے دعاء فرماتے اور قبیلہ مضر، لحيان، رعل، ذکوان، عصیۃ کے خلاف بددعا فرماتے، تو اس پر یہ آیت ”لَیْسَ لَکَ مِنَ الْأَمْرِ شَیْءٌ“ نازل ہوئی۔ (شرح مشکل الآثار: ۲۹/۲)

(۳) حدیث انس کا خلاصہ:-

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب احد کے دن نبی اکرم ﷺ زخمی ہو گئے، اور چہرہ مبارک خون سے لت پت ہو گیا، تو آپ ﷺ کے منہ سے نکلا ”وہ قوم کیسے فلاح پاسکتی ہے؟ جو اپنے نبی کو زخمی کر دے“ تو اس پر یہ آیت ”لَیْسَ لَکَ مِنَ الْأَمْرِ شَیْءٌ“ نازل ہوئی۔ (شرح مشکل

الآثار: ۲۰/۲)

مذکورہ بالا تینوں احادیث کی روشنی میں امام طحاوی علیہ الرحمہ نے آیت نمبر: ۱۲۸، سورہ آل عمران کے شان نزول (سبب نزول) کے سلسلہ میں درج ذیل اقوال نقل کئے ہیں:

(۱) یہ آیت ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے، اور اس کا سبب دو واقعات ہیں، مگر دونوں واقعات کو اس آیت کے نزول کا سبب قرار دینا بعید معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ جنگ احد کا واقعہ ۳ھ میں ہوا ہے، اور فتح مکہ کا واقعہ ۸ھ میں (یعنی آپ ﷺ نے جن کے لئے دعا کی اور بددعا دونوں کا زمانہ فتح مکہ سے پہلے کا ہے)۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۳)

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ آیت ان دونوں میں سے ہر ایک کے (یعنی جنگ احد اور واقعہ بیر معونہ دونوں کے) سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔

قيل إن هذه الآية نزلت في كل واحد منهما كان نزولها فيهما جمعيا۔ (حوالہ سابق)

چنانچہ اس قول کی توجیہ شیخ التفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ نے تفصیل کے ساتھ کی ہے، یہاں اس کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس آیت کے شان نزول میں مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت میں ہے کہ احد کی لڑائی میں جن لوگوں نے آپ ﷺ کو زخمی کیا، اور آپ ﷺ نے ان کے حق میں بددعاء کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور ایک روایت میں ہے کہ جب قبیلہ رعل اور ذکوان نے ستر (۷۰) صحابہ کو شہید کر ڈالا، جس کو واقعہ بیر معونہ کہتے ہیں، جب آپ ﷺ نے ان قبائل پر بددعاء کی، تب اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور امام احمدؒ اور امام بخاریؒ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ صبح کی نماز میں قومہ کے بعد دوسری رکعت میں یہ دعا کرتے اے اللہ! لعنت کر صفوان بن امیہ پر اور لعنت کر سہیل بن عمرو پر اور لعنت کر حارث بن ہشام پر اور چند قریش کے سرداروں کے نام لے کر بددعاء فرماتے،

اس پر یہ آیت نازل ہوئی، حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ یہ واقعات احد ہی کے سال میں پیش آئے، اور پیر معونہ کا واقعہ احد کے چار ماہ بعد صفر ۴ھ میں پیش آیا، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ اس آیت کا نزول ان تمام واقعات میں ہوا۔

(معارف القرآن: ۲/۴۷، ط: فرید بکڈ پو، دہلی)

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کا نزول دو مرتبہ علی الانفراد ہوا ہے، ایک مرتبہ اس واقعہ بعد ہوا ہے، جسے حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبدالرحمن بن ابی بکرؓ نے ذکر کیا ہے، اور دوسری مرتبہ اس واقعہ کے بعد ہوا ہے جسے حضرت انسؓ نے بیان کیا ہے؛ لیکن اس صورت میں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ جب یہ آیت دو مرتبہ دو واقعہ کے بعد نازل ہوئی ہے، تو قرآن میں دو جگہ پر ذکر کیوں نہیں ہے؟ مثلاً سورہ برأت آیت: ۷۳، دو مرتبہ نازل ہوئی ہے، تو دو حکموں پر مذکور بھی ہے، مگر آیت عمران قرآن میں ایک ہی جگہ پر ہے، لہذا سورہ آل عمران آیت: ۱۲۸ کے تحت مذکور تیسرے قول کا باطل ہونا لازم آتا ہے۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۴۳)

(۴) آثار میں مذکور ہے کہ یہ آیت دو سببوں میں سے ایک سبب سے متعلق لاعلیٰ التعمین نازل ہوئی ہے، پھر بعد میں دوسرے سبب کے وقت، لیکن اس کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے متنبہ کرنا ہے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہ جس کو چاہتے ہیں معاف کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں عذاب دیتے ہیں۔ (یہ اختیار کسی کو نہیں ہے)

اس آخری قول کو ذکر کرنے کے بعد امام طحاویؒ نے یہ واضح کیا ہے کہ تمام اقوال میں آخری قول ہمارے نزدیک احسن اور اولیٰ ہے۔

فہو اولہما عندنا بما قیل فی احتمال نزول الآیة المتلوۃ فیہا بہا۔

(شرح مشکل الآثار: ۲/۴۴)

اقوال المحدثین:

حافظ ابن حجر نے اس آیت کے تحت دو اسباب تحریر کئے ہیں، نیز آگے رقمطراز ہیں کہ اسے دو امور کے سلسلہ میں نازل ہونا ممکن ہے، اور دونوں امور ایک ہی قصہ میں پیش آئے ہیں۔

أبی بیان سبب نزول هذه الآية وقد ذكر في الباب سببين، ويحتمل أن تكون نزلت في الأمرين جميعاً فانها كانا في قصة واحدة. (فتح الباری، کتاب المغازی: ۱۱۳/۸)

مفتی تقی عثمانی صاحب بھی حضرت انسؓ کی روایت کی توجیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

سورہ آل عمران: آیت (۱۲۸) کے نزول کے سلسلہ میں احادیث مختلف ہیں، تاہم باب کی روایت اس معنی میں صریح ہے کہ یہ آیت غزوہ احد میں نازل ہوئی، جبکہ بخاری شریف اور مسند احمد کی کئی روایات اس بات پر دلالت ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جس وقت آپ ﷺ اپنی نماز میں بعض مشرکین کو اس کا نام لے کر بدعا کر رہے تھے۔

واختلفت الروایات فی سبب نزول هذه الآية، فروایة الباب صریحة فی انها نزلت فی غزوة أحد وورد فی عدة روایات للبخاری و احمد بن حنبل وغيره انها نزلت عندما شرع النبي ﷺ يلعن بعض المشركين فی صلاته بأسمائهم۔ (تكملة فتح الملمم: كتاب الجهاد والسير، ۱۶۲/۹، المكبة الاشرفیه، دیوبند)



باب :- ۸۴

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ:
 ”وَلَنْ يُؤْتَى اثْنَا عَشَرَ الْقَامِنِ قَلْبَةً“

﴿ قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”وَلَنْ يُؤْتَى اثْنَا عَشَرَ الْقَامِنِ قَلْبَةً“ کا مفہوم ﴾

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”خَيْرُ الصَّحَابَةِ أَرْبَعَةٌ،
 وَخَيْرُ السَّرَايَا أَرْبَعٌ مِائَةٌ، وَخَيْرُ الْجُيُوشِ أَرْبَعَةٌ آلَافٌ وَلَنْ يُغْلَبَ اثْنَا عَشَرَ الْقَامِنِ قَلْبَةً“ . شرح

مشکل الآثار: ۴/۲، ورواه أبو داود (۴۶۱۱)، والترمذي: (۱۵۵۵)، وأحمد: (۲۹۴/۱)

خلاصہ الحدیث:

یہ حقیقت پر مبنی ہے کہ جماعت و اجتماعیت کو معاشرتی زندگی میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا وعدہ ہے، نیز جماعت کے ساتھ نصرت اس وقت تک رہتی ہے جب تک جماعت باہم متفق اور متحد رہتی ہے، پھر اس کی قوت و وزن کا اندازہ ہوتا ہے، الغرض باہمی اتحاد و یگانگت کے رشتے قوی ہوتے ہیں، اور جماعت و افراد کے درمیان اتفاق ایک ایسی چیز ہے، جس کے مفید ہونے میں کسی مذہب و ملت اور کسی فکر و نظر والے کو اختلاف نہیں ہو سکتا، اور اسی لئے ہر شخص جو لوگوں کی اصلاح کی فکر کرتا ہے، وہ ان کو آپس میں متفق کرنے پر زور دیتا ہے، چنانچہ اسی بنا پر اس باب کی پہلی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار ساتھی کو بہترین رفقا، چار سو جیوش کو بہترین لشکری دستہ، اور چار ہزار کو بہترین لشکر قرار دیا ہے،
 خیر الصحابة اربعة .

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر رفقاء صرف تین ہوں اور ان میں ایک مریض ہو جائے اور وہ کسی ایک کو وصی بنا دے، تو اب وصی کی شہادت کے لئے صرف ایک شخص ہوگا، جبکہ ضرورت شاہدین کی ہے، لہذا اگر چار ہوں گے، تو یہ مصلحت پوری ہو جائے گی۔

قال ابو حامد: المسافر لا يخلو عن رجل يحتاج الى حفظه۔۔۔ قال المظهر: يعنى الرفقاء إذا كانوا أربعة خير من ان يكونوا ثلاثة. (بذل المجہود: ۱۹۶/۹، حدیث نمبر: ۲۶۱۱)

چنانچہ جنگ کی ابتدائی عہد میں قلت صحابہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ایک صحابی کو دس کے برابر قرار دیا تھا؛ تاکہ قلت تعداد اور بے سروسامانی کی حالت میں مسلمان مد مقابل دشمنان اسلام کی کثیر تعداد اور بھاری سامان سے مرعوب نہ ہو جائیں، لیکن جب صحابہ پر شاق ہوا، تو ایک مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ قرار دیا، اور تخفیف و سہولت کے لئے ایک صحابی کو دو کفار کے برابر قرار دیا، جیسا کہ سورہ انفال، آیت ۶۵-۶۶ میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ (معارف القرآن: انفال: ۲۷۷/۳)

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الدِّينِ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ﴾ (سورہ انفال: ۶۵)

اسی طرح ۸؎ میں غزوہ حنین کے موقع پر صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ بشارت دی کہ اگر تم لوگ بارہ ہزار ہوتے (اور میدان جہاد میں صابر اور ثابت قدم رہو گے، تو چاہے مقابل دشمنان اسلام تم سے زیادہ ہی کیوں نہ ہوں) تم لوگ مغلوب نہیں ہو گے، جیسا کہ اس حدیث کے آخری جزء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ سے واضح گف کیا ہے: ”ولن

کثرت پر نظر کی، اور خدا تعالیٰ کی نصرت اور اعانت پر نظر نہ گئی، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو شکست دی۔ الخ۔۔ (معارف القرآن: ۴۰۵/۳، سورہ توبہ: آیت: ۲۵)

مفتی شفیع صاحب لکھتے ہیں:

غزوہ حنین میں مسلمانوں کی تعداد کی کثرت اور سامان حرب کے کافی ہونے کی وجہ سے بعض صحابہ کرام کی زبان پر جو بڑا بول آ گیا تھا کہ آج تو کسی کی مجال نہیں، جو ہم سے بازی لیجاسکے، اللہ تعالیٰ کو اپنی اس محبوب جماعت کی زبان سے ایسے کلمات پسند نہ آئے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی حملہ کے وقت مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے، پھر اللہ کی مدد سے میدان فتح ہوا۔ (معارف القرآن: ۳۵۱/۴)

تعارض:

اللہ تعالیٰ نے اپنی محبوب امت کے لئے ایک جنگی قانون ذکر کیا ہے کہ اگر ایک مسلمان کے مقابلہ میں دو کفار میدان جہاد میں ہیں، تو ان سے مقابلہ کرنا ضروری ہے، فرار عن الزحف درست نہیں، ہاں اگر دشمن دو گنا سے زائد ہو، تو فرار عن الزحف درست ہے، جیسا کہ سورہ انفال کی آیت ۲۷ کی مفہوم ہے؛ لیکن حضرت ابن عباسؓ کی روایت (جو اس باب کی پہلی روایت ہے) اس آیت کے خلاف ہے چوں کہ اس میں ذکر ہے:

”ولن یغلب اثنا عشر الفامن قلة“ (اگر صحابہ بارہ ہزار ہیں، گرچہ خصوم تعداد میں زیادہ ہوں؛ لیکن صحابہ کرام مغلوب نہیں ہوں گے) اس اعتبار سے آیت بالا اور حدیث ابن عباس میں تعارض واقع ہے۔

جمع و تطبیق:-

سورۃ الانفال، آیت: ۲۷ میں جو تعداد مذکور ہے، وہ دراصل قانون جنگ کے اعتبار

سے ہے اور یہ رخصت کے قبیل سے ہے، اگر مسلمانوں کی تعداد کے مقابلہ میں مشرکین کی تعداد کئی گنا زیادہ ہو، تو اس صورت میں مسلمانوں کے لئے ”فرار عن الزحف“ کی گنجائش ہوگی، تاہم مسلمانوں کا خصوم مشرکین کے مقابلہ میں اللہ کی مدد و نصرت پر بھروسہ کرتے ہوئے ثابت قدم رہنا اور جام شہادت کے لئے دثار ہنا اولیٰ ہوگا۔

اگرچہ غزوہ حنین میں صحابہ کرام کی تعداد بارہ ہزار تھی، مشرکین کی تعداد چار ہزار، مگر رسول اللہ ﷺ کا یہ جملہ ”ولن یغلب اثنا عشر الفامن قلة“ (بارہ ہزار ہو تو قلت تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوگے) عزیمت اور اولیت پر دال ہے، اس بنا پر آپ ﷺ نے فرمایا اگرچہ مشرکین زیادہ تعداد میں ہوں، مگر مسلمانوں کو میدان جہاد سے فرار اختیار نہیں کرنا چاہئے۔

امام طحاویؒ نے اس کی صراحت کی ہے:

فَعَادَ الْفَرَضُ عَلَيْهِمْ فِي ذَلِكَ أَنْ لَا يَفْرُوا مِنْ مِثْلِيهِمْ، وَكَانَ ذَلِكَ مُطْلَقًا فِي قَلِيلِ الْعَدَدِ وَفِي كَثِيرِهِ، ثُمَّ خَصَّ اللَّهُ تَعَالَى عَلَى لِسَانِ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْإِثْنَيْ عَشَرَ أَلْفًا كَمَا خَصَّهَا بِهِ أَنْ لَا تَفْرَ مِمَّا فَوْقَهَا مِنَ الْأَعْدَادِ. (شرح مشکل الآثار: ۳۹/۲)

رہا یہ سوال کہ رسول اللہ ﷺ نے بارہ ہزار کی تخصیص کر کے غلبہ کی پیشین گوئی کیوں کی؟ اس سلسلہ میں محدثین کی توجیہات سے یہ بات عیاں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی غرض غلبہ صحابہ اور فتح کو اس تعداد پر محصور کرنا نہیں ہے؛ بلکہ جنگ کے عام اصول و ضابطہ کے لحاظ سے غلبہ کی خبر دینا ہے، چوں کہ جو فوجی دستہ تین محاذوں (میسرہ، میسرہ اور قلب) پر شیشہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح دشمنوں کا مقابلہ کرتا ہے، وہ عام طور پر فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوتا ہے، اس وجہ سے صحابہ کرام (جو بارہ ہزار تھے) تین محاذوں پر چار چار ہزار کی تعداد پر باسانی دشمنوں سے جنگ کر سکتے تھے، اس لئے آپ ﷺ نے ”ولن یغلب اثنا عشر الفامن قلة“ ارشاد فرمایا؛ لیکن سوء اتفاق صحابہ کرام میں کثرت تعداد پر عجب اور فخر کی صفت پیدا ہوگئی، اس لئے اللہ نے غلبہ کو

تکست میں بدل دیا، ﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا
فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّذَبِّرِينَ﴾

(توبہ: ۲۵)

چنانچہ صاحب بذل نے اسی بات کو اس طرح ذکر کیا ہے:

”ولن يغلب اثنا عشر الفا من قلة“ معناه لو كصاروا مغلوبين لم يكن للقلة بل
لأمر آخر سواها، وانما لم يكونوا قليلين، والاعداء مما لا يعد ولا يحصى، لان كل واحد
من الأتلات جيش، قوبل بالميمنة أو الميسرة أو القلب فليكفها ولان الجيش الكثير
المقاتل منهم بعضهم وهؤلاء كلهم مقاتلون، ومن ذلك قول بعض الصحابة يوم حنين
وكانوا اثني عشر الفا، لن نغلب اليوم من قلة وانما غلبوا عن اعجاب منهم. (بذل المجهود: ۱۹۷)

امام طحاویؒ جنگی قانون کے تحت حضرت امام مالکؒ کے مذہب کو نقل کیا ہے، جو دراصل اس
باب کی پہلی حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کے موافق ہے۔

وَقَدْرُويَ عَنْ مَالِكٍ فِي ذَلِكَ مَا يَدُلُّ عَلَى أَنَّ مَذْهَبَهُ كَانَ فِيهِ عَلَى مِثْلِ مَا فِي حَدِيثِ
ابْنِ عَبَّاسٍ..... فَقَالَ لَهُ مَالِكٌ: إِنْ كَانَ مَعَكَ اثْنَا عَشَرَ أَلْفًا مِثْلَكَ لَمْ يَسْعَكَ التَّخْلُفُ
عَنْ ذَلِكَ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ مَعَكَ هَذَا الْعَدَدُ مِنْ أَمْثَالِكَ فَأَنْتَ فِي سَعَةٍ مِنَ التَّخْلُفِ عَنْ
ذَلِكَ، (شرح مشکل الآثار: ۵۱/۲)

نیز امام طحاویؒ نے امام مالکؒ کے جواب کی تصویب اس طرح کی ہے:

وَكَانَ هَذَا الْجَوَابُ مِنْ مَالِكٍ أَحْسَنَ جَوَابٍ. (حوالہ سابق)

چنانچہ امام مالکؒ ”فرار عن الزحف“ کے بارے میں ایک شخص کے سوال کے جواب

میں ارشاد فرمایا ہے، اگر تمہاری تعداد بارہ ہزار ہوں، تو ”فرار عن الزحف“ کی گنجائش نہیں ہے، چاہے کفار کی تعداد جتنی بھی ہو، وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہ تعداد تینوں محاذ (مہمنہ، میسرہ، قلب) کے لئے کافی ہوتی ہے، ہاں اگر مسلمان کی تعداد بارہ ہزار سے کم ہے، تو اس وقت اصول جنگ کے مطابق لشکر کفار کے تناسب سے ”فرار عن الزحف“ کی گنجائش ہوگی۔

پھر یہاں دو شکلیں ہوگی:

(۱) ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مشرکین دو گنا یا اس سے کم ہیں، تو فرار عن الزحف درست نہیں۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ اگر دو گنا سے زیادہ ہیں، تو ”فرار عن الزحف“ کی گنجائش ہوگی، البتہ اس صورت میں عزیمت کا تقاضہ یہی ہے کہ میدان جہاد سے فرار اختیار نہ کرے۔

فقال له مالك ان كان معك اثنا عشر الفامثلك لم يسعك التخلف عن ذلك.

(شرح مشکل الآثار: ۲/۵۱)



باب :- ۸۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلا مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الْمَسَاجِدِ الَّتِي لَا تُشَدُّ الرَّحَالُ إِلَّا إِلَيْهَا،
وَمِنْ فَضْلِ الصَّلَاةِ فِيهَا عَلَى غَيْرِهَا مِنَ الْمَسَاجِدِ، وَفِي تَسَاوِيهَا فِي ذَلِكَ،
أَوْ فِي فَضْلِ بَعْضِهَا بَعْضًا فِيهِ

﴿مسجد حرام، مسجد نبوی، اور مسجد اقصیٰ کا عبادت کی غرض سے سفر کرنے کا بیان﴾

عَنْ جَابِرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "خَيْرُ مَا رُكِبَ إِلَيْهِ التَّرْوَاحِلُ
مَسْجِدُ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَمَسْجِدُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" وَلَمْ يَذْكُرْ فِي حَدِيثِهِ
غَيْرَ هَذَا. (شرح مشکل الآثار: ۵۲/۲، ورواه أحمد ۶۳۳/۳، والبخاري: ۱۰۷۵)، وابن حبان: (۱۶۱۶)

وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُولُ: "لَا تُشَدُّ الرَّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ
مَسَاجِدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى، وَمَسْجِدِي هَذَا".

خلاصہ الحدیث:

یہ صحیح ہے کہ پوری روئے زمین اس امت کے لئے مسجد کے قائم مقام ہے، کسی بھی جگہ پر
نماز ادا کی جائے، تو نماز ادا ہو جائے گی، مگر کثرت ثواب اور اولیت کی بنا پر مساجد کو اس پر ترجیح
حاصل ہے، پھر تمام مساجد پر مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کو ترجیح حاصل ہے، اسی وجہ سے
تین مساجد میں ہی نماز پڑھنے کے لئے سفر کرنا جائز قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ اس باب کی روایات
میں مذکور ہے، چنانچہ حضرت ابوسعید کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "تین

مساجد (مسجد حرام، مسجد اقصیٰ، مسجد نبوی) کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف صرف عبادت اور حصول کثرت ثواب کی غرض سے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔“

اس حدیث کی بنا پر امام طحاویؒ کا بھی یہی نظریہ ہے کہ عبادت کی غرض سے صرف مذکورہ تین مساجد کی طرف سفر کرنا درست ہے۔ (شرح مشکل الآثار: ۲: ۶۰)

حافظ ابن حجرؒ نے یہ تین مساجد کی افضلیت کے سلسلہ میں تین وجوہ ذکر کئے ہیں:-

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ مساجد انبیاء ہیں، چنانچہ مسجد حرام جو پہلی مسجد ہے، پوری دنیا کے مسلمانوں کا قبلہ ہے، اور حج کا مقام بھی۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ امم سابقہ کا قبلہ تھا۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ تینوں مساجد کی بناء اور تعمیر تقویٰ پر ہے۔

وفی هذا الحديث فضيلة هذه المساجد ومزيتها على غيرها لكونها مساجد الانبياء، ولان الأول قبلة الناس واليه حجهم، والثاني كان قبلة الامم السالفة، والثالث اسس على التقوى۔ (فتح الباری: حدیث نمبر: ۱۱۸۹، ج: ۳، ص: ۳۸۵)

چونکہ امام طحاویؒ نے مذکورہ تینوں مساجد (مسجد حرام، مسجد اقصیٰ، اور مسجد نبوی) کے تعلق سے احادیث جمع کر کے کئی باتوں کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہیں، ان میں پہلی بات دنیا کی تمام مساجد میں سے صرف تین مساجد کا سفر کرنا عبادت کی غرض سے جائز ہے، یہ مسئلہ پہلی فصل کی حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ابوسعید الخدریؓ کی حدیث سے ثابت ہے، اور اس پہلو سے اوپر بحث آچکی ہے۔

(۲) جہاں تک یہ مسئلہ مساجد ثلاثہ کی فضیلت دوسری مساجد پر کیا ہے؟ اس پہلو سے مسجد حرام

کو تمام مساجد حتی کہ مسجد اقصیٰ، اور مسجد نبوی پر بھی فوقیت حاصل ہے، یعنی مسجد حرام میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب ایک لاکھ نماز ادا کرنے کے مساوی ہے۔

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ، عَنِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: "فَضَّلَ الصَّلَاةَ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ عَلَى غَيْرِهِ مِائَةَ أَلْفِ صَلَاةٍ، وَفِي مَسْجِدِي أَلْفَ صَلَاةٍ، وَمَسْجِدِ بَيْتِ الْمُقَدَّسِ خَمْسَ مِائَةِ صَلَاةٍ" فَفِي هَذَا أَنَّ الصَّلَاةَ فِي مَسْجِدِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَصَلَاتَيْنِ يَعْني فِي بَيْتِ الْمُقَدَّسِ. (شرح مشکل الآثار: ۲۹/۲)

اسی طرح مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب پانچ سو نماز کے مساوی ہے، اور مسجد نبوی میں ایک ہزار نماز ادا کرنے کے برابر ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا حضرت ابو الدرداءؓ کی حدیث سے یہ بات واضح ہے۔

فَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّ أَفْضَلَهَا فِي الصَّلَاةِ فِيهَا الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ وَأَنَّ الصَّلَاةَ فِيهِ كَمِائَةِ أَلْفِ صَلَاةٍ فِي مَا سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاجِدِ اللَّاتِي سِوَى هَذِهِ الْمَسَاجِدِ الثَّلَاثَةِ الْمَذْكُورَةِ فِي هَذِهِ الْأَثَارِ. (شرح مشکل الآثار: ۲۷/۲)

تعارض:

حضرت ابو درداءؓ، (میمونہ) کی حدیث اس بات پر دال ہے کہ مسجد نبوی میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب ایک ہزار نماز کے برابر ملتا ہے، مگر ابو ذرؓ کی روایت اس کے خلاف ہے کہ مسجد اقصیٰ کے مقابلہ میں چار گنا زیادہ ہے۔ جبکہ حدیث میمونہ میں ہے کہ مسجد نبوی میں ایک نماز کا ثواب ایک ہزار نماز کے مساوی ہے، اس عبارت سے احادیث میں تعارض ہے، امام طحاویؒ کا یہ جملہ ”فَكَانَ الَّذِي فِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ فَضْلَ الصَّلَاةِ فِي مَسْجِدِ بَيْتِ الْمُقَدَّسِ كَفَضْلِهَا فِي مَسْجِدِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ“ (شرح مشکل الآثار: ۷۰/۲) بھی اس تعارض کی طرف مشیر ہے۔

عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ: الصَّلَاةُ فِي مَسْجِدِكَ أَفْضَلُ أَمْ الصَّلَاةُ فِي بَيْتِ الْمُقَدِّسِ؟ قَالَ: الصَّلَاةُ فِي مَسْجِدِي مِثْلُ أَرْبَعِ صَلَوَاتٍ فِي مَسْجِدِ بَيْتِ الْمُقَدِّسِ وَلِنَعْمِ الْمُصَلَّى هُوَ أَرْضُ الْمَحْشَرِ، وَأَرْضُ الْمَنْشَرِ. (شرح مشکل الآثار: ۶۷۲)

عَنْ مِيمُونَةَ مَوْلَاةِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهَا سَأَلَتْهُ فَقَالَتْ: أَفْتِنَا فِي بَيْتِ الْمُقَدِّسِ فَقَالَ: "أَرْضُ الْمَحْشَرِ، وَالْمَنْشَرِ، وَالثَّوَّةُ فَصَلُّوا فِيهِ، فَإِنَّ صَلَاةً فِيهِ كَأَلْفِ صَلَاةٍ فِي غَيْرِهِ" قَالَتْ: أَرَأَيْتَ إِنْ لَمْ أَسْتَطِعْ أَنْ أَتَحَمَّلَ عَلَيْهِ؟ قَالَ "فَلْتَهْدِي لَهُ زَيْتًا يُسْرَجُ فِيهِ، فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ فَهُوَ كَمَنْ أَتَاهُ". (شرح مشکل الآثار: ۷۰۲-۶۹)

جمع و تطبیق:

مذکورہ بالا روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دراصل مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی فضیلت کے سلسلہ میں متعدد احکام اور فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کبھی ایک نماز کا ثواب عام مساجد کی نماز کے برابر قرار دیا ہے، کبھی پانچ سو نماز کے برابر، تو کبھی ایک ہزار (مسجد نبوی) کے برابر قرار دیا ہے۔

اس سلسلہ میں امام طحاوی رقمطراز ہیں کہ:

اصلاً مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کے ثواب و فضیلت میں مدارج ہیں، اور یہ اضافہ رحمت الہی کا مظہر ہے، اسی بنا پر اسے کبھی عام مساجد کے مقام پر رکھا ہے تو کبھی ایک نماز کا ثواب پانچ سو نماز کے مساوی قرار دیا تو کبھی ایک ہزار نماز کے برابر (یعنی مسجد نبوی میں ایک نماز پڑھنے کے مساوی قرار دیا ہے) گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پایہ مہربانی و ہمدردی کے تحت مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کے ثواب میں اضافہ کیا ہے۔

وَ كَانَ مَدَّ هُبْنًا فِي النَّسْخِ فِي مِثْلِ هَذَا أَنَّهُ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى رَحْمَةً لِعِبَادِهِ وَ زِيَادَةً مِنْهُ إِيَّاهُمْ فِي فَضْلِهِ عِنْدَهُمْ، وَ فِي رَحْمَتِهِ لَهُمْ، فَ وَجَبَ بِذَلِكَ أَنْ يَكُونَ أَوَّلَ الْأَحْكَامِ كَانَتْ فِي ذَلِكَ عَلَى مَا فِي الْآثَارِ الْمَرْوِيَّةِ فِي فَضْلِ الصَّلَاةِ فِي مَسْجِدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى مَا سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاجِدِ سِوَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَأَنَّهُ كَالصَّلَاةِ فِي مَسْجِدٍ مِنَ الْمَسَاجِدِ سِوَى الثَّلَاثَةِ الْمَسَاجِدِ الْمَدْكُورَةِ فِي الْآثَارِ الْأَوَّلِ مِنْ هَذَا الْبَابِ، ثُمَّ زَادَ اللَّهُ تَعَالَى مِنْ أَنَّهُ فَضَّلَى فِيهِ مَا رَوَاهُ أَبُو ذَرٍّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيهِ، ثُمَّ زَادَهُ اللَّهُ تَعَالَى فِي ذَلِكَ أَنْ جَعَلَهُ كَخَمْسِ مِائَةِ صَلَاةٍ فِي مَا سِوَى هَذِهِ الثَّلَاثَةِ الْمَسَاجِدِ، وَ جَعَلَهُ فِيهَا كَأَلْفِ صَلَاةٍ فِي مَا سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاجِدِ غَيْرِ هَذِهِ الثَّلَاثَةِ الْمَسَاجِدِ، وَ جَعَلَهَا كَالصَّلَاةِ فِي مَسْجِدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِهِ فِي ذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۷۱/۲)

اقوال المحدثین:

لیکن مسجد اقصیٰ میں نماز کی فضیلت کے سلسلہ میں تینوں روایات میں سے پانچسو والی روایت کو امام ابن تیمیہؒ نے راجح اور اصوب قرار دیا ہے، جیسا کہ صاحب الموسوعۃ الفقہیہ نے تحریر کیا ہے:

ومن خصائص المسجد الاقصى، وفضله مضاعفة الصلاة فيه، وقد اختلفت الاحاديث في مقدارها، قال الجراعي: ورد أن الصلاة فيه بخمس مائة، وقال الشيخ تقي الدين ابن تيمية انه الصواب. (الموسوعة الفقہیہ الكويتية: ج ۳/۷، ص: ۲۳۳-۲۳۲)



باب :- ۸۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلي مَا رَوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الصَّلَاةِ الَّتِي لَهَا هَذَا الْفَضْلُ الَّذِي

ذَكَرْنَاهُ فِي الْبَابِ الْأَوَّلِ هَلْ هِيَ مِنَ الْفَرَائِضِ أَوْ مِنَ النَّوَافِلِ؟

﴿مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ میں نماز کی فضیلت کا بیان﴾

عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ أَنَّ النَّبِيَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ احْتَجَرَ حُجْرَةً فِي الْمَسْجِدِ مِنْ حَصِيرٍ، فَصَلَّى فِيهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلِي حَتَّى اجْتَمَعَ إِلَيْهِ نَاسٌ، ثُمَّ فَقَدُوا صَوْتَهُ فَظَنُّوا أَنَّهُ قَدْ نَامَ فَجَعَلَ بَعْضُهُمْ يَتَنَحَّنَجُ، لِيَخْرُجَ إِلَيْهِمْ، فَقَالَ: "مَا زَالَ بِكُمْ الَّذِي رَأَيْتُمْ مِنْ صَنِيعِكُمْ حَتَّى خَشِيتُمْ أَنْ يُكْتَبَ عَلَيْكُمْ قِيَامُ اللَّيْلِ فَصَلُّوا أَيُّهَا النَّاسُ فِي بُيُوتِكُمْ، فَإِنَّ أَفْضَلَ صَلَاةِ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ" . (شرح مشكل الآثار: ۷۲/۷، ورواه البخاري: (۷۲۹۰) ،

والنسائي: ۱۹۸/۳، وأحمد: ۱۸۲/۵)

خلاصہ الحدیث:

اس سے قبل باب: ۸۵ میں مساجد ثلاثہ میں نماز پڑھنے کی فضیلت کا تذکرہ آیا ہے، اس بنا پر اس باب میں امام طحاوی نے ان احادیث کو جمع کیا ہے، جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مساجد ثلاثہ (مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی) میں فضیلت کا تعلق فرض نماز سے یا نفل سے؟

اس سلسلہ میں امام طحاوی نے حضرت زید بن ثابتؓ کی حدیث کو تین طرق سے جمع کیا

ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ مسجد نبوی کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کمرہ بنائے ہوئے تھے، وہاں صلاۃ اللیل ادا کرتے تھے، ایک دن چند صحابہ کرام آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے، اور صلاۃ اللیل میں شریک ہو گئے، لیکن جب دوسری رات صحابہ مسجد میں حاضر ہوئے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں تھے، یہ خیال کر کے آواز دی کہ آپ سو گئے ہیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوئے نہیں تھے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کی آمد کی اطلاع بھی تھی؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس اندیشہ سے حجرہ سے مسجد میں تشریف نہیں لائے کہ کہیں یہ نماز امت پر فرض نہ ہو جائے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تاکید فرمایا کہ نفل نماز گھر میں ادا کرو، اور یہ بھی کہا کہ فرض نماز کے علاوہ نوافل گھر میں ادا کرنا افضل ہے۔

الغرض اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مساجد ثلاثہ کی فضیلت کا تعلق فرائض کے ساتھ ہے، نہ کہ نوافل کے ساتھ۔

تعارض:

لیکن اس سے پہلے باب ۸۵ کی اکثر روایات مساجد ثلاثہ میں نماز پڑھنے کی فضیلت پر علی الاطلاق دال ہیں، یہاں طوالت سے بچتے ہوئے حضرت جابرؓ کی حدیث نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هَذَا أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِي مَآ سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ، وَصَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَفْضَلُ مِنْ مِائَةِ صَلَاةٍ فِي مَآ سِوَاهُ" قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ كَأَنَّهُ يُعْنِي مَسْجِدَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ. (شرح مشکل الآثار: ج: ۲،

ص: ۶۲)

اس اعتبار سے حضرت زید بن ثابت اور حضرت جابر کی حدیث میں تعارض واقع ہے۔

جمع و تطبیق:

امام طحاویؒ نے زید بن ثابتؓ کی حدیث تحریر کرنے کے بعد پوری تاکید کے ساتھ اس پر زور دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوافل کو گھروں میں ادا کرنا افضل قرار دیا ہے، اور اس سے فرائض کو مستثنیٰ کیا ہے، اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ مساجد ثلاثہ کی فضیلت فرائض کے ساتھ ہے نہ کہ نوافل کے ساتھ۔

وَكَانَ فِي حَدِيثِ زَيْدٍ هَذَا تَفْضِيلُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلَوَاتِ التَّوَافِلِ فِي الْبُيُوتِ عَلَيْهَا فِي الْمَسَاجِدِ، وَكَانَ الْخِطَابُ بِذَلِكَ مِنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ الَّذِي خَاطَبَهُمْ بِهِ عَلَى أَنَّ صَلَوَاتِهِمْ فِي مَنَازِلِهِمْ أَفْضَلُ مِنْ صَلَوَاتِهِمْ فِي مَسْجِدِهِ غَيْرِ الصَّلَوَاتِ الْمَكْتُوبَاتِ. (شرح مشکل الآثار: ۷۴/۲)

اقوال المحدثين:

صاحب بنیہ نے فرائض پر محمول کیا ہے، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

فإن قلت: يعارض هذا قوله عليه السلام صلاة في مسجدی هذا أفضل من صلاة في ما سواه إلا المسجد الحرام۔

قلت: يحتمل هذا على أن صلاة مفروضة في مسجدی هذا أفضل۔ (بنیہ: ۵۷۲/۲)

نیز صاحب بذل، حدیث نمبر: ۱۰۴۴ کے تحت تحریر کرتے ہیں کہ نوافل گھروں میں ادا کرنا اولیٰ ہے؛ لیکن فرائض مردوں کے لئے مساجد میں ہی ادا کرنا واجب ہے، اس سے معلوم ہوا مساجد میں نماز کی فضیلت فرائض کے ساتھ خاص ہے۔

عن زید بن ثابت أن النبي ﷺ قال: صلاة المرأة في صلاة الرجل (في بيته أفضل

من صلاته في مسجدى هذا إلا المكتوبة) اي غير الصلوات المكتوبات. (أبو داود: ۱۰۴۳)

هذا الحديث يدل على أن صلاة الرجل في بيته غير المكتوبة افضل من صلاته في المسجد وإن كان المسجد فيه فضل كثير كمسجد رسول الله ومسجد القدس ومسجد الحرام لبعده من الرياء، واما المكتوبات فيجب على الرجال أن يصلوا ما في المساجد بالجماعة. (بذل المجهود: ۲۸۰/۳)

اسی طرح امام نوویؒ نے بھی نوافل گھروں میں ادا کرنے کی تحریض کی ہے، اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ فرائض مساجد کے ساتھ خاص ہیں؛ لہذا مساجد ثلاثہ (مسجد حرام، مسجد اقصیٰ، اور مسجد نبویؐ) کی نماز کی فضیلت فرائض کے ساتھ خاص ہے۔

قال النووي: وانما حث على النافلة في البيت، لكونه أخفى وأبعد من الرياء، وأصون من المحبطات، وليترك البيت بذلك وتنزل فيه الرحمة وينفر منه الشيطان. (موسوعة فتح المهمل: ۲۳/۵ ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند)

اگرچہ اصحاب مالکیہ میں سے مطرف اور احناف میں سے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا قول یہ ہے کہ یہ تفضیل فرائض کے ساتھ خاص نہیں ہے؛ بلکہ یہ حکم عام ہے یعنی فرائض و نوافل دونوں کے ساتھ ہے؛ لیکن امام طحاویؒ نے مسجد ثلاثہ کی تفضیل صرف فرائض کے ساتھ خاص کیا ہے، چنانچہ صاحب موسوعہ فتح المهمل رقمطراز ہیں:

واعلم أن مذهبنا أنه لا يختص هذا التفضيل بالصلاة في هذين المسجدين بالفريضة بل يعم الفرض والنفل جميعا وبه قال مطرف من اصحاب مالك، قال الطحاوي يختص بالفرض. (موسوعة فتح المهمل: ۵۳۵/۲، مكتبة الاشرفية، ديوبند)

فقہی مسئلہ کا استنباط:

یہاں ایک فقہی مسئلہ مترشح ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مساجد ثلاثہ میں نفل نماز پڑنے کی

نذر کرے اور وہ نماز اپنے گھر میں پڑھ لے، تو اس کی نذر کی ادائیگی ہوگی یا نہیں؟

تو اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے: طرفین کے نزدیک کافی ہو جائیگی؛ جبکہ علماء کی ایک بڑی تعداد اس کے مخالف ہیں، لیکن امام طحاویؒ کا نقطہ نظر بھی وہی ہے جو طرفین کا ہے یعنی گھر پر پڑھی گئی نماز سے اس کی نذر اداء ہونے کے لئے کافی ہے۔

وَفِي هَذَا الْحَدِيثِ مِنَ الْفِقْهِ مَا يَقْضِي بَيْنَ الْفُقَهَاءِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الرَّجُلِ يُوجِبُ
لِلَّهِ تَعَالَى عَلَى نَفْسِهِ أَنْ يُصَلِّيَ صَلَاةً يَتَطَوَّعُ بِهَا فِي وَاحِدٍ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، أَوْ مِنْ
مَسْجِدِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ، أَوْ مِنَ الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى فَيُصَلِّيَهَا فِي بَيْتِهِ أَنَّهُ تُجْزِئُهُ، أَوْ لَا تُجْزِئُهُ
فَمِمَّنْ قَالَ: إِنَّهَا مُجْزِئَةٌ أَبُو حَنِيفَةَ وَمُحَمَّدٌ وَقَدْ خَالَفَهُمَا فِي ذَلِكَ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ فَقَالُوا:
لَا تُجْزِئُهُ وَقَدْ رَوَى الْقَوْلَانِ جَمِيعًا عَنْ أَبِي يُوسُفَ، فَكَانَ الصَّحِيحُ فِي ذَلِكَ عِنْدَنَا وَاللَّهُ
أَعْلَمُ أَنَّهُ تُجْزِئُهُ؛ لِأَنَّهُ صَلَاةٌ فِي مَوْضِعٍ صَلَاتُهُ إِيَّاهَا فِيهِ أَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِهِ إِيَّاهَا فِي الْمَوْضِعِ
الَّذِي أَوْجَبَ عَلَى نَفْسِهِ أَنْ يُصَلِّيَهَا لِلَّهِ تَعَالَى فِيهِ، وَإِنَّمَا يَجِبُ مِنَ التُّدْوِيرِ وَالْإِيْجَابَاتِ مَا
يَكُونُ لِلَّهِ تَعَالَى قُرْبَةً، وَاللَّهُ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۷۴/۲)



باب :- ۸۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ:
”مَنْ كَسِرَ، أَوْ عَرَجَ فَقَدْ حَلَّ وَعَلَيْهِ حَجَّةٌ أُخْرَى“

﴿احصار اور حج کے فوت ہو جانے کا بیان﴾

عَنِ الْحَجَّاجِ بْنِ عَمْرٍو الْأَنْصَارِيِّ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُولُ: ”مَنْ عَرَجَ، أَوْ كَسِرَ فَقَدْ حَلَّ وَعَلَيْهِ حَجَّةٌ أُخْرَى“ (شرح مشکل الآثار: ۲/۵۷، ورواه أبو داود: (۱۸۶۲)، والترمذي: (۲۹۰)، والنسائي: ۱۹۸/۵، وابن ماجه: ۳۰۷۷)

خلاصہ الحدیث:

دین اسلام میں عبادت کی تین قسمیں ہیں: بدنی، مالی اور بدنی و مالی کا مجموعہ، بدنی کی مثال، نماز اور روزہ ہے، مالی کی مثال زکوٰۃ اور تیسری قسم کی مثال حج ہے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ عبادات میں حج کو جو حیثیت حاصل ہے، وہ دوسری عبادات کو نہیں، اسی بنا پر اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن حج ہے، جس کی ادائیگی کے لئے جہاں بیت اللہ تک آمد و رفت سفر خرچ کے لئے وافر رقم کی فراہمی ضروری ہے، تو وہیں مستطیع شخص کا صحت مند اور ارکان حج کی ادائیگی پر قادر ہونا بھی ضروری ہے، چنانچہ اگر کسی مسلمان نے میقات سے صحت کی حالت میں حج کی نیت سے احرام باندھا، پھر راستہ میں کوئی ایسا عارض پیش آگیا، جو سفر بیت اللہ کے لئے مانع ہے، مثلاً پیر ٹوٹ جانا، لنگڑا ہو جانا وغیرہ، تو ایسی صورت میں

احرام کھولنا جائز ہے، اسی طرح حلق کرانا بھی؛ لیکن عارض دور ہو جائے اور حج کے ایام باقی ہیں، تو اسی سال حج ادا کرنا ہوگا، ورنہ آئندہ سال قضاء کے طور پر حج ادا کرنا ضروری ہوگا، جیسا کہ اس باب کی پہلی روایت میں صراحت ہے۔

الغرض امام طحاوی نے اسی مضمون کی توجیہ کے لئے یہ باب قائم کیا ہے اور اس کے تحت کئی احادیث متعدد طرق سے پیش کی ہیں۔

اشکال:

حدیث الباب کے ظاہر الفاظ اس معنی پر دال ہیں کہ محرم اگر لنگڑا ہو جائے، یا اس کا پیر ٹوٹ جائے علی الاطلاق وہ محصر کے حکم میں ہے، چاہے وہ حج ادا کرنے سے عاجز ہو، یا وہ عاجز نہ ہو یعنی وہ اس کے بعد بھی حج ادا کرنے پر قادر ہو۔

جبکہ جمہور مفسرین اور محدثین کی رائے اس کے خلاف ہیں، یعنی اگر محرم لنگڑا ہو جانے کے بعد حج ادا کرنے پر قادر نہیں ہے، تو وہ محصر ہے؛ لیکن اگر ان عوارض کے پیش آنے کے بعد حج ادا کرنے پر قادر ہے، تو شرعاً وہ محصر نہیں، اور نہ اس پر محصر کا حکم دائر ہوگا؛ چنانچہ امام طحاوی نے بھی محصر کی یہی توجیہ کی ہے۔

لَا يَخْلُو مِنْ أَحَدٍ وَجْهَيْنِ أَنْ يَكُونَ مُحْصَرًا بِذَلِكَ، أَوْ غَيْرَ مُحْصَرٍ بِهِ، فَإِنْ كَانَ مُحْصَرًا بِهِ فَحُكْمُ الْمُحْصَرِ هُوَ كَمَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: ﴿فَإِنْ أَحْصَرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (البقرة: 196) إِلَى قَوْلِهِ ﴿أَوْ نُسْكَ﴾ (البقرة: 196)، وَإِنْ كَانَ بِذَلِكَ غَيْرَ مُحْصَرٍ بَقِيَ عَلَى حَرْمِهِ وَلَمْ يَحِلَّ مِنْ شَيْءٍ مِنْ ذَلِكَ، فَهَذَا الْحَدِيثُ أَهْلُ الْعِلْمِ جَمِيعًا عَلَى خِلَافِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۷۷/۲)

اسی طرح احصار کا معنی واضح کرتے ہوئے صاحب بذل علماء احناف کے قول کو لکھتے

ہیں:

فقلت: الحنفية: الاحصار يتحقق من كل ما يمنعه من المضى في موجب

الحرام۔ (البدل المجهود: ۲۶۱/۷)

جواب:

حدیث مذکور مفسرین و محدثین کی رائے کے خلاف نہیں ہے، اس لئے کہ احصار کے بارے میں صحابہ کرام کے دو گروہ ہیں: (۱) احصار ہر اس شئی سے ثابت ہوگا جو حج بیت اللہ کیلئے مانع بنے، جیسے مرض یا دشمن کی وجہ سے ہو وغیرہ، جس کے قائل ابن مسعودؓ اور ابن زبیرؓ اور ائمہ احناف ہیں۔

فَكَانَ جَوَابَنَا لَهُ فِي ذَلِكَ أَنَّ هَذَا الْحَدِيثَ لَيْسَ أَهْلُ الْعِلْمِ جَمِيعًا عَلَى خِلَافِهِ كَمَا ذَكَرَ، إِذْ كَانَ أَهْلُ الْعِلْمِ فِي الْإِحْصَارِ الَّذِي لَهُ مُحْكَمُ الْإِحْصَارِ الْمَذْكُورِ فِي كِتَابِ اللَّهِ تَعَالَى عَلَى مَذْهَبَيْنِ، وَأَحَدُهُمَا أَنَّ ذَلِكَ الْإِحْصَارَ هُوَ بِكُلِّ حَاطِسٍ يَحْبِسُ عَلَى التُّفُؤِ إِلَى الْبَيْتِ، وَمِمَّنْ كَانَ يَذْهَبُ إِلَى ذَلِكَ مِنْهُمْ ابْنُ مَسْعُودٍ، وَابْنُ عَبَّاسٍ، وَابْنُ الزُّبَيْرِ.

(شرح مشکل الآثار: ۷۷/۲)

مذکورہ صحابہ کرام اور احناف کے نقطہ نظر کی دلیل:

حدیث ابن مرزوق ص: ۷۷، حدیث محمد بن زکریا ص: ۷۸ اور حدیث محمد بن الحجاج

ص: ۷۸۔ (شرح مشکل الآثار: ۷۷/۲)

(۲) احصار کے بارے میں دوسرا مذہب یہ ہے کہ احصار صرف دشمن کے ساتھ خاص ہے جس کے قائل عبد اللہ بن عمروؓ ہیں، اور ابن عباسؓ کا دوسرا قول اس کے موافق ہے اور یہی نظریہ

شواہع، مالکیہ اور فقہائے حجاز کا ہے۔

والمذہب الآخر: ان ذلك الاحصار لا يكون الا بالعدو خاصة.

(شرح مشکل الآثار: ۷۹/۲)

روی عن ابن عباس وابن عمر "لا حصر الا لمن عدو". (بذل المجهود: ۲۱۶/۷)

ثُمَّ أَهْلُ الْعِلْمِ مِنْ بَعْدُ فَطَائِفَةٌ مِنْهُمْ عَلَى الْمَذْهَبِ الْأَوَّلِ مِنْهُمْ أَبُو حَنِيفَةَ، وَالثَّوْرِيُّ
وَسَائِرُ فُقَهَاءِ الْكُوفَةِ وَطَائِفَةٌ عَلَى الْمَذْهَبِ الثَّانِيِ مِنْهُمْ مَالِكٌ، وَالشَّافِعِيُّ وَسَائِرُ فُقَهَاءِ
الْحِجَازِ. (شرح مشکل الآثار: ۷۹/۲)

اشکال:

اگر کوئی یہ کہے کہ باب کی پہلی حدیث میں "فقد حل" کا معنی لغوی معنی کے اعتبار سے
حلال ہونا ہے نہ کہ شرعی معنی کے اعتبار سے؛ لیکن اس پر اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ جمیع اہل علم کا
نقطہ نظر اس کے خلاف ہے، یعنی لغوی معنی کے بجائے شرعی اعتبار سے یہاں حلال ہونا مراد ہے۔

جواب:

اس سلسلہ میں امام طحاوی رقمطراز ہیں کہ "فقد حل" کا لفظ بہت ہی فصیح و بلیغ عربی کلام
ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ محرم کا بالکل حرام سے حلال ہونا ہے یعنی کسی محرم کو سفر حج میں ایسی مانع
شیء پیش آجائے، جس کی وجہ سے حج ادا کرنے پر قادر نہ ہو، تو اس کے لئے قربانی اور حلق کرانے
کے بعد احرام کھول لینا جائز ہو جاتا ہے۔

أَنَّ ذَلِكَ الْكَلَامَ كَلَامٌ عَرَبِيٌّ صَحِيحٌ، وَإِنَّمَا الْمَعْنَى فِيهِ عِنْدَنَا وَاللَّهُ أَعْلَمُ أَيُّ فَقْدٍ حَلٌّ
لَهُ أَنْ يَحِلَّ بِمَا يَحِلُّ بِهِ مِمَّا هُوَ فِيهِ مِنَ الْإِحْرَامِ. (شرح مشکل الآثار: ۷۹/۲)

نظیرہ :-

اس کی مثال اور نظیر یہ ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی مدخول بہا عورت کو تین طلاق دیدی، اور اس کی عدت پوری ہوگئی، تو وہ عورت اپنے اس شوہر کیلئے حلال ہوگئی؛ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ عورت سابق شوہر کیلئے دوسری منکوحہ بیوی کی طرح حلال ہوگئی، بلکہ نکاح ثانی کے بعد حلال ہوگی، یعنی حلالہ شرعیہ کے بعد حلال ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ (سورہ بقرہ: ۲۳۰)

جس طرح مطلقہ ثلاثہ کا شوہر اول سے نکاح کیلئے حلالہ شرعی ضروری ہے، اسی طرح محرم پر احصار کی صورت میں احرام سے نکلنے کیلئے ایک عمل ضروری ہے، یعنی ہدی ذبح کرنا اور حلق کرانا وغیرہ۔

كَمَا يُقَالُ لِلْمَرْأَةِ إِذَا طَلِقَتْ بَعْدَ دُخُولِ مُطَلِّقِهَا بِهَا فَأَنْقَضَتْ عِدَّتُهَا قَدْ حَلَّتْ لِلزَّوْجِ لَيْسَ عَلَىٰ مَعْنَىٰ أَنَّهَا قَدْ حَلَّتْ لَهُمْ كَحَلِّ نِسَائِهِمُ اللَّاتِي فِي عُقُودِ نِكَاحِهِمْ لَهُمْ، وَلَكِنْ قَدْ حَلَّتْ لَهُمْ بِتَرْوِيجِ بِالْعَقْدِيَّةِ عَلَيْهَا حَتَّىٰ تَعُودَ بَعْدَهُ حَلَالًا لَهُمْ كَحَلِّ نِسَائِهِمُ اللَّاتِي فِي عُقُودِ نِكَاحِهِمْ لَهُمْ. (شرح مشکل الآثار: ۸۰/۲)

الغرض مذکورہ بالا توجیہ اور تمثیل سے یہ بات صاف ہوگئی کہ ”فقد حل“ کا معنی لغوی معنی کے اعتبار سے حلال ہونا نہیں ہے؛ بلکہ اس کا معنی شرعی اعتبار سے احصار کی صورت میں قربانی اور حلق کرنا اور حلال ہونا اور احرام سے نکل جانا ہے۔



باب :- ۸۸

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ نَهْيِهِ عَنِ كَسْبِ الْإِمَاءِ.

﴿حرام طریقے سے کسب معاش کا بیان﴾

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: "نَهَى النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنِ كَسْبِ الْإِمَاءِ". (شرح مشکل الآثار:

۸۱/۲، ورواه البخاری: (۲۲۸۳)، وأبو داود: (۳۵۲۵)، والبيهقي: (۱۲۶/۶)

خلاصہ الحدیث:

دنیا دارالاسباب ہے، اس لئے قضاء و قدر پر یقین و اعتماد رکھتے ہوئے اسباب کا اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں، اور معاشی ضروریات (روٹی، کپڑا اور مکان) کے حصول کے لئے اسباب و ذرائع اختیار کرنا درست ہی نہیں بلکہ بقدر کفاف ضروری ہے، قرآن کریم کی کئی آیات میں ترغیب و تحریض ہے، اور جہاں آیات میں فضل کا لفظ آیا ہے، اس سے نعمت اور مال دنیا ہی مراد ہے۔ ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ (جمعہ: ۱۰) اور جب نماز پوری ہو چکے تو تم زمین پر چلو پھر خدا کی روزی کی تلاش کرو۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث میں کسب معاش کے لئے حلال ذرائع اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور حرام ذرائع سے منع ہی نہیں کیا ہے؛ بلکہ ایسے ذرائع سے حاصل شدہ مال سے بھی احتراز کا حکم دیا ہے جن میں کم از کم مال مشکوک ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾

(سورۃ بقرہ: ۱۷۲) اے مؤمنوں! تم صرف وہی پاک و حلال رزق کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کئے ہیں۔

نیز رسول اللہ ﷺ نے حلال مال حاصل کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور حلال رزق کو اللہ کی طرف نسبت حاصل ہے۔

وعن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ”إن اللہ طیب لا یقبل إلا طیباً.

(مسلم شریف: کتاب الزکوٰۃ، رقم: ۱۰۱۵)

الغرض اسلام نے مال حرام پر حرام کا حکم لگانے کے ساتھ ساتھ ان ذرائع و اسباب کو اختیار کرنے سے منع اور حرام قرار دیا ہے، جو خود حرام ہوں، مثلاً باندی کا بدکاری کرنا اور زنا (بدکاری) کے ذریعہ مال حاصل کرنا دونوں حرام ہیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس باب کی پہلی حدیث میں مولیٰ کو اپنی باندی کی بدکاری کے ذریعہ کسب مال سے منع فرمایا ہے، چنانچہ قرآن پاک کی اس آیت میں بھی اس عمل سے روکا گیا ہے۔ ﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتِيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ﴾ (سورۃ نور: ۳۳) اور تم لوگ اپنی باندیوں کو زنا (بدکاری) پر مجبور مت کرو۔

چونکہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی باندیوں کے ذریعہ حرام کمائی کرایا کرتے تھے اور اس کو جائز سمجھتے تھے، نیز ان کے نزدیک یہ کوئی عار کی بات نہیں تھی، بلکہ وہ زنا کے ذریعہ نسب بھی ثابت مانتے تھے، جیسا کہ ابو داؤد شریف کی حدیث ہے: ”قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا مساعاة فی الاسلام من ساعی فی الجاہلیة فقد لحق بعصبته، ومن ادعی ولدًا من غیر رشدة فلا یرث ولا یرث الخ۔“ (ابو داؤد: رقم الحدیث: ۲۲۶۴)

پھر اسلام آ کر زنا، دواعی زنا اور زنا کی کمائی ان سب چیزوں کو حرام کر دیا جیسا کہ حدیث الباب میں باندیوں کو زنا کروانے کے ذریعہ مال کمانے سے آپ علیہ السلام نے منع فرمایا۔

تعارض:

لیکن حدیث الباب کا ظاہری معنی کتاب اللہ سورہ نور، آیت نمبر (۳۳) ﴿وَالَّذِينَ يَبْتِغُونَ الْكِتَابَ بِمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُواهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا﴾ اور واقعہ مکاتب بریرہ کے خلاف ہے۔

وجہ یہ ہے کہ مولیٰ اپنی باندی یا غلام کو بدل کتابت کے عوض مکاتب بناتا ہے، جو بالاتفاق درست ہے، حالانکہ یہ بھی ایک اعتبار سے کسب مال ہی کا نتیجہ ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت بریرہؓ کو بدل کتابت کے عوض مکاتب بنایا، لہذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ ”کسب الاماء“ حلال ہے، جبکہ حدیث الباب سے معلوم ہوتا ہے کہ کسب الاماء حرام ہے۔

دفع تعارض:

تعارض کے لئے محدثین کے یہاں اتحاد موضوع کا ہونا نہایت ضروری ہے، لیکن یہ بات یہاں پر مفقود ہے، حدیث الباب کا تعلق ناجائز اور حرام ذرائع اور ناجائز طریقوں سے ہے، جبکہ آیت نور اور واقعہ بریرہ کسب مال کے حلال اور جائز طریقوں سے ہے، اسی لئے قرآن مجید کی اس آیت ﴿إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا﴾ میں خیر سے علماء نے شرعی حدود میں رہ کر مال حاصل کرنا مراد لیا ہے جو مباح ہے، جیسا کہ صاحب بنایہ نے لکھا ہے:-

المعارض يقتضى اتحاد المحل مع اتحاد حالته واختلاف حالته ينفى التعارض،

وان كان اصلها واحدا. (البنایہ شرح ہدایہ: کتاب الطہارۃ: ۱/۵۱۴)

اسی طرح امام طحاویؒ نے لکھا ہے:

وَذَلِكَ أَنَّ اللَّهَ تَعَالَى إِنَّمَا أَبَاحَ مَكَاتِبَهُ مَنْ عِلِمَ مَكَاتِبُهُ فِيهِ خَيْرًا بِقَوْلِهِ: ﴿إِنْ عَلِمْتُمْ

فِيهِمْ خَيْرًا ﴿النور: 33﴾ فَقَالَ قَوْمٌ: الْخَيْرُ هُوَ كَسْبُ الْمَالِ، وَقَالَ قَوْمٌ: هُوَ الصَّلَاحُ وَكُلُّ وَاحِدٍ مِنَ التَّوَابِلَيْنِ يُصَدِّقُ الْآخَرَ، فَدَلَّ ذَلِكَ أَنَّهُ إِنَّمَا أَبَاحَ مَكَاتِبَهُ مَنْ يُحَمِّدُ كَسْبَهُ لَا مَنْ يُذَمُّ كَسْبَهُ، وَالَّذِي نَهَى عَنْهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْحَدِيثِ الَّذِي رَوَيْنَا قَدْ عَقَلْنَا بِنَهْيِهِ إِيَّانَا عَنْهُ أَنَّهُ مِنَ الْأَشْيَاءِ الْمُنْكَرَاتِ. (شرح مشكل الآثار: ۸۲/۲)

اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ کسب مال کے دو طریقے ہیں: ایک محمود اور دوسرا مذموم، تو حدیث الباب کا تعلق کسب مذموم سے ہے، اس لئے کسب الاماء حرام اور ممنوع ہے، اور آیت نور اور مکاتب والی روایات کسب محمود سے ہے، اس لئے اس صورت میں کسب الاماء درست اور جائز ہے۔

اشکال:

حدیث الباب میں کسب الاماء کے تعلق سے جو ”نہی“ وارد ہے وہ عام ہے؛ لیکن اس سے کوئی خاص کسب مراد لینا کیسے درست ہوگا؟

جواب:

امام طحاوی نے اس اشکال کا جواب دینے کے لئے ایک اصول کو پیش کیا ہے کہ جب چیزوں کی کثرت ہوتی ہے اور اس کی تعداد میں وسعت بھی، تو گرچہ اس کی نسبت تمام اشیاء کی طرف ہوتی ہے؛ لیکن اس سے کوئی خاص چیز مراد لینا درست ہے، اس کے علاوہ امام طحاوی نے اس کی کئی نظیریں پیش کی ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ“ (سورہ: النعام: ۶۶) ظاہر ہے اس آیت میں تکذیب کی نسبت پوری قوم کی طرف ہے، لیکن یہاں پوری قوم مراد نہیں ہے؛ بلکہ اس قوم کے وہ افراد مراد ہیں، جنہوں نے آپ ﷺ کی تکذیب کیں۔

دوسری نظیر سورہ زخرف کی آیت ﴿وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ﴾ (الزخرف: ۴۴)

ہے اس آیت میں بھی پوری قوم مراد نہیں؛ بلکہ بعض مصدقین مراد ہیں۔

اسی طرح حدیث الباب میں ”نہی عن کسب الاماء“ سے اگرچہ بظاہر مطلق نہیں معلوم ہوتا ہے مگر اس سے مخصوص باندیوں کا کسب ضرور مراد ہے اور وہی کسب مذموم ہے نہ کہ محمود۔

وَمِثْلُ ذَلِكَ نَهْيُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنْ كَسْبِ الْإِمَاءِ، هُنَّ الْإِمَاءُ الْمَذْمُومَةُ أَكْثَرُ بَهْنٍ، لَا الْإِمَاءَ الْمَحْمُودَةَ أَكْثَرُ بَهْنٍ. (شرح مشکل الآثار: ۸۵/۲)



باب :- ۸۹

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي صُفُوفِ النَّاسِ وَرَأَاهُ لِلصَّلَاةِ، وَفِي قِيَامِهِ مِنْهُمْ مَقَامَ الْمُصَلِّي بِهِمْ، وَذَكَرَهُ بَعْدَ ذَلِكَ أَنَّهُ كَانَ جُنْبًا، وَإِشَارَتِهِ إِلَيْهِمْ: أَيُّ كَمَا أَنْتُمْ، حَتَّى أَتَاهُمْ قَدْ اغْتَسَلَ وَرَأَسُهُ يَقْطُرُ مَاءً، هَلْ كَانَ ذَلِكَ مِنْهُ بَعْدَ أَنْ كَانَ كَبْرًا لِلصَّلَاةِ أَوْ قَبْلَ تَكْبِيرِهِ كَانَ لَهَا؟

﴿ جنابت کی حالت میں سہو امانت کرنے کا بیان ﴾

عَنْ أَبِي بَكْرَةَ "أَنَّ النَّبِيَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ دَخَلَ فِي صَلَاةِ الصُّبْحِ فَأَوْمَأَ إِلَيْهِمْ: أَيُّ مَكَانِكُمْ، ثُمَّ جَاءَ وَرَأَسُهُ يَقْطُرُ مَاءً فَصَلَّى بِهِمْ". (شرح مشكل الآثار: ۸۷۲، رواه أبو داود: (۲۳۳۳)، وأحمد: ۴۱/۵، والبيهقي: ۳۹۷/۲)

خلاصہ الحدیث:

یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید الانبیاء اور خیر البشر تھے، اور اللہ تعالیٰ کے بعد اگر کسی کے لئے کوئی مقام و رفعت ہے، تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے (شایان شان ہے) ”بعد از خدا بزرگ تو ہی قصہ مختصر است“، لیکن اس میں کسی کے لئے شک کی گنجائش نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مافوق البشر نہیں تھے، اس لئے آپ پر سہو و نسیان کے اثرات ظاہر ہوئے، کبھی چار رکعات کے بجائے دو رکعات پر ہی سلام پھیر دیا، تو کبھی چار رکعات کے بجائے پانچ رکعات نماز پڑھا دی، جیسا کہ ابوداؤد شریف کی حدیث میں ہے:-

عن علمقة قال: عبد الله صلى بنار رسول الله ﷺ خمساً لما انفتل توشوش القوم بينهم فقال: ما شأنكم قالوا: يا رسول الله ﷺ هل زيد في الصلوة؟ قال: لا، قالوا: فإنك قد صليت خمساً، فانفتل فسجد سجدتين ثم سلم، ثم قال: انما انا بشر انسى كما تنشون - (أبو داود، كتاب الصلوة، ۱۴۶/۱، رقم الحديث: ۱۰۲۲)

اسی طرح کا واقعہ ایک مرتبہ پیش آیا کہ آپ ﷺ جنبی تھے، غسل کئے بغیر آذان کے بعد نماز پڑھانے کے لئے سہواً مصلیٰ پر کھڑے ہو گئے، تکبیر ہو چکی تھی، تکبیر تحریمہ کے ذریعہ نماز شروع کرنے والے تھے، اتنے میں آپ کو یاد آیا کہ آپ جنابت کی حالت میں ہیں، تو اسی وقت ہاتھ کے اشارہ سے صحابہ کرام کو اپنی جگہ پر کھڑے رہنے کے لئے فرمایا، اور آپ ﷺ گھر گئے، غسل کر کے فوراً واپس آئے (اس حال میں آپ کے سر مبارک سے پانی قطرہ کی شکل میں گر رہا تھا) اور آپ نے فجر کی نماز پڑھائی، جیسا کہ اس باب کی پہلی (حدیث ابو بکرہ) کی حدیث سے یہ بات ظاہر ہے، نیز اس کی تائید میں متعدد طرق سے اور دوسری روایات کو امام طحاوی نے پیش کیا ہے۔

تعارض:

حدیث الباب (یعنی حضرت ابو بکرہؓ اور حضرت انسؓ کی حدیث) اس بات پر دال ہے کہ آپ ﷺ کو نماز میں داخل ہونے کے بعد یاد آیا کہ میں جنبی ہوں، پھر غسل کے لئے حجرہ تشریف لے گئے، جبکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث اس کے خلاف ہے، یعنی نماز شروع کرنے سے پہلے آپ ﷺ کو جنبی ہونے کے بارے میں یاد آ گیا، پھر غسل کے لئے گھر گئے، اس کے بعد فجر کی نماز پڑھائی۔

حَدَّثَنَا أَبُو هُرَيْرَةَ قَالَ: أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ وَصَفَّ النَّاسُ ضُفُوفَهُمْ فَخَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى قَامَ مَقَامَهُ، ثُمَّ ذَكَرَ أَنَّهُ لَمْ يَغْتَسِلْ فَقَالَ: "مَكَانُكُمْ" فَانْصَرَفَ

إِلَى مَنْزِلِهِ فَاغْتَسَلَ، ثُمَّ خَرَجَ حَتَّى قَامَ مَقَامَهُ، وَرَأْسُهُ يَقْطُرُ مَاءً". (شرح مشکل الآثار: ۸۹/۲)

اس اعتبار سے باب کی حضرت ابوبکرہؓ و انسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں تعارض واقع ہے اور تمام اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ نماز میں داخل ہونے سے پہلے آپ ﷺ کو اس کے (جنبی ہونے) کے بارے میں یاد آ گیا، پھر غسل کے لئے تشریف لے گئے۔

قال الحافظ: زاد مسلم من طريق يونس عن الزهري "قبل أن يكبر فانصرف" ففيه دليل على انه انصرف قبل ان يدخل في الصلاة وهو معارض لما رواه ابو داود وابن حبان عن ابي بكره "إن النبي ﷺ دخل في صلاة الفجر فكبر ثم أوما إليهم". (بذل المجهود: ۲/۲۲۰)

جمع و تطبیق:

امام طحاویؒ نے اس تعارض کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اگرچہ پہلی فصل کی روایات سے ثابت ہے کہ آپ نماز میں داخل ہو گئے تھے؛ لیکن اس کے علاوہ زیادہ تر احادیث اس بات پر دال ہیں کہ آپ نماز میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

وَقَدْ رَوَى عَنْ سِوَاهُمَا مِنَ الصَّحَابَةِ أَنَّ الَّذِي كَانَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ أذِنَ هُوَ قِيَامُهُ قِيَامَ الْمُصَلِّي لَا دُخُولَ مِنْهُ فِي الصَّلَاةِ بِتَكْبِيرِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۸۸/۲)

اس کی تائید و توثیق حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے، جس میں صراحت ہے کہ آپ مصلیٰ پر کھڑے تھے، تکبیر تحریمہ سے قبل یاد آ گیا اور آپ ﷺ گھرواپس چلے گئے۔

عن ابي هريرة اقميت الصلاة فقمنا فعدلنا الصفوف قبل ان يخرج إلينا رسول

اللہ ﷺ، فاتی رسول اللہ ﷺ حتی إذا قام فی مصلاہ قبل ان یکبر ذکر فانصرف وقال: لنا "مکانکم" الخ۔ (مسلم شریف: رقم الحدیث: ۶۰۵)

جہاں تک کہ حضرت ابو ہریرہؓ اور انسؓ کی حدیث میں "دخل فی صلاة الصبح" کا تعلق ہے تو اس کی توجیہ اور جواب دو صورتوں میں دیا گیا ہے:

پہلی صورت یہ ہے کہ مذکورہ بالا مسئلہ میں جو اختلاف ہے وہ آپ ﷺ کی طرف سے نہیں ہے؛ بلکہ یہ اختلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آپ ﷺ کے فعل کی حکایت کرنے میں ہے۔

هَذَا وَإِنْ كَانَ اخْتِلَافًا فَإِنَّهُ لَيْسَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَإِنَّمَا هُوَ مِنْ حِكَايَاتِ أَصْحَابِهِ عَنْ أَعْمَالِهِ، وَالِاخْتِلَافُ مِنْ حِكَايَاتِهِمْ لَا مِنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۹۰)

(۲) امام طحاویؒ دوسرا جواب "ثم دخل فی الصلوة" کا یہ دیتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ نماز میں داخل ہونے کے قریب تھے، داخل نہیں ہوئے تھے، لہذا یہاں دخول کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے؛ بلکہ اقرب الی الدخول کی وجہ سے دخول کا معنی مراد لیا گیا ہے، اور یہ لغت میں درست ہے، کیونکہ شیؒ اپنے قریب کے حکم کو قبول کرتی ہے، اور اس طرح معنی مراد لینا عام ہے، چنانچہ قرآن کی درج ذیل آیت میں "فَبَلَّغْنَ أَجَلَهُنَّ" سے عدت ختم ہونا مراد نہیں ہے؛ بل کہ ختم ہونے کے قریب کا معنی مراد ہے۔

نظیر:-

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَّغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سِرِّ حُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ....﴾ (البقرة: ۲۳۱) (اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دیدی، پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائے، تو تم ان کو قاعدہ کے مطابق نکاح میں رہنے دو۔) (معارف القرآن: ۱/۵۱۵)

کیوں کہ اگر عدت ختم ہو جائے، تو رجعت کا مسئلہ باقی نہیں رہے گا، لہذا آیت کریمہ میں ”قَبَلَعْنَ أَجَلَهُنَّ“ کے ”فَأَمْسِكُوهُنَّ“ کا لفظ استعمال کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ عدت ختم نہیں ہوئی، اس لئے جس طرح اس آیت میں ظاہری معنی مراد نہیں ہے؛ بلکہ قریب کا معنی مراد ہے، اسی طرح حدیث ابی بکر میں ”ثم دخل فی صلاة الصبح“ کا معنی ہے۔

وَكَانَ ذَلِكَ دَلِيلًا أَنَّ مُرَادَهُ تَعَالَى فِي الْآيَةِ الْأُخْرَى بِذِكْرِهِ بُلُوغَ الْأَجَلِ أَنَّهُ قُرْبٌ
بُلُوغِ الْأَجَلِ لَا حَقِيقَةً بُلُوغِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۹۰)

تیسری نظیر میں امام طحاویؒ نے واقعہ ذبح کو پیش کیا ہے، اور قریب کا معنی لیتے ہوئے اس میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے کہ آیا اس سے حضرت اسماعیلؑ مراد ہیں یا حضرت اسحاق علیہ السلام؟ لیکن یہ بات اہل علم پر مخفی نہیں ہے کہ اصلاً ذبح سے حضرت اسماعیل علیہ السلام مراد ہیں، نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام۔

چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ نے اس کی صراحت کی ہے کہ قرآن کی اس آیت: ﴿فَبَشِّرْ نَاهِ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ﴾ (صفت: ۱۰۱) سے حضرت اسماعیلؑ مراد ہیں، کیونکہ یہ حضرت اسحاقؑ سے عمر میں بڑے تھے، اور حضرت ابراہیمؑ کو اولاً انہی کی ولادت کی بشارت دی گئی تھی۔

وهذا الغلام هو اسماعيل عليه السلام فإنه اول ولد بشر به إبراهيم عليهم السلام وهو اكبر من اسحاق باتفاق المسلمين واهل الكتاب. (بحوالہ حاشیہ: شرح مشکل الآثار: ۲/۹۱) (تفسری القرآن..... لابن کثیر: ۲۳/۷)

اقوال المحدثین:

حافظ ابن حجرؒ نے قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”کبر“ کو ”علیٰ اراد ان یکبر“ (یعنی تکبیر کے ارادہ سے مصلیٰ پر کھڑے تھے کہ اتنے میں آپ کو واقعہ جنابت یاد آ گیا) پر محمول کیا ہے، یا دونوں

احادیث کو دو واقعے پر محمول کیا ہے۔

ویکن الجمع بینہما یحمل قوله ”کبر“ علی أراد أن یکبر أو بأنها واقعتان، أبداه عیاض والقرطبی احتمالاً، وقال النووی: انه الأظهر وجزم به ابن حبان۔

(فتح الباری: ۲/۳۳۴، بذل المجہود: ۲/۲۲۰)

نیز صاحب درمنضود نے بھی دو جوابات نقل کیے ہیں:

(۱) یہ کہ روایات صحیحہ جو صحیحین وغیرہ میں ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ابھی تک نماز میں داخل نہیں ہوئے تھے؛ بلکہ صرف مصلیٰ پر پہنچے تھے کہ فوراً آپ ﷺ کو حالت جنابت یاد آ گیا، لہذا اب کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔

(۲) اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ آپ ﷺ نماز کے اندر داخل ہو چکے تھے، تو پھر ہم یہ تسلیم نہیں کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی نماز پر بناء کی؛ بلکہ آپ ﷺ نے نماز کا استیناف فرمایا۔ (در المنضود: ج: ۱، ص: ۳۶۱)

اور حفاظ ابن حجر کی توجیہ کی تائید ابو حاتم کے قول سے ہوتی ہے جس کو ابن حبان نے لکھا ہے:

قال ابو حاتم: هذان فعلان في موضعين متباينين، خرج رسول الله ﷺ مرة فکبر ثم ذکر انه جنب فانصرف فاغتسل، ثم جاء فاستأنف بهم الصلاة۔

(صحیح ابن حبان: ۴/۴، ط: دار الکتب العلیہ، بیروت)



باب :- ۹۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ: "لَا يَقْضِي الْحَاكِمُ بَيْنَ
اِثْنَيْنِ وَهُوَ غَضَبَانُ"

﴿ غصہ کی حالت میں قاضی کا فیصلہ کرنے کا بیان ﴾

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرَةَ قَالَ: كَتَبَ أَبِي إِلَى ابْنِهِ وَهُوَ بِسِجِسْتَانَ أَنْ لَا تَقْضِيَ
بَيْنَ اِثْنَيْنِ وَأَنْتَ غَضَبَانُ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَقُولُ: "لَا
يَحْكُمُ أَحَدٌ كُمْ بَيْنَ اِثْنَيْنِ وَهُوَ غَضَبَانُ".

(شرح مشکل الآثار: ۹۲/۲، ورواه البخاری: (۷۱۵۸)، ومسلم: (۱۷۱۷)، والترمذی: (۱۳۳۴))

خلاصہ الحدیث:

جس طرح منصب قضاء اسلام میں مہتمم بالشان اور غیر معمولی اہمیت کے حامل ہے، اسی طرح اسلامی معاشرہ میں قاضی (حاکم) کی حیثیت قابل قدر اور لائق احترام ہے، اس کے اختیارات بہت ہی وسیع ہیں، ایک طرف وہ حقوق انسانی کے محافظ، کمزوروں کے سہارا، اور مظلوموں کی ڈھال ہیں، تو دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے سوسائٹی کی صلاح و فلاح کا ضامن بھی ہیں، اسی لئے قاضی کا اپنے نفس کو آداب شرع کے مطابق ڈھالنے کے ساتھ آداب قضاء سے آراستہ ہونا نہایت ضروری ہے، بالخصوص فریقین کے مابین فیصلہ اور تصفیہ کے وقت قاضی کا سنجیدہ اور ہر فکر سے مطمئن ہونا ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قاضی کو غصہ کی حالت میں دو فریق کے درمیان فیصلہ کرنے سے منع فرمایا ہے، جیسا

کہ اس باب کی پہلی روایت میں مذکور ہے۔

تعارض:

حدیث الباب میں رسول اللہ ﷺ نے حاکم اور قاضی کو حالت غضب میں دو فریق کے مابین فیصلہ کرنے سے منع فرمایا ہے، جبکہ دوسری روایت اس کے خلاف ہے، جس میں یہ ذکر ہے کہ آپ ﷺ حضرت زبیرؓ اور ایک صحابی کے درمیان کسی معاملہ میں غصہ کی حالت میں فیصلہ کیا، اس اعتبار سے فعلی اور قولی حدیث میں تعارض واقع ہے۔ (حدیث حضرت زبیرؓ، رقم: ۶۳۲)

جمع و تطبیق:

دونوں احادیث کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے امام طحاویؒ رقمطراز ہیں کہ حضرت ابوبکرہؓ کی حدیث عام ہے اور اس کی ہدایت و تعلیم عام حکام و قضاة کے حق میں ہے؛ لیکن حضرت زبیرؓ والی حدیث خاص ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی میزات میں سے ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو غلطی اور لغزش سے محفوظ فرمایا تھا، اسی بنا پر آپ ﷺ کو بحالت غضب میں بھی اپنے نفس پر پورا اختیار تھا، اور آپ ﷺ کو راہ حق سے عدول کا بھی کوئی خوف نہیں تھا، اس لئے آپ ﷺ نے غصہ کی حالت میں بھی دو فریق کے مابین فیصلہ فرمایا، لیکن ان صفات سے عام حکام و قضاة متصف نہیں تھے، اس لئے ان کا حالت غضب میں فیصلہ کرنا درست نہیں۔

فَكَانَ جَوَابًا لَّهُ فِي ذَلِكَ أَنَّ الَّذِي رَوَيْنَاهُ عَنْ أَبِي بَكْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى غَيْرِهِ مِنَ الْحُكْمِ لِلْخَوْفِ عَلَيْهِمْ فِيمَا يَنْقُلُهُمْ إِلَيْهِ الْغَضَبُ مِنَ الْعَدْلِ فِي الْحُكْمِ إِلَى خِلَافِهِ، وَالَّذِي فِي حَدِيثِ الزُّبَيْرِ فَمُخَالَفٌ لِذَلِكَ؛ لِأَنَّهُ فِي رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي تَوَلَّى اللَّهُ تَعَالَى إِيَّاهُ، وَعِصْمَتِهِ لَهُ وَحِفْظِهِ عَلَيْهِ أُمُورُهُ بِخِلَافِ النَّاسِ فِي مِثْلِ ذَلِكَ، فَانْطَلَقَ ذَلِكَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،

فَاسْتَعْمَلَهُ وَلَمْ يَنْطَلِقْ ذَلِكَ لِغَيْرِهِ، فَهَئِذَا رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنْهُ كَمَا حَدَّثَهُ أَبُو بَكْرَةَ عَنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۹۶/۲)

اقوال المحدثین:

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ معصوم عن الخطاء تھے، اس لئے آپ ﷺ کو غصہ کی حالت میں فیصلہ کی اجازت تھی اور یہ امر آپ ہی کے ساتھ خاص ہے۔

وقد تقدم انه صلى الله وسلم قضى للزبير بشراج الحرة بعد أن اغضبه خصم الزبير لكن لا حجة فيه لرفع الكراهة عن غيره لعصمة النبي ﷺ فلا يقول: في الغضب الا كما يقول في الرضا الى قوله... ولا يكره في حقه ﷺ لانه لا يخاف عليه في الغضب ما يخاف على غيره... وقال ابن المنير: أدخل البخاري حديث ابى بكره الدال على المنع، ثم حديث ابى مسعود الدال على الجواز تنبيها منه على طريق الجمع، بأن يجعل الجواز خاصاً بالنبي عليه السلام بوجود العصمة في حقه والأمن من التعدي.

(فتح الباری: ۳۶/۱۵، تحت رقم الحديث: ۷۱۵۸)

علامہ ظفر احمد عثمانی ابوبکرہؓ اور زبیرؓ کی حدیث کے مابین وجہ فرق یہ تحریر کیا ہے کہ آپ ﷺ کے سامنے حالت رضا اور حالت غضب دونوں یکساں تھیں، اور آپ ﷺ باطل حکم سے معصوم تھے، اس لئے آپ کو حالت غضب میں فیصلہ کرنا جائز تھا، اور یہ آپ ﷺ ہی کے ساتھ خاص ہے۔

ولا يخفى انه لا يصح الحاق غيره ﷺ به في مثل ذلك، لأنه معصوم عن الحكم بالباطل في رضائه وغضبه، وأما غيره فلا عصمة تمنعه عن الخطأ في الحكم.

(اعلاء السنن: ۱۲۳/۱۵)



باب :- ۹۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ اللَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِمَّا كَانَ مِنْهُ فِي الْمُسْتَعِيدَةِ مِنْهُ
مِنْ نِسَائِهِ لَمَّا أُدْخِلَتْ عَلَيْهِ

﴿الفاظ کنایہ سے وقوع طلاق کا بیان﴾

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ ابْنَةَ الْجَوْنِ لَمَّا أُدْخِلَتْ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ:
أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْكَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَقَدْ عُذْتُ بِمَعَاذِ الْحَقِّيِّ بِأَهْلِكَ"
قَالَ الْأَوْزَاعِيُّ: نَرَى أَنَّ قَوْلَ الرَّجُلِ لِأَهْلِهِ: الْحَقِّيِّ بِأَهْلِكَ تَطْلِيقَةٌ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۹۷،
ورواه البخاری: (۵۲۵۳)، والنسائی: ۱۵۰۶، وابن ماجه: (۳۰۵۰))

خلاصہ الحدیث:

طلاق اسلام میں ایک ناپسندیدہ عمل ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی اجازت دی ہے ان میں کوئی شیء طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ نہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر ازدواجی زندگی میں ناخوشگوارمی اور تلخی اس درجہ میں پیدا ہو جائے کہ دونوں کا آپس میں نباہ دشوار ہو جائے، تو مرد عورت دونوں ہی کے لئے طلاق ایک ضرورت بن جاتی ہے، لہذا اس صورت میں کوئی مرد طلاق دیتا ہے تو شرعاً طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

چونکہ طلاق کا وقوع الفاظ کی بنیاد پر ہوتا ہے، اس لئے اس کی دو قسمیں ہیں، صریح اور کنایہ، صریح وہ الفاظ ہیں، جن کے ذریعہ بلا نیت طلاق کے طلاق واقع ہوتی ہے، البتہ کنایہ کے الفاظ کے ذریعہ طلاق دینے میں نیت طلاق یا حالت مذاکرہ ضروری ہے، چنانچہ الفاظ کنایہ

میں سے ایک لفظ ”الحقی باھلک“ بھی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک زوجہ کو یہی لفظ کہا، جس کی صورت حال حدیث الباب میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے حضرت بنت الجون آپ کے پاس آئیں، ان کے قریب ہوئے تو انہوں نے ”اعوذ باللہ منک“ کے ذریعہ اللہ کی پناہ طلب کی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”الْحَقِّي بِأَهْلِكَ“ کے ذریعہ انہیں گھر جانے کے لئے کہا، ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کی نیت سے یہ جملہ کہا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہوگئی۔

جیسا کہ امام طحاوی نے قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ”الحقی باھلک“ کو حالت مذاکرہ طلاق اور ارادہ طلاق پر محمول کیا ہے، اس لئے اس صورت میں ایک طلاق بائن واقع ہوگئی۔

فَفِيمَا رَوَيْنَا قَوْلَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْمُسْتَعِيدَةِ مِنْهُ، لَمَّا كَرِهَتْ مَكَانَهُ، وَطَلَبَتْ فِرَاقَهُ: ”الْحَقِّي بِأَهْلِكَ“ فَكَانَ ذَلِكَ مِمَّا قَدَّ وَقَعَ مَوْقِعَ الطَّلَاقِ؛ لِإِرَادَتِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ بِهِ الطَّلَاقُ. (شرح مشکل الآثار: ۹۹/۲)

لیکن اگر اس جملہ ”الحقی باھلک“ سے مطلق کی طلاق کی نیت نہیں ہے، تو اس کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، اس کی نظیر حضرت کعب بن مالک کا واقعہ ہے کہ انہوں نے غزوہ تبوک سے تعلق کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو ان سے تمام تر تعلقات رکھنے سے منع فرمایا، حتیٰ کہ حضرت کعب کو اپنی بیوی سے بھی علاحدہ رہنے کا حکم فرمایا، اس بنا پر حضرت کعب نے یہ کہا: ”أطلقها؟ قال: لا؛ ولكن اعتزلها“ پھر یہ جملہ ”الحقی باھلک“ اپنی بیوی کو بغیر نیت طلاق کہہا، اس لئے ان کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔ (شرح مشکل الآثار: ۹۹/۲)

اشکال:

اس باب میں حضرت ابواسید کی روایت تفصیل کے ساتھ ذکر کی گئی ہے جس میں یہ بات ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بنت الجون کے مابین جو تلخی اور ناخوشگوار واقعہ پیش آنے کے بعد

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسید کو یہ حکم دیا کہ تم بنت الجون کو متعہ کے طور پر کپڑا دیدو اور ”والحقہا بأهلها“ اس کو میکہ پہنچادو، یہاں اس واقعہ سے اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو اسید کو یہ ذمہ داری کس بنیاد پر دی؟ جبکہ دونوں غیر محرم ہیں، اور دونوں میں نسب اور رضاعت دونوں اعتبار سے کوئی رشتہ محرم بھی نہیں ہے؟

وَرَدَّهَا إِلَىٰ أَهْلِهَا مِنْ عِنْدِهِ مَعَ أَبِي أُسَيْدٍ، وَلَيْسَ مِنْ ذَوِي مَحَارِمِهَا مِنَ النَّسَبِ، وَلَا عِلْمًا بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا رِضَاعًا يَكُونُ بِهِ مِنْهَا كَذِي الرَّحِمِ الْمُحَرَّمَةِ مِنْهَا.

(شرح مشکل الآثار: ۲/۱۰۳-۱۰۲)

جواب:

اس اشکال کا جواب امام طحاوی نے اس طرح دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنت الجون سے نکاح کرنا ثابت ہے (جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں ذکر ہے) تو وہ امہات المؤمنین کے زمرے میں شامل ہو گئیں، اس اعتبار سے حضرت ابو اسید بنت الجون کے لئے محرم ہوئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب میں ذکر کیا ہے:

﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾ (الأحزاب: ۶)

نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اس کی عورتیں ان کی مائیں ہیں۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

کہ پیغمبر کی بیبیاں مسلمانوں کی روحانی مائیں ہیں، ماؤں سے بڑھ کر ان کی تعظیم فرض

ہے اور یہ حکم باعتبار ادب اور احترام کے ہے۔ (معارف القرآن: ۶/۲۲۶)

لَمَّا تَزَوَّجَهَا صَارَتْ بِدَلِكِ لِلْمُسْلِمِينَ أُمَّةً، وَصَارَتْ بِدَلِكِ عَلَيْهِمْ حَرَامًا، فَحَلَّ

لِأَبِي أُسَيْدٍ ذَلِكَ فِيهَا، إِذْ كَانَ قَدْ عَادَ بِمَا ذَكَرْنَا مُحَرَّمًا بِهَا. (شرح مشکل الآثار: ۲/۱۰۳)

مذکورہ بالا بحث اس بات پر دال ہے کہ حضرت بنت الجون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ تھیں، جو حضرت ابواسید کے حق میں روحانی ماں تھیں، اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر متعہ لے کر حضرت اسید کو بھیجا؛ لیکن یہاں ایک اشکال اور پیدا ہوتا ہے کہ آیا بنت الجون طلاق کے بعد ازواج مطہرات کے زمرہ میں ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہے، البتہ صاحب بحر المحیط رقمطراز ہیں: کہ نکاح کے بعد جن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہتری کی، وہ ازواج مطہرات میں شامل ہیں، چاہے رشتہ نکاح ختم کیوں نہ ہو گیا ہو۔ (احزاب: ۶)، (البحر المحیط: ۸/۲۵۴)

فکل من طلق رسول اللہ ﷺ ووتخلى عنها في حياته، فقد اختلف في ثبوت هذه الحرمة بينه وبينهن فقيل: هي لمن دخل بهادون من فارقه قبل الدخول۔

وقد هم عمر برجم امرأة فارقه رسول الله ﷺ فنكحت بعده، فقالت: لم وما ضرب علي رسول الله ﷺ حجابًا، ولا دعيت ام المؤمنين فكف عنها عمر۔ (احكام القرآن لابن العربي: ۳/۵۲۲، سورة احزاب، مكتبة دار الكتب العلمية بيروت)

سوال:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابواسید کو جہیز اور کسوہ کے ساتھ بنت الجون کو دینے کا حکم دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم متعہ کے طور پر تھا یا نہیں؟

جواب:

بعض اہل علم کی رائے یہی ہے کہ مطلقہ غیر مدخول بہا کے لئے متعہ ہے، اس لئے حضرت اسیدؓ کا مذکورہ چیزیں لے کر جانے کا حکم متعہ کے طور پر تھا، جیسا کہ حضرت علیؓ کی حدیث میں ہے۔

عن علي بن ابي طالب قال: لكل مطلقه متعة۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۱۰۳)

لیکن اکثر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ مطلقہ غیر مدخول بہا کے لئے (جس کا مہر متعین ہو)

متعہ مستحب نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت اسید کا مذکورہ چیزیں لے کر بنت الجون کے پاس جانا نصف مہر کی ادائیگی کی غرض سے تھا، نہ کہ متعہ دے کے لئے۔

وَإِنْ كَانَ أَكْثَرُ أَهْلِ الْعِلْمِ عَلَىٰ خِلَافِهِ فِي الْمُطَلَّغَةِ قَبْلَ الدُّخُولِ، وَقَدْ سُمِّيَ لَهَا صَدَاقٌ. (شرح مشکل الآثار: ۱۰۳/۲)

صاحب مصنف نے حضرت امام ابوحنیفہ کے واسطے سے ذکر کیا ہے کہ مطلقہ غیر مدخول بہا مسمیٰ لہا کے لئے نصف مہر واجب ہو گا نہ کہ متعہ۔

عن أبي حنيفة، عن حماد، عن ابراهيم في الذي يطلق امرأته ولم يدخل بها وقد فرض لها قال: ولها نصف الصداق ولا متعة لها، فإن طلقها قبل ان يفرض فلها المتعة ولا صداق لها. (مصنف عبدالرزاق: رقم: ۱۲۲۳۰)

الغرض امام طحاوی کی رائے مطلقہ غیر مدخول بہا مسمیٰ لہا کے سلسلہ میں اکثر اہل علم کی رائے سے مختلف ہے یعنی اس کو متعہ دینے کے قائل ہیں، جبکہ اکثر اہل علم کے نزدیک نصف مہر واجب ہے، (شرح مشکل الآثار: ۱۰۳/۲)

مُحْتَمِلٌ أَنْ يَكُونَ تَمْتِيعٌ مِنْهُ لَهَا، فَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ مَنْ قَدْ كَانَ يَرَىٰ لِلْمُطَلَّغَةِ قَبْلَ الدُّخُولِ بِهَا سُمِّيَ لَهَا صَدَاقٌ أَوْ لَمْ يُسَمَّ لَهَا صَدَاقٌ مُتَّعَةً يُؤْمَرُ بِهَا مُطَلَّقُهَا، أَوْ يُؤْخَذُ بِذَلِكَ لَهَا. (شرح مشکل الآثار: ۱۰۳/۲)



باب :- ۹۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الْمَرْأَةِ الَّتِي تَزَوَّجَهَا، فَلَمَّا
أَدْخَلَتْ عَلَيْهِ رَأَى بِكَشْحِهَا بَيَاضًا وَمَا كَانَ مِنْهُ فِي أَمْرِهَا بَعْدَ ذَلِكَ

﴿الفاظ کنایہ میں سے لفظ ”فَخَلَى سَبِيلَهَا“ کا حکم﴾

عن ابنِ عُمَرَ، يَقُولُ: ”تَزَوَّجَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ امْرَأَةً مِنْ غِفَارٍ فَرَأَى فِي
كَشْحِهَا بَيَاضًا فَخَلَى سَبِيلَهَا“ فَبِي هَذَا الْحَدِيثِ رِوَايَةٌ جَمِيلٌ بِنِ زَيْدِ إِيَّاهُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ،
وَقَدْ حُوِّلَ إِسْمَاعِيلُ عَنْهُ فِي ذَلِكَ فَرَوَاهُ عَنْ غَيْرِ ابْنِ عُمَرَ وَلَمْ نَعْلَمْ. (شرح مشکل الآثار:
۱۰۳/۲، ورواه البخاری فی ”التاریخ الکبیر“ تعلیقاً: ۲۲۳/۷، وابن عدی فی ”الکامل“: ۵۱۳/۲)

خلاصہ الحدیث:

یہ بات اہل علم پر مخفی نہیں ہے کہ جس طرح الفاظ صریح سے بغیر نیت کہ طلاق واقع ہوتی ہے، اسی طرح الفاظ کنایہ سے نیت طلاق یا مذکرہ طلاق کی صورت میں طلاق بائن واقع ہوتی ہے، اور الفاظ کنایہ کئی ہیں، انہیں سے ”ضَعِيَ عَلَيْكَ نِيَابُكَ، وَالْحَقِي بِأَهْلِكَ“ بھی ہے، لہذا اس طرح کے الفاظ میں سے کوئی لفظ شوہر اپنی بیوی کو طلاق کی نیت سے یا مذکرہ طلاق کی حالت میں کہے گا، تو ایسی صورت میں اس کی بیوی پر شرعاً ایک طلاق بائن واقع ہو جائیگی، جیسا کہ اس باب پہلی حضرت ابن عمرؓ کی روایت اور زید بن کعب بن عجرہؓ کی روایت میں یہ بات ذکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ غفار کی ایک عورت سے نکاح کیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قریب ازدواجی تعلقات کیلئے تشریف لے گئے، تو اس کے جسم پر برص کی بیماری کا اثر محسوس کیا، یا پہلو کی بیماری اور ذات الجنب یعنی نمونیہ کی علامات محسوس کرتے ہی اس سے علاحدہ ہو گئے اور یہ جملہ بھی

”أرخی علیک ثیابک“ اس عورت کے سامنے تکلم فرمایا۔

جبکہ کعب بن زید انصاریؓ کی روایت میں ”ضَعِيَ عَلَيكَ ثِيَابُكَ، وَالْحَقِي بِأَهْلِكَ“ اور زید بن کعب بن عجرہؓ کی روایت میں ”الْبَسِي ثِيَابَكَ وَالْحَقِي بِأَهْلِكَ“ کے الفاظ ہیں۔
الغرض ان الفاظ کو امام طحاویؒ نے مذکورہ زوجہ کے حق میں مستعیدہ عورت کی طرح (جس کا واقعہ اس سے پہلے باب میں گذر چکا ہے) ”الْحَقِي بِأَهْلِكَ“ کے درجہ میں قرار دیا ہے۔
اس لئے آپ ﷺ کی اس زوجہ پر شرعاً ایک طلاق بائن واقع ہوگئی، بشرطیکہ آپ ﷺ نے اس سے طلاق کی نیت کی تھی۔
امام طحاویؒ فرماتے ہیں:

فَفِي هَذَا الْبَابِ قَوْلُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْمَرْأَةِ الْمَذْكُورَةِ فِيهِ: ”الْحَقِي بِأَهْلِكَ“ فَالْكَلَامُ فِي ذَلِكَ كَالْكَلَامِ فِي قَوْلِهِ لِلْمَرْأَةِ الْمُسْتَعِيدَةِ مِنْهُ الْمَذْكُورَةِ قَبْلَ هَذَا الْبَابِ مِنْ هَذَا الْكِتَابِ: ”الْحَقِي بِأَهْلِكَ“. (شرح مشكل الآثار: ۱۰۷/۲)

اشکال:

حضرت زید بن کعبؓ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے اس عورت کو مہر عطا کیا، جبکہ حدیث ابن ابی حفصؓ میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس عورت کو (طلاق کے بعد) متعہ دیا، ”رَأَى مَا بَهَا وَكَانَ فِي كَسْحِهَا بَيَاضٌ وَكَرِهَهَا وَتَتَّعَهَا وَقَالَ: ”الْحَقِي بِأَهْلِكَ“.

(شرح مشكل الآثار: ۱۰۷/۲)

لیکن یہاں اشکال یہ ہے کہ متعہ تو مطلقہ غیر مدخول بہا مسمیٰ لہا کے لئے مستحب نہیں ہے تو پھر رسول اللہ ﷺ نے کس بنیاد پر دیا؟

فَقَالَ قَالَ: فَفِي حَدِيثِ ابْنِ أَبِي حَفْصٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَتَّعَهَا.

(شرح مشكل الآثار: ۱۰۸/۲)

جواب:

امام طحاویؒ نے مذکورہ بالا اشکال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ ﷺ کا متعہ دینا ہمارے مذہب کے خلاف نہیں، وجہ یہ ہے کہ مطلقہ مدخول بہا مسمیٰ لہا کے لئے مہر کے ساتھ متعہ بھی دینا مستحب ہے، خواہ وہ حقیقہ مدخول بہا ہو یا حکماً، چنانچہ آپ ﷺ نے اس عورت کے ساتھ خلوت کی اور اس کے جسم کو دیکھا اور آپ ﷺ کا دیکھنا خلوت صحیحہ کے قائم مقام ہے، اور جب خلوت صحیحہ ثابت ہے، تو وہ حکماً مدخول بہا کے قائم مقام ہوگئی، اور اسے متعہ دینا مستحب ہے، اس وجہ سے آپ ﷺ نے متعہ عطا کیا۔

وَقِيلَ لَهُ: لَيْسَ هَذَا عِنْدَنَا بِمُخَالَفٍ لِمَا فِي حَدِيثِ ابْنِ أَبِي حَفْصٍ هَذَا، لِأَنَّهُ قَدْ يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ جَعَلَهَا كَالْمَدْخُولِ بِهَا لِحَلْوَتِهِ، وَإِمْكَانِهَا إِتْيَاهُ نَفْسَهَا، وَلِأَنَّ تَرْكَهُ كَانَ لِمَسِيئَتِهَا بِاخْتِيَارِهِ ذَلِكَ لَا لِمَا سِوَاهُ، فَقَامَ ذَلِكَ مِنْهُ مَقَامَ الْمَمَاسَةِ مِنْهُ لَهَا، وَإِنْ كَانَ لَمْ يَمَسَّهَا فِي الْحَقِيقَةِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۰۸/۲)

اشکال:

اگر اس طرح کے واقعہ میں کوئی مرد طلاق دینے کے بعد یا طلاق سے پہلے بیوی کے قریب ہو نیکا انکار کرے، جبکہ بیوی کا دعویٰ شوہر کی طرف سے قریب ہونے کا ہو، تو ایسی صورت میں عورت کا قول ہی قبول فیصل ہوگا، یعنی عورت کا قول معتبر ہوگا، یہی حضرت زید بن ثابتؓ کا مذہب ہے؛ لیکن حضرت زید بن ثابتؓ کے اس قول پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ دعویٰ عام طور پر حجت اور دلیل کے بعد ہی قبول کیا جاتا ہے؛ لیکن یہاں عورت کی بات اور دعویٰ، بغیر دلیل و حجت کے قبول کیا گیا، جب کہ فقہاء کا قاعدہ ہے ”البینة علی المدعی والیمن علی من انکر“۔

(بدائع الصنائع: ۲۲۸/۶، ہدایہ: ۳۹۷/۳)

فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: إِنَّمَا ذَلِكَ كَانَ لِدَعْوَى الْمَرْأَةِ فِي ذَلِكَ مَعَ الْخُلُوةِ مَا ادَّعَتْ مِنْ قُرْبِ زَوْجِهَا إِيَّاهَا. (شرح مشکل الآثار: ۱۱۲/۲)

جواب:

گرچہ مذکورہ بالا طلاق کے واقعہ میں حقیقتہً ہم بستری نہیں پائی گئی؛ لیکن طلاق سے پہلے خلوت صحیحہ کا تحقق ضرور ہوا ہے، خلوت صحیحہ کے ثبوت کے قرائن ان روایات میں مذکور ہیں بالخصوص ”ارحاء ستر اغلاق الأبواب“ یہ وہ الفاظ ہیں جو خلوت صحیحہ کے ثبوت پر دال ہیں؛ لہذا اگر طلاق کے بعد شوہر قربت کا انکار کرے، اور بیوی اس کا اقرار کرے، جبکہ دونوں کے مابین ”ارحاء ستر اور اغلاق الأبواب“ کی صورت طلاق سے پہلے پائی گئی ہو، تو ایسی صورت میں عورت کا قول بغیر بیٹہ کے معتبر ہوگا، اور اسی کے حق میں فیصلہ ہوگا اور خلوت صحیحہ کی وجہ سے ہر مسمیٰ کی صورت میں اس کے شوہر پر پورا مہر واجب ہوگا۔

قِيلَ لَهُ: لَوْ كَانَ مَا ذَكَرْتَ كَمَا وَصَفْتَ لَمَا كَانَتْ دَعْوَاهَا مَقْبُولَةً، لِمَا يُوجِبُ لَهَا مَعْنَى لَمْ يَكُنْ وَاجِبًا قَبْلَ ذَلِكَ مَعَ نَفْسِي مَنْ يَدْعِيهِ عَلَيْهِ إِيَّاهُ عَنْ نَفْسِهِ إِلَّا بِحُجَّةٍ تُوجِبُ لَهَا ذَلِكَ عَلَيْهِ، وَلَمَّا لَمْ تَكُنْ مَسْئُولَةً عَنْ ذَلِكَ حُجَّةٌ كَانَ إِرْحَاءُ الشُّرُورِ، وَإِغْلَاقُ الْأَبْوَابِ وَإِمْكَانُهَا زَوْجَهَا مِنْ نَفْسِهَا بِحَيْثُ لَا مَانِعَ لَهُ مِنْهَا يُوجِبُ لَهَا الصَّدَاقَ عَلَيْهِ، وَيَكُونُ بِهِ فِي حُكْمِ الْمُمَاتِ لَهَا. (شرح مشکل الآثار: ۱۱۲/۲)

اشکال:

جس طرح مطلقہ مدخول بہا مسمیٰ لہا کے لئے شوہر پر پورا مہر واجب ہوتا، اسی طرح طلاق سے پہلے خلوت صحیحہ کی صورت میں بھی شوہر پر پورا مہر واجب ہوگا؛ البتہ متعدد دینا مستحب ہوگا اور یہ قول حضرت زید بن ثابت اور تمام صحابہ کا ہے اور یہ متفق علیہ ہے؛ مگر بعض لوگوں نے دعویٰ

(متفق علیہ) پر اشکال کیا ہے کہ یہ ثابت نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے، ”فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: بَلَىٰ قَدْ خَالَفَهُمْ فِي ذَلِكَ ابْنُ عَبَّاسٍ“۔ (حوالہ سابق)

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: ”إِذَا نَكَحَ الرَّجُلُ فُقُوضَ إِلَيْهِ ثُمَّ طَلَّقَ قَبْلَ أَنْ يَمَسَّ فَلَيْسَ لَهَا إِلَّا الْمَتَاعُ“۔ (شرح مشکل الآثار: ۱۱۳/۲)

یعنی حضرت ابن عباسؓ نے مذکورہ حدیث کے ذریعہ جمہور کے نظریے قطع نظر دو باتوں کا دعویٰ کیا ہے، ایک یہ کہ مطلقہ کا مہر متعین نہیں تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ ان کے یہاں خلوت صحیحہ وطی کے قائم مقام نہیں ہے، اس لئے وہ اس صورت میں صرف متعہ کے قائل ہیں۔

جواب:

امام طحاویؒ نے اس اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث جمہور کی رائے کے خلاف نہیں ہے؛ کیونکہ ان کی حدیث میں ”فوض الیہ“ کے لفظ سے یہ معنی نکلتا ہے کہ مطلق نے اس عورت سے قبل لمسی نکاح کیا تھا، اور اس کو طلاق قبل الدخول بھی دیدی، تو اس صورت میں ہمارے نزدیک بھی اس مطلقہ کو متعہ دینا واجب ہوتا ہے جبکہ حضرت زید بن کعب بن عجرہ کی حدیث میں مہر کی صراحت ہے۔

عَنْ زَيْدِ بْنِ كَعْبِ بْنِ عَجْرَةَ قَالَ: تَزَوَّجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ امْرَأَةً مِنْ بَنِي غِفَارٍ، فَلَمَّا أُدْخِلَتْ عَلَيْهِ رَأَىٰ بِكَشْحِهَا بَيَاضًا فَقَالَ: ”الْبَيْسِيُّ يُبَابِلُكَ، وَالْحَقِي بِأَهْلِكَ“۔ (شرح مشکل الآثار: ۱۰۷/۲)

رہی دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کے ظاہر الفاظ اس معنی پر دلالت ہیں کہ ان کے یہاں خلوت صحیحہ وطی کے قائم مقام نہیں ہے، تو اس سلسلہ میں اس باب کی تمام احادیث اس کے خلاف ہیں؛ کیونکہ اس باب کی ساری روایات میں ”ارخى الستر، اغلاق

الابواب“ جیسے الفاظ ہیں اور یہ خلوت صحیحہ کے معنی میں ہیں، جو وطی کے قائم مقام ہیں، اور تمام خلفائے راشدین کا بھی یہی نظریہ ہے۔

قَالَ عَلِيُّ: "إِذَا أُغْلِقَ الْبَابُ وَأُزْحِيَ السِّتْرُ فَقَدْ وَجَبَ الصَّدَاقُ". (شرح مشکل الآثار:

(۱۱۰/۲)

زُرَّارَةُ بْنُ أَوْفَى فِي مَسْجِدِ الْبَصْرَةِ يَقُولُ: "قَضَى الْخُلَفَاءُ الرَّاشِدُونَ الْمَهْدِيُّونَ أَنَّ

مَنْ أَغْلَقَ بَابًا أَوْ أَرْحَى سِتْرًا فَقَدْ وَجَبَ الْمَهْرُ، وَوَجِبَتِ الْعِدَّةُ". (شرح مشکل الآثار: ۱۱۱/۲)

الغرض مذکورہ بالا بحث و تحقیق سے یہ بات عیاں ہوئی کہ حضرت زید بن ثابتؓ اور تمام کا قول راجح ہے اور اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہے کہ مطلقہ بعد الخلوۃ اور بعد المسمیٰ لہا کو پورا مہر دینا واجب ہوگا تاہم متعددینا مستحب ہوگا۔

اشکال:

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی توجیہ و تاویل کے ذریعہ ہم نے مطلقہ مسمیٰ لہا بعد

الخلوۃ کے لئے پورا مہر واجب قرار دیا ہے، حالانکہ یہ توجیہ قرآن مجید کی اس آیت کے خلاف ہے:

﴿وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَرْصُفْ مَا

فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بَيْنَهُنَّ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ (بقرہ: ۲۳۷)

کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مطلقہ قبل الدخول بعد المسمیٰ لہا کے لئے نصف مہر قرار

دیا ہے۔

فَإِنْ قَالَ: فَإِنَّ ظَاهِرَ الْقُرْآنِ يُدُلُّ عَلَى مَا تَأَوَّلْنَا عَلَيْهِ مِمَّا رَوَى عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي هَذَا

الْحَدِيثِ، لِأَنَّ اللَّهَ قَالَ فِي كِتَابِهِ: ﴿وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ

لَهُنَّ فَرِيضَةٌ مِّمَّا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ﴿۲۳۷﴾
 (البقرة: 237)، وَكَانَ مَعْقُولًا بِذَلِكَ أَنْ مَنْ طَلَّقَ وَلَمْ يُمَاشِ أَنْ الَّذِي يَلْزُمُهُ بِهَذِهِ الْآيَةِ هُوَ نَصْفُ
 الصَّدَاقِ لَا كُفْلُهُ. (شرح مشکل الآثار: ۱۱۳/۲)

جواب:

اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ مذکورہ مطلقہ کے لئے کل مہر اور عدت کے وجوب کے
 قائل خلفائے راشدین اور اجلہ صحابہ ہیں، چنگی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے، اور یہی لوگ اس
 زبان کے زیادہ جاننے والے تھے، اسی لئے ائمہ مفسرین اور جمہور نے تفسیر قرآن کے لئے چھ
 ماخذ معتبرہ میں سے ایک ماخذ اقوال صحابہ کو قرار دیا ہے، ”والماخذ الثالث لتفسير القرآن
 الكريم هي اقوال الصحابة وهو ايضا من اهم ماخذ التفسير.“ (نفحات العبير: ۸)

ہاں جب بھی کسی صحابی پر قرآن کی کوئی آیت مشتبہ اور مشکل ہوئی، فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کے پاس رجوع کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اشکال کا ازالہ فرماتے؛ لہذا اگر اس آیت کی تفسیر
 میں صحابہ کی رائے مختلف ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اصلاح ضرور فرماتے، کہ اس آیت سے اللہ
 تعالیٰ کی مراد یہ ہے۔

دوسری بات بھی مسلم ہے اور لغوی اعتبار سے ثابت ہے کہ امکان مسییس، مسییس کے قائم
 مقام ہے، اس لئے بعد مسییس کی طرح امکان مسییس میں بھی پورا مہر واجب ہوتا ہے جیسا کہ
 امکان کی صورت میں حضرت ابراہیم کے دونوں لڑکوں (اسماعیل واسحاق) میں ایک لڑکے کو ذبیح
 قرار دیا ہے۔

كَمَا سَمِّيَ ابْنُ اِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ اِمَّا اِسْمَاعِيلُ، وَاِمَّا اِسْحَاقُ ذَبِيحًا، لَا لِاِنَّهُ
 ذَبِيحٌ وَلَكِنْ لَمَّا امْكَنَ مِنْ نَفْسِهِ..... (شرح مشکل الآثار: ۱۱۳/۲)

اسی طرح صحابہ کرام نے حدیث مذکور میں مطلقہ کے لئے امکان مسییس کو مسییس کے قائم

مقام قرار دے کر اس کے شوہر پر پورا مہر لازم کیا ہے (بشرطیکہ دونوں میں خلوت صحیحہ پائی گئی ہو) گرچہ حقیقہً وطی نہیں پائی گئی، اس لئے صحابہ کرام کے یہاں مطلقہ بعد الخلوۃ، مطلقہ بعد الوطی کے درجہ میں ہے، لہذا اس کے لئے شوہر پر پورا مہر ہوگا اور اس پر عدت بھی۔

قِيلَ لَهُ: إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا فِي هَذَا بِوُجُوبِ الصَّدَاقِ وَوُجُوبِ الْعِدَّةِ هُمُ الْخُلَفَاءُ
الزَّائِدُونَ الْمَهْدِيُّونَ أَبُو بَكْرٍ، وَعُمَرُ، وَعُثْمَانُ، وَعَلِيٌّ وَلِحَقِّ بِهِمْ فِي ذَلِكَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَهُوَ
كَاتِبُ الْوَحْيِ وَالْمُؤْتَمَنُ عَلَيْهِ، الخ۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۱۱۴)

نظیر:

امام طحاوی نے امکان مسیس کو مسیس کے قائم مقام کرنے کے لئے بیع و شرا سے متعلق ایک نظیر پیش کی ہے، کہ اگر کسی بائع نے اپنی کوئی چیز دوسرے شخص کے معرفت فروخت کی، جس کا کچھ ثمن مشتری کی طرف سے ادا کرنا باقی تھا، اس وقت تک اس نے بیع کو جس کر لیا؛ لیکن جیسے ہی مشتری نے ما بقیہ ثمن بائع کو ادا کر دیا اور بائع اس پر قبضہ بھی کر لیا، تو بیع سے وہ دست بردار ہو گیا حتیٰ کہ مشتری کو اس پر پورے طور پر قبضہ کرنے کی راہیں ہموار ہو گئیں؛ لیکن اس کے باوجود اس پر مشتری نے قبضہ نہیں کیا، یہاں تک کہ وہ بیع ہلاک ہو گئی، تو یہ ہلاکت مشتری کے مال میں شمار ہوگی نہ کہ بائع کے مال میں، اور اس مسئلہ میں سبھوں کا اتفاق ہے۔

فَمَثَلُ ذَلِكَ مَا قَدْ ذَكَرْنَا مِنْ امْكَانِ هَذِهِ الْمَرْأَةِ نَفْسَهَا زَوْجَهَا مِنْ جَمَاعِهِ حَتَّى لَمْ
يَكُنْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ ذَلِكَ حَائِلٌ وَلَا لَهُ مِنْهُ مَانِعٌ، يَجُوزُ أَنْ يُطْلَقَ عَلَيْهِ اسْمُ مَمَاسٍ لَهَا، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ
مَمَاسًا لَهَا فِي الْحَقِيقَةِ، وَتَدْخُلُ بِذَلِكَ فِي مَعْنَى الْمُطْلَقِ بَعْدَ الْمَسِيْسِ؛ لِأَنَّهُ فِي مَعْنَى
الْمُطْلَقِ قَبْلَهُ، وَقَدْ وَجَدْنَا مَا قَدْ أَجْمَعَ الْمُسْلِمُونَ عَلَيْهِ؛ لِأَنَّهُمْ لَمْ يَخْتَلِفُوا فِي مَنْ بَاعَ شَيْئًا لَهُ
بِثَمَنِ حَبْسَهُ حَتَّى يَقْبِضَ ذَلِكَ الثَّمَنَ، فَمُكِّنَ مِنْ قَبْضِهِ، وَخُلِيَ بَيْنَهُ، وَبَيْنَهُ فَلَمْ يَضَعْ يَدَهُ

عَلَيْهِ، وَلَمْ يَقْبِضْهُ، وَلِحِقَّةُ هَلَاكِهِ: أَنَّهُ يَكُونُ هَالِكًا مِنْ مَالِهِ، لَا مِنْ مَالِ بَائِعِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۱۵/۲-۱۱۳)



باب :- ۹۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلا مَا زَوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ:

”فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَمَلُّ حَتَّى تَمَلُّوا“.

﴿اللہ تعالیٰ ثواب دینے میں تھکتے نہیں﴾

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا امْرَأَةٌ، فَقَالَ: ”مَنْ هَذِهِ“
فَقَالَتْ: ”فُلَانَةٌ لَا تَنَامُ، فَدُكِرَ مِنْ صَلَاتِهَا، فَقَالَ: ”مَهْ عَلَيْكُمْ مَا تُطِيقُونَ فَوَاللَّهِ لَا يَمَلُّ اللَّهُ
تَعَالَى حَتَّى تَمَلُّوا، وَكَانَ أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ مَا دَاوَمَ عَلَيْهِ صَاحِبُهُ“ . (شرح مشکل الآثار:

۱۱۶۲، ورواه البخاری: (۱۱۵۱)، ومسلم: (۸۵)، والترمذی فی ”الشمائل“: (۳۰۴)

خلاصہ الحدیث:

دنیا میں اسلام کے علاوہ جتنے مذاہب ہیں، ان میں سے کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہو، چنانچہ کسی میں افراط ہے، تو کسی میں تفریط، البتہ دین اسلام واحد مذہب ہے، جس میں، افراط و تفریط نہیں ہے، اسی بنا پر اسلام نے مسلمانوں کو ہر اس عمل سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے جس کی وجہ سے افراط و تفریط میں شکار ہونے کا دروازہ کھلتا ہے، مثلاً عبادت میں حسب طاقت ریاضت و مجاہدہ کی ترعیب دی ہے، لیکن اپنی طاقت سے زیادہ اپنے جسم کو عبادت و ریاضت میں عاجز اور تھکانے کی کوشش کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ تکلیف مالا یطاق کے مصداق ہے، اور یہ اس آیت کے خلاف ہے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (بقرہ: ۲۸۶)

(اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی شخص کو مگر جو اس کی گنجائش ہے۔)

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے، جیسا کہ اس باب کی حضرت عائشہؓ کی روایت میں ایک صحابہ کا واقعہ مذکور ہے کہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک عورت کی نماز کا ذکر ہو رہا تھا کہ یہ کثرت سے نماز پڑھتی ہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رک جاؤ ”سن لو“ تم پر اتنا عمل واجب ہے جتنی تمہارے اندر طاقت ہے۔

خدا کی قسم اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہیں اکتاتا ہے، مگر تم عمل کرتے کرتے اکتا جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب و پسندیدہ عمل وہ ہے، جس پر اس کے صاحب مداومت کرے۔

اشکال:

حضرت عائشہؓ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ملل“ کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف کی ہے، جبکہ اس کا معنی سستی، کاہلی اور اکتاہٹ ہے، جو مخلوق کے ساتھ خاص ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات ان صفات سے منزہ ہیں، تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسبت اللہ کی طرف کیوں کی؟

فَقَالَ قَائِلٌ: وَكَيْفَ يَجُوزُ لَكُمْ أَنْ تَقْبَلُوا هَذَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيهِ إِضَافَةٌ الْمَلَلِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى فِي حَالِ مَا وَذَلِكَ مُتَّفٍ عَنِ اللَّهِ وَلَيْسَ مِنْ صِفَاتِهِ؟ (شرح مشکل الآثار: ۱۱۸/۲)

جواب:

چونکہ ”ملل“ کا معنی سستی اور کاہلی ہے، یہ دراصل انسان کی صفات فطریہ ہیں؛ لیکن اللہ

تعالیٰ ان صفات بشری سے مبرا ہے، اس لئے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا درست نہیں، رہا مسئلہ یہ کہ حدیث میں لفظ ”ملل“ ہے، تو اس سے وہ معنی مراد نہیں ہے (جس کا ذکر اشکال میں کیا گیا ہے) بلکہ اہل علم کے نزدیک آپ ﷺ کا قول ”لا یمل اللہ حتی تملوا“ کا معنی ”لا یمل اللہ إذا مللتم“ یعنی اللہ تعالیٰ ثواب دینا ترک نہیں فرماتے ہیں جب تک کہ تم ہی عبادت کو نہ چھوڑ دو۔

چنانچہ امام طحاوی نے اسی طرح اس اشکال کا جواب دیا ہے۔

فكان جوابنا له في ذلك أنّ المَلَلَ مُتَّفٍ عَنِ اللَّهِ كَمَا ذَكَرَ، وَلَيْسَ مَا تَوَهَّمَهُ، مِمَّا حُمِلَ عَلَيْهِ تَأْوِيلُ هَذَا الْحَدِيثِ كَمَا تَوَهَّمَهُ، وَإِنَّمَا هُوَ عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ فِي اللُّغَةِ عَلَى قَوْلِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا يَمَلُّ اللَّهُ إِذَا مَلِلْتُمْ" إِذْ كَانَ الْمَلَلُ مَوْهُومًا مِنْكُمْ وَغَيْرِ مَوْهُومٍ مِنْهُ عَزَّ وَجَلَّ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۱۱۸)

نظیر:

متکلم کے کلام کا وزن اور عظمت اس وقت دو بالا ہو جاتی ہے، جبکہ وہ کلام میں بلاغت و بیان کے موتی بکھیرتے ہیں، اسی کی ایک کڑی یہ جملہ بھی ہے۔

”لَا يَنْقَطِعُ فُلَانٌ عَنِ خُصُومَةٍ خَصَمِهِ حَتَّى يَنْقَطِعَ خَصْمُهُ“ (حوالہ سوابق)

متکلم کے کلام کی تعبیر سے ہرگز یہ مقصود نہیں ہے کہ خصم کے انقطاع کلام کے بعد متکلم بھی منقطع کر دیتا ہے؛ کیونکہ اس وقت اس کی خصوصیت باقی نہیں رہے گی، اس لئے اس سے مراد اور مطلب یہ ہے کہ خصم کے انقطاع کے بعد بھی اسی حال پر باقی رہتا ہے، (یعنی متکلم کا کلام جاری رہتا ہے)

وَلَكِنَّهُمْ لَا يُرِيدُونَ أَنَّهُ لَا يَنْقَطِعُ بَعْدَ انْقِطَاعِ خَصْمِهِ كَمَا انْقَطَعَ خَصْمُهُ عَنْهُ. (حوالہ

(سابق)

اسی طرح حدیث الباب کے الفاظ ”لا یمل اللہ حتی تملوا“ کا مطلب ہے کہ تم لوگ عبادت کرتے کرتے تھک جاتے ہو اور عبادت کرنا چھوڑ دیتے ہو، لیکن اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہیں تھکتے ہیں۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۱۱۸)

اقوال المحدثین:

امام نوویؒ اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

ملل واکتاہت اور سستی بشری صفات ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کرنا محال ہے، لہذا حدیث الباب میں ”لا یمل اللہ حتی تملوا“ کی تاویل اور توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی عبادت و ریاضت کا اجر و ثواب دینے میں سستی و کاہلی کا معاملہ نہیں کرتے؛ بلکہ اس باب میں فراخی اور کشادہ دستی کا سلوک کرتے ہیں۔

قال العلماء: الممل والسامة بالمعنى المتعارف فى حقنا محال فى حق الله تعالى، فيجب تاويل الحديث، قال المحققون: معناه لا يعاملكم معاملة المأل فينقطع عنكم ثوابه وجزائه وبسط فضله ورحمته حتى تقطع عملك۔۔۔

ولو كان معناه ينقطع إنا انقطع خصومه لم يكن له فضل على غيره. (هامش على مسلم

۲/۱۶۶، فتح الملهم: ۱/۱۳۹-۱۳۸)

حافظ ابن حجرؒ ”فتح الباری“ میں اس طرح تحریر کرتے ہیں:

ملل واکتاہت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا بالاتفاق محال ہے، اسی وجہ سے اسماعیل اور محققین کی ایک جماعت نے اس حدیث کی اس طرح توجیہ کی ہے کہ یہ لفظ مجازاً بطور لفظی مقابلہ کے لئے باری تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

وهو محال على الله تعالى باتفاق قال الإسماعيل وجماعة من المحققين انما اطلق هذا على جهة المقابلة اللفظية مجازاً كما قال تعالى وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا. (فتح الباری: ۱۲۲/۱)

صاحب بذل لکھتے ہیں:

یہاں حدیث الباب میں ”ملالہ“ کا لفظ استعارہ کے طور پر آیا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و احسان کا دروازہ بند نہ ہو، کیوں کہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا ہے، گرچہ انسان عبادت سے عاجز ہو جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نہیں ٹھکتا۔

قوله: (فإن الله لا يمل) الملاله في حقه تعالى ليس على حقيقتها، بل هي استعارة لقطع الاقبال بالاحسان، أي لا يقطع الاقبال عليكم بالاحسان (حتى تملوا) عن العبادة واطلاق الملاله عليه سبحانه وتعالى من باب مشاكلة. (بذل المجهود: ۶۳۳/۵)



باب :- ۹۴

باب بیان مشکل ما زوی عنہ علیہ السلام فی قتیلة ابنة قیس التي لم یدخل بها
بعده تزویجہ ایہا حتی توفی عنہا

﴿ازواج مطہرات کے مناقب کا بیان﴾

عن ابن عباس "أن رسول الله عليه السلام تزوج قتيلة بنت الأشعث هكذا قال ابن
أبي داود في حديثه وإنما هي أخت الأشعث، فمات قبل أن يحجبها فبرأه الله تعالى منها"
وقد روي في أمرها الذي به برأ الله رسوله منها زيادته على هذا. (شرح مشکل الآثار: ۱۱۹/۲،
ورواه ابن جرير: ۴۱/۲۲، وابن سعد في "الطبقات": ۱۳۷/۸)

خلاصہ الحدیث:

ازواج مطہرات کو دنیا کی دوسری عورتوں پر جو تقدس و تکریم حاصل ہے، وہ ان ہی کا طرہ
امتیاز ہے کہ وہ پوری امت کے لئے روحانی ماں ہیں، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے
بعد امہات المؤمنین میں سے کسی کا نکاح کرنا درست نہیں، اور اس حکم کے مصداق وہ ازواج
مطہرات ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں رہیں، اور یہ صورت
متفق علیہ ہے جیسا کہ امام قرطبی کے حوالہ سے مفتی شفیع صاحب نے نقل کیا ہے۔

(معارف القرآن: ۲۰۳/۳)

لیکن جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دیدی، یا ارتداد کی صورت میں آپ کی زوجیت سے
علاحدہ ہو گئیں، ان کے بارے میں امت کے مختلف اقوال ہیں:

انہیں عورتوں میں قتیلہ بنت قیس کا شمار ہوتا ہے کہ ان سے نکاح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم بستری نہیں کی، اور نہ انہیں پردہ کا حکم دیا؛ بل کہ انہوں نے اپنی قوم کے ساتھ ارتداد کو قبول کر لیا، اسی وجہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کو ازواج مطہرات کے زمرے سے خارج کر دیا ہے۔

بہر حال امام طحاویؒ اس باب میں اکثر روایات کو جمع کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ قتیلہ بنت الاشعث ازواج میں سے نہیں تھیں۔

وَأَنَّ عُمَرَ أَخْرَجَهَا مِنْ أَزْوَاجِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِرِدَّتِهَا الَّتِي كَانَتْ مِنْهَا، إِذْ كَانَ لَا يَصْلُحُ لَهَا مَعَهَا أَنْ تَكُونَ لِلْمُسْلِمِينَ أُمَّاً. (شرح مشکل الآثار: ۱۲۱/۲)

تاہم قتیلہ بنت الاشعث کو ازواج مطہرات کے مقام سے مستثنیٰ کرنے کے اسباب میں محدثین و فقہاء کا اختلاف ہے، آیا وہ ارتداد عن الاسلام ہے یا تخییر و دخول ہے؟ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے ان کے بارے میں ارتداد عن الاسلام کے ساتھ ساتھ تخییر اور حجاب کو خارج عن الازواج کا سبب قرار دیا ہے جیسا کہ ابن عباس کی روایت سے یہ بات واضح ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ "أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ تَزَوَّجَ قَتِيلَةَ فَأَزْتَدَتْ مَعَ قَوْمِهَا وَلَمْ يُخَيِّرْ هَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ يَحْجُبْهَا فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِنْهَا.

(شرح مشکل الآثار: ۱۱۹/۲-۱۲۰)

لیکن حضرت عمرؓ کا نقطہ نظر اس سے الگ ہے کہ قتیلہ بنت الاشعث کی امہات المؤمنین سے علیحدگی صرف اس کے ارتداد قبول کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے، نہ کہ تخییر و دخول کی وجہ سے، وجہ فرق دونوں میں یہ ہے کہ "ارتداد عن الاسلام" اس کا ذاتی عمل ہے؛ لیکن تخییر و دخول اس کا فعل نہیں ہے، اس لئے اس کی (زمرہ ازواج مطہرات سے) علاحدگی کا اصل محرک و سبب اس کا فعل

ہے یعنی ارتداد کا قبول کرنا، جیسا کہ امام طحاویؒ نے ذکر کیا ہے۔

”فَكَانَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ عُمَرَ وَإِنْ كَانَ قَدْ أَخْرَجَهَا مِنْ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَدْ مَنَعَهَا مِنْ تَزْوِيجِ غَيْرِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَفِي ذَلِكَ دَلِيلٌ أَنَّ الْمَعْنَى الَّذِي كَانَ أَخْرَجَهَا بِهِ مِنْ أَزْوَاجِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، هُوَ ارْتِدَادُهَا عَنِ الْإِسْلَامِ لَا مَا سِوَاهُ مِنَ الدُّخُولِ بِهَا وَالتَّخْيِيرِ لَهَا؛ لِأَنَّ ارْتِدَادَهَا كَانَ عَنِ الْإِسْلَامِ مِنْ فِعْلِهَا، وَالتَّخْيِيرِ لَهَا وَالدُّخُولِ بِهَا لَمْ يَكُنْ مِنْ فِعْلِهَا، وَأَنَّهُ إِنَّمَا أَخْرَجَهَا بِفِعْلِهَا لَا بِمَا سِوَاهُ.

(شرح مشکل الآثار: ۱۲۳/۲)

قتیلہ کے قتل کے ارادہ پر حضرت عمرؓ کے نکیر کی وجہ:-

حضرت شعبی کی روایت سے امام طحاوی نے یہ معنی اخذ کیا ہے کہ جب عکرمہ بن ابی جہل نے قتیلہ بنت الاشعث سے نکاح کیا، تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کو قتل کرنے کا ارادہ کیا؛ مگر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ قتیلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھائی کے ساتھ مرتد ہو گئی، اس لئے وہ امہات المؤمنین کے زمرے سے خارج ہو گئی؛ لہذا جب اس صورت میں عام امہات المؤمنین کے زمرے سے نکل گئیں تو دوسرے مرد سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس وجہ سے ان کو قتل کرنے سے حضرت عمرؓ نے منع فرمایا؟

أَنَّ عُمَرَ أَخْرَجَهَا مِنْ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، الَّتِي كَانَتْ مِنْهَا۔

۔۔ (حوالہ سابق)

مَعَ أَنَّهُ قَدْ رُوِيَ عَنْ عُمَرَ أَنَّهُ كَانَ مَنَعَ فُتَيْلَةَ هَذِهِ مِنَ التَّزْوِيجِ، وَإِنْ كَانَ قَدْ أَخْرَجَهَا مِنْ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ. (شرح مشکل الآثار: ۱۲۳/۲)

فتزوجها عكرمة بن أبي جهل بحضرموت، فبلغ أبا بكر فقال: لقد هممت أن

احرق علیہم بیتها فقال له عمر: ما هی من أمهات المؤمنین ولا دخل علیها ولا علیها الحجاب. (اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ: ۶/۲۲۰، ط: دار الفکر، بیروت)

اشکال:

یہ بات مسلم ہے کہ ناشزہ عورت کا نفقہ شوہر کے ذمہ ساقط ہو جاتا ہے؛ لیکن جب بری عادات سے رجوع کر کے شوہر کے مطیع ہو جاتی ہے، تو سابقہ حقوق شوہر پر عود کر کے آجاتے ہیں؛ لیکن کندیہ نے ارتداد کے بعد دوبارہ اسلام قبول کر لیا، تو پھر وہ جملہ سابقہ حقوق کے مستحق کیوں نہیں ہوئی؟

فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: فَإِنَّا قَدْ رَأَيْنَا النَّاشِرَ إِذَا رَجَعَتْ عَنْ نُشُوزِهَا إِلَى مَا كَانَتْ عَلَيْهِ قَبْلَهُ رَجَعَتْ إِلَى حُقُوقِهَا قَبْلَ زَوْجِهَا الَّتِي كَانَتْ لَهَا عَلَيْهِ، ---- (شرح مشکل الآثار: ۱۲۳/۲)

جواب:

چوں کہ کندیہ نے جب ارتداد کو قبول کر لیا، تو وہ ازواج مطہرات کے زمرے سے نکل گئیں، لہذا وہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اس مقام پر نہیں آسکتی، اس لئے اسے مسلمان ہونے کے بعد بھی سابقہ حقوق نہیں ملیں گے، جیسا کہ امام طحاوی رقمطراز ہیں:

وَلَمْ تَكُنِ الْكِنْدِيَّةُ كَذَلِكَ، لِأَنَّهُ لَمَّا كَانَ مِنْهَا الْإِرْتِدَاءُ عَنِ الْإِسْلَامِ كَانَتْ فِي حَالِهَا تِلْكَ مِمَّنْ قَدْ مَنَعَهُ اللَّهُ تَعَالَى دُخُولَ الْجَنَّةِ، وَلَمْ يَصْلُحْ لَهَا مَعَ ذَلِكَ أَنْ تَكُونَ لِلْمُسْلِمِينَ أُمَّامًا، وَحُقُوقِ الْأُمُومَةِ لَا تَرْجِعُ بَعْدَ زَوَالِهَا، وَإِذَا لَمْ تَرْجِعْ بَعْدَ زَوَالِهَا لَمْ تَرْجِعِ الْكِنْدِيَّةُ الَّتِي ذُكِرَتْ إِلَى أَنْ تَكُونَ لِلْمُسْلِمِينَ أُمَّامًا، وَإِذَا لَمْ تَرْجِعْ أَنْ تَكُونَ لِلْمُسْلِمِينَ أُمَّامًا لَمْ تَسْتَحِقْ فِي أَمْوَالِهِمْ نَفَقَةً كَمَا يَسْتَحِقُّ مِثْلَهَا سَائِرُ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بِأُمُومَتِهِنَّ إِيَّاهُمْ، وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار: ۱۲۵/۲-۱۲۳)

دوسری جگہ پر امام طحاویؒ نے اس بات کو ذکر کیا ہے:

جب وہ مرتد ہو گئیں، تو ان کے سارے حقوق (جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ تھے) وہ باطل ہو گئے۔

فَلَمَّا كَانَتْ مِنْهَا الرِّدَّةُ بَطَلَتْ عَنْهُ بِهَا حُقُوقُهَا عَلَيْهِ الَّتِي كَانَتْ تَكُونُ لَهَا عَلَيْهِ بَعْدَ وَفَاتِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۲۴/۲)



باب :- ۹۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "لَا عَتَاقَ وَلَا طَلَاقَ فِي إِغْلَاقٍ"

﴿اکراہ کی حالت میں طلاق وعتاق کا بیان﴾

عَنْ عَائِشَةَ، فَقَالَتْ: حَدَّثَنِي عَائِشَةُ، أَنَّهَا سَمِعَتْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "لَا عَتَاقَ وَلَا طَلَاقَ فِي إِغْلَاقٍ". (شرح مشکل الآثار: ۱۲۶/۲، ورواه أبو داود: (۲۱۹۳)، وابن ماجه: (۲۰۳۹)، والبيهقي: ۹۱/۱۰)

اغلاق کا معنی:

اس حدیث میں اغلاق کا معنی واضح نہیں ہے، سب سے پہلے اس کی وضاحت لکھی جائے گی، پھر حدیث کا خلاصہ۔

اغلاق کا معنی اکراہ ہے، چنانچہ علامہ طاہر پٹنی نے اپنی کتاب ”مجمع بحار الانوار“ میں اس کا معنی اکراہ لکھا ہے۔

قال في المجمع: أي في اكراه، لان المكره مغلق عليه في امره ومضيق عليه في تصرفه. (۵۹/۳)

علامہ شوکانی نے بھی ”اغلاق“ کا معنی اکراہ لیا ہے،

وقال الشوكاني في النيل: قوله في اغلاق فسره العلماء الغريب بالاكراه.

نیز امام طحاویؒ بھی تحریر کرتے ہیں کہ حدیث مذکور میں ”اغلاق“ سے اجبار مراد ہے، جو معتق پر عتق سے اور مطلق پر طلاق دینے پر روک لگا دیتا ہے، چنانچہ دونوں میں سے نہ معتق اپنی مرضی سے غلام آزاد کر سکتا ہے اور نہ مطلق اپنے اختیار سے طلاق دے سکتا ہے۔

اس وجہ سے اگر مکرمہ (معتق) اپنا غلام آزاد کرتا ہے، تو اسے کوئی ثواب نہیں ملے گا، اور اگر کوئی مرد اہل طلاق دیتا ہے، تو اس پر کوئی گناہ بھی نہیں ہوگا۔

فَاحْتَمَلَ بِذَلِكَ عِنْدَنَا أَنْ يَكُونَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ أُرِيدَ بِهِ الْإِجْبَارُ الَّذِي يُغْلَقُ عَلَى الْمُعْتَقِ، وَعَلَى الْمُطْلَقِ حَتَّى يَكُونَ مِنْهُ الْعَتَاقُ وَالطَّلَاقُ عَلَى غَيْرِ الْخِيَارِ مِنْهُ لَهُمَا، وَلَا يَكُونُ فِي الْعَتَاقِ مَثَابًا كَمَا يَثَابُ سَائِرُ الْمُعْتَقِينَ. (شرح مشکل الآثار: ۱۲۸/۲)

خلاصہ الحدیث:

طلاق کا اختیار اگرچہ شریعت نے مرد کو دیا ہے؛ لیکن اس کی اجازت ایک خاص ناگزیر حالت میں ہے؛ جبکہ دونوں کا آپس میں نباہ مشکل اور دشوار ہو، اور نباہ صلح مصالحت کی تمام صورتیں اختیار کرنے کے بعد طلاق کے علاوہ کوئی اور صورت نہ ہو، تو اس صورت میں مرد کو حالت طہر میں ایک طلاق دینے کی اجازت ہے، لیکن زبان سے الفاظ طلاق کا اظہار کرنا ضروری ہے، چنانچہ کسی مرد کو دوسرے شخص نے طلاق دینے پر اجبار کیا، تو ائمہ ثلاثہ کے یہاں کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، جیسا کہ اس باب کی حدیث میں ذکر ہے۔

”لَا عَتَاقَ وَلَا طَّلَاقَ فِي إِغْلَاقٍ“

لیکن امام ابوحنیفہؒ کے یہاں اکراہ کی صورت میں بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

علامہ ابن رشد مالکیؒ نے اس مسئلہ کو اس طرح لکھا ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے یہاں اگرچہ مکرمہ کی طلاق واقع نہیں ہوتی ہے؛ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے یہاں یہ طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

قال ابن رشد طلاق المکره غیر واقع عند مالک والشافعی واحمد وجماعة ويقع عند ابی حنیفة وأصحابه. (بذل المجهود: ۱۷۹/۸، بداية المجتهد: ۳۸۲/۴، ط: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

اور صاحب ہدایہ اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

وطلاق المکره واقع خلافا للشافعی هو يقول أن الاکراه لا یجامع الاختیار. (هدایہ: ثانی: ۳۵۸/۲)

اشکال:

باب کی پہلی روایت حضرت عائشہؓ کی امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے خلاف ہے، تو یہاں پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ امام طحاویؒ کس حدیث کی بنیاد پر مسلک احناف (مکرہ کی طلاق واقع ہوتی ہے) کو ثابت کرتے ہیں؟

فقال: قائل: فالی قول من ذهبتم فی الزام طلاق المکره والی أی حدیث قصدتم. (شرح مشکل الآثار: ۱۲۸/۲)

جواب:

امام طحاویؒ نے یہاں ایک ایسی حدیث پیش کی ہے جو حضرت عائشہؓ کی حدیث کے مقابلہ میں سند، رجال اور معنی کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہے، وہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی حدیث ہے، وہ ذکر کرتے ہیں کہ میں اپنے والد محترم کی معیت میں جنگ بدر میں شرکت کے لئے جا رہا تھا، راستہ میں کفار قریش ہم لوگوں کو پکڑ لیا، اور یہ سوال کیا کہ کیا تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانا چاہتے ہو؟ تو ہم نے یہ جواب دیا کہ ہم لوگ صرف مدینہ جانا چاہتے ہیں، چنانچہ کفار قریش نے ہم لوگوں سے یہ عہد لیا کہ تم لوگ مدینہ جاؤ؛ لیکن ان کے ساتھ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جنگ

مت کرنا، بہر حال ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور راستہ کی پوری روداد سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کیا، تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو واپس جانے کا حکم فرمایا، (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہد کی بجائے آوری کی ترغیب دی، جو کفار قریش کے مابین ہوا تھا)۔

فكان جوابنا له في ذلك أن ذهبنا الى حديث هو أحسن في الاسناد من هذا الحديث وأعرف رجالا واكشف معني، حَدَّثَنَا حُدَيْفَةُ بْنُ الْيَمَانِ قَالَ: مَا مَنَعَنِي أَنْ أَشْهَدَ بَدْرًا إِلَّا أَنِّي خَرَجْتُ أَنَا وَأَبِي فَأَخَذَنَا كُفَّارُ قُرَيْشٍ فَقَالُوا: إِنَّكُمْ تُرِيدُونَ مُحَمَّدًا فَقُلْنَا: مَا تُرِيدُ إِلَّا الْمَدِينَةَ فَأَخَذُوا مِنَّا عَهْدَ اللَّهِ وَمِيثَاقَهُ لَنُنْصِرَنَّ إِلَى الْمَدِينَةِ وَلَا نُقَاتِلُ مَعَهُ، فَأَتَيْنَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرْنَاَهُ فَقَالَ: ”انْصِرْ فَإِنِّي لَهُمْ بِعَهْدِهِمْ وَنَسْتَعِينُ اللَّهَ عَلَيْهِمْ“ . (شرح مشکل الآثار: ۱۲۹/۲)

اقوال المحدثين:

محدث کبیر خلیل احمد سہارنپوری رقمطراز ہیں: کہ مکہ کی طلاق واقع ہو جاتی ہے گرچہ رضاء طبعی اور اختیار طبعی نہیں پایا جاتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود بھی اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی؛ کیونکہ وقوع طلاق کے لئے رضاء طبعی کا پایا جانا شرط نہیں ہے، جیسے ہازل کی طلاق بغیر رضاء طبعی کے واقع ہوتی ہے۔

ولان الفئات بالا كراه ليس الا الرضاء طبعاً، وانه ليس بشرط لوقوع الطلاق، فإن طلاق الهازل واقع، وليس براض به طبعاً“ . (بذل المجهود: ۱۸۰/۸)



باب :- ۹۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ:
 ”لَا طَّلَاقَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ نِكَاحٍ، وَلَا عَتَاقَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مِلْكٍ“

﴿ طلاق معلق اور عتاق معلق کا بیان ﴾

عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ قَالَ: حَفِظْتُ لَكُمْ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتًّا:
 ”لَا طَّلَاقَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ نِكَاحٍ وَلَا عَتَاقَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مِلْكٍ، وَلَا يَتِمُّ بَعْدَ احْتِلَامٍ، وَلَا وِفَاءً لِنَدْرٍ فِي
 مَعْصِيَةٍ، وَلَا صَمْتًا يَوْمَ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا وِصَالَ فِي الصِّيَامِ“ . (شرح مشکل الآثار: ۱۳۱/۲، ورواه
 أبو داود ومحتصرًا: (۲۸۷۳) والبيهقي: ۴۶۱/۷، والطبرانی في ”الصغير“: (۲۶۶))

خلاصہ الحدیث:

طلاق کی دو قسمیں ہیں: منجز اور معلق، اگر طلاق کا وقوع مستقبل میں کسی کام کے ہونے یا
 یا نہ ہونے یا کسی وقت پر موقوف نہیں ہے تو وہ طلاق منجز ہے؛ لیکن اگر موقوف ہے تو وہ طلاق معلق
 ہے۔ طلاق منجز کی مثال: ”أَنْتِ طَلَّاقٌ، أَنْتِ مَطْلُوقَةٌ، طَلَّقْتُكَ“ .
 اور طلاق معلق کی مثال: ”ان ذهبتِ فانتِ طَالِقٌ، وان نكحتكِ فانتِ طَالِقٌ“ .

جس طرح طلاق معلق شرط کے وجود کے بعد واقع ہوتی ہے، اسی طرح غلام و باندی کی
 آزادی کے بعد واقع ہوتی ہے، اور اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، چنانچہ امام شافعی کے یہاں
 طلاق معلق اور عتاق معلق دونوں کا اعتبار نہیں ہوتا، جبکہ احناف اور مالکیہ کے یہاں نکاح کے بعد
 طلاق واقع ہو جاتی ہے اور ملکیت کے بعد غلام آزاد ہو جاتا ہے۔ (شرح مشکل الآثار: ۱۳۶/۲)

اسی طرح اس حدیث میں یہ بھی وضاحت ہے کہ کوئی بچہ یا بچی سن بلوغ کو پہنچ جائے، تو ان پر اب یتیم کا حکم نہیں ہوگا، اور وہ نذر جن کی بجا آوری میں معصیت الہی لازم آئے، تو اس کو پورا کرنا جائز نہیں، اسی طرح رات میں روزہ رکھنا درست نہیں، اور مسلسل نقلی روزہ رکھنا درست نہیں۔

الغرض امام طحاویؒ نے مذکورہ مسائل کی وضاحت کے لئے حضرت علیؓ کی روایت کے علاوہ کئی روایات کو جمع کئے ہیں۔

اشکال:

طلاق معلق اور عتاق معلق کے جملے زبان سے ادا کرنے کے وقت محل طلاق اور محل عتق دونوں نہیں ہوتے، کیوں کہ اس وقت وہ عورت مطلق کے نکاح میں نہیں ہوتی ہے اور نہ مالک کی ملکیت غلام و باندی پر پائی جاتی ہے، تو شرط کے پائے جانے کے بعد طلاق کیسے واقع ہوگی اور غلام کیسے آزاد ہوگا؟

قان قال قائل: انما اختلف هذا وما قبله لملك قائل هذا القول الأمة التي قاله لها في وقت قوله اياه لها قيل له لم يختلف في ملكه كان لها يومئذ، ولا في انتفاء ملكه عن ما وقع عتاقه عليه يومئذ، وفيما ذكرنا دليل على ما وصفتنا۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۱۴۰)

جواب:

یوں تو وقوع طلاق کے لئے محل طلاق اور غلام و باندی کی آزادی کے لئے اس پر مولیٰ کی ملکیت کا پایا جانا شرط ہے، لیکن اگر طلاق ایسے امر پر معلق کی گئی ہو جو فی الحال معدوم ہو، لیکن مستقبل میں اس کے پائے جانے کا امکان ہو، تو ایسی صورت میں اس امر (جس پر طلاق کو معلق کیا ہے) کے موجود ہونے کے بعد مطلق کی بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی، اور غلام و باندی پر

ملکیت پائے جانے کے بعد اس کی آزادی ہو جائے گی؛

والمعلق كان معلقا بشرط أو حادثة أو مضافا إلى وقت، وهذا يتوقف وقوعه على وجود الشرط أو الحادثة أو حلول الوقت المضاف إليه، والتعليق يمين. (الاحكام الشرعية في الاحوال الشخصية ماده: ص، ۵۱-۳۹، بحواله مجموعہ قوانین اسلام: ص ۱۵۵)

اور امام طحاویؒ نے حضرت عمرؓ کے واقعہ خیبر سے استدلال کرتے ہوئے پیش کردہ اشکال کا جواب دیا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ جب جنگ خیبر میں حاضر ہوئے، عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو اتنا مال ملا ہے، اس سے قبل اس طرح کبھی مال حاصل نہیں ہوا، اس لئے میں صرف ثواب الہی کی نیت سے پورا صدقہ کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اصل کو رکھو، اور اس سے جو نفع حاصل ہوگا اس کو صدقہ کر دو۔

اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کو صدقہ کرنے کا حکم فرمایا، جو اس وقت حضرت عمرؓ کے قبضہ میں نہیں تھیں، جب مذکورہ صورت میں معدوم شیء کا صدقہ کرنا درست اور صحیح ہے، تو اسی طرح طلاق معلق نکاح کے بعد واقع ہو جائیگی اور غلام و باندی کی آزادی ملکیت کے بعد ہو جائے گی۔

عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ عُمَرَ مَلَكَ مِائَةَ سَهْمٍ مِنْ خَيْبَرَ، فَاسْتَجْمَعَهَا فَأَتَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنِّي أَصَبْتُ مَالًا أُصِيبُ مِثْلَهُ قَطُّ، وَقَدْ أَرَدْتُ أَنْ أَتَقَرَّبَ بِهِ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، فَقَالَ لَهُ: "أَحْبِسِ الْأَصْلَ وَسَبِّبِ الثَّمَرَ". (شرح مشکل الآثار: ۱۳۱/۲)

فَكَانَ فِي أَمْرِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمَرَ جَوَابًا لِمَسْأَلَتِهِ إِيَّاهُ بِتَحْيِيسِ أَصْلِ سِهَامِهِ هَذِهِ، وَتَسْبِيلِ ثَمَرَتِهَا الْحَادِثَةِ فِيهَا مَا قَدْ دَلَّ عَلَى جَوَازِ الْعُقُودِ فِي الْأَشْيَاءِ الْحَوَادِثِ عَنْهَا، مِمَّا لَمْ يَكُنْ عَاقِدُوهَا فِي وَقْتِ عَقْدِهِمْ مَا عَقَدُوا فِيهَا مَالِكِينَ

لہا۔۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۱۳۲)

نظیر:

اس کی مثال اور نظیر وکالت قبل الملک کا مسئلہ ہے، یعنی ایک شخص پر ظہار یا یمین کا کفارہ ادا کرنا واجب ہے، مگر وہ خود اس کفارہ کی ادائیگی کے بجائے کسی دوسرے شخص کو غلام خریدنے کے بعد کفارہ ظہار یا کفارہ یمین کی ادائیگی کی نیت سے آزاد کرنے کا وکیل بنایا، اور وکیل نے موکل کے حسب حکم غلام خریدنے کے بعد آزاد کر دیا، تو بالاتفاق کفارہ ظہار یا کفارہ یمین کی ادائیگی موکل کی طرف سے شرعاً ہو جائے گی، اس صورت میں غلام موکل کے ملک میں آیا بھی نہیں اور معدوم غلام کو آزاد کرنے کا وکیل بنا دیا اور وکیل نے جب خریدنے کے بعد آزاد کر دیا، تو موکل کی طرف سے کفارہ ظہار ادا ہو گیا، اسی طرح طلاق معلق اور عتاق معلق کا نفاذ ہوتا ہے۔

وَمِثْلُ ذَلِكَ أَيضًا مَا قَدْ أَجْمَعُوا عَلَى إِجَازَتِهِ فِي الْوَكَاِلَاتِ فِيمَنْ تَجِبُ عَلَيْهِ رَقَبَةٌ فِي ظَهَارٍ، أَوْ كَفَّارَةِ يَمِينٍ فَيُؤَكِّلُ رَجُلًا بِابْتِئَانِهَا، وَعَتَاقِهَا عَنْهُ عَنْ ذَلِكَ، فَفَعَلَ الْوَكِيلُ مَا أَمَرَهُ بِهِ مِنْ ذَلِكَ أَنْ ذَلِكَ جَازَ عَنْهُ مِنَ الرَّقَبَةِ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِ، وَقَدْ كَانَتْ الْوَكَاِلَةُ مِنْهُ فِيهَا قَبْلَ أَنْ يَمْلِكَهَا فَلَمْ يَضُرَّهُ ذَلِكَ، وَرُوعِي وَقْتُ وَقُوعِ عَتَاقِهَا عَلَيْهَا، وَلَمْ يُرَاعَ تَوَكُّلُهُ بِذَلِكَ قَبْلَ مَلِكِهِ إِيَّاهَا. (شرح مشکل الآثار: ۲/۱۳۲)

اقوال الفقہاء:

صاحب موسوعۃ الفقہیہ نے تعلیق کے صحت کے لئے دو شرطوں کا لحاظ ضروری قرار

دیا ہے:

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ معلق علیہ گرچہ فی الوقت معدوم ہو؛ لیکن مستقبل میں اس کا وجود ممکن ہو، تو وہ تعلیق منعقد ہوگی؛ لیکن اگر اس کا وجود محال ہو، تو وہ تعلیق لغو ہو جائے گی۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ معلق علیہ کے وجود کا علم ہو سکتا ہو، ورنہ وہ لغو ہوگی، جیسے مشیۃ الہی پر طلاق کو معلق کرنا، ظاہر ہے اس کا علم ممکن نہیں، اس لئے یہ تعلیق لغو ہوگی۔

شروط التعلیق: یشرط لصحة التعلیق أمور:

الأول: ان یکون المعلق علیہ امرًا معدوماً علی خطر الوجود أي مترددًا بین أن یکون وأن لا یکون، فالتعلیق علی المحقق تنجیز، وعلی المستحیل لغو.

الثانی: أن یکون المعلق علیہ أمرًا یرجى الوقوف علی وجوده، فتعلق التصرف علی امر غیر معلوم لا یصح، فلو علق الطلاق مثلاً علی مشیۃ اللہ تعالیٰ بأن قال لامرأته: أنت طالق ان شاء اللہ، فان الطلاق لا یقع اتفاقاً لأنه علقه علی شیء لا یرجى الوقوف علی وجوده۔ (الموسوعة الفقهیة: الكويتیة: ۲/۱۰۷۳)



باب :- ۹۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيمَنْ اسْتَلْجَجَ بِيَمِينِ عَلَى أَهْلِهِ

﴿بیمین (قسم) کا بیان﴾

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "مَنْ اسْتَلْجَجَ بِيَمِينِ عَلَى أَهْلِهِ فَهُوَ أَعْظَمُ إِنَّمَا" يَعْنِي الْكُفَّارَةَ. (شرح مشکل الآثار: ۱۴۴/۲، ورواه البخاری: (۶۶۲۶)، وابن ماجه: (۲۱۱۳))

خلاصہ الحدیث:

بیمین کے مشروع ہونے کی دلیل قرآن اور حدیث دونوں میں ہے، سورہ نحل کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ قسم کو مؤکد کرنے کے بعد نہ توڑو (نحل: ۹۱) ایک جگہ پر قسم کے خلاف ورزی کرنے پر کفارہ واجب قرار دیا ہے، (بقرہ: ۲۲۵)۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی احادیث میں قسم کی اہمیت و عظمت کو واضح کیا ہے، نیز یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر میں کسی بات کی قسم کھا لیتا ہوں اور دوسری بات کو اس سے بہتر پاتا ہوں، تو اس میں بہتر کام کو کر کے قسم توڑ لیتا ہوں۔

(مسلم شریف: رقم الحدیث: ۱۶۴۹-ص: ۷۷۷)

الغرض مخلوف علیہ کے اعتبار سے حالف پر کبھی قسم کو پورا کرنا واجب ہوتا ہے، تو کبھی مستحب اور کبھی حرام ہوتا ہے، تو کبھی مکروہ، اس لئے اگر کسی نے ایسی بات کی قسم کھائی ہے، جس کو پورا کرنے میں گناہ لازم ہونے کا اندیشہ ہے، تو اس پر واجب ہے کہ اسے پورا نہ کرے؛ بل کہ

اس کا پورا کرنا باعث حرام ہوگا، جیسا کہ اس باب میں حضرت ابو ہریرہؓ اور ابن عباسؓ کی روایت میں مذکور ہے؛ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر قسم کھائے کہ وہ اس کے قریب نہیں جائے گا، تو اس پر واجب ہے کہ وہ اپنی قسم سے رجوع کرے، کیونکہ اس کے ذریعہ اپنی بیوی کے حق کو تلف کرنے والا ہوگا۔

امام طحاویؒ نے حدیث کے اس معنی کی وضاحت کے بعد استدلال کے طور پر ایلاء والی آیت کو بطور نظیر کے پیش کیا ہے۔

﴿الَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصًا أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ﴾ (البقرة: 226) إِلَى قَوْلِهِ:
﴿سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (البقرة: 227).

جو کوئی اپنی بیوی سے ایلاء کرے کہ وہ چار مہینے اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھائے پھر وہ اپنی قسم سے رجوع کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

الغرض آیت مذکورہ میں جس طرح قسم سے رجوع کرنے پر اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور مہربانی کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، اسی طرح حدیث الباب میں اگر حالف اپنے یمین سے رجوع کر لیتا ہے، تو یہ اس کے حق میں باعث رحمت ہے، بل کہ وہ کفارہ کے قائم مقام ہوگا۔

فَذَكَرَ فِي الْفَيْءِ الرَّحْمَةَ وَالْغُفْرَانَ لِرُجُوعِ الْفَائِي عَنْ مَنَعِ الْحَقِّ الَّذِي هُوَ عَلَيْهِ يَمِينُهُ
الَّتِي كَانَتْ مِنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۱۳۵/۲)

نیز امام طحاویؒ نے قول رسولؐ ”فِيمَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ فِي قَطِيعَةِ رَحِمٍ، أَوْ فِي مَعْصِيَةٍ سِوَى ذَلِكَ“ کی بنا پر حالف پر قسم کو توڑنا ضروری قرار دیا ہے؛ مگر اس پر کوئی کفارہ لازم نہیں کیا ہے، اس کے ترک یمین حنث (کو کفارہ کے قائم مقام قرار دیا ہے اور اس کا استدلال حضرت ابن عباسؓ کی حدیث سے کیا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَفَعَهُ قَالَ: "مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ قَطِيعَةٍ أَوْ مَعْصِيَةٍ فَحَنِثَ فَذَلِكَ كَفَّارَةٌ". (شرح مشکل الآثار: ۱۴۶/۲)

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: أَيُّ لَأَنَّ حِنْثَهُ فِيهَا رُجُوعٌ عَمَّا كَانَ حَلَفَ بِهَا عَلَيْهِ فَرُجُوعُهُ عَنْ ذَلِكَ كَفَّارَةٌ لَهُ. (شرح مشکل الآثار: ۱۴۶/۲)

چنانچہ امام شعبیؒ بھی اس صورت میں کفارہ کے وجوب کے قائل نہیں ہیں۔

وقال الشعبي : لاتجب الكفارة المعهودة في اليمين على المعاصي... ولان الكفارة شرعت لرفع الذنب والحنث في هذا اليمين ليس بذنب، لانه واجب، فلا تجب الكفارة لرفع الذنب ولا ذنب۔ (بذل المعهود: ۱۷۵/۸)

توجیہ:

چونکہ یمین یا قسم کھانے والا حدیث الباب کے مطابق جب اپنے قسم پر اڑا رہتا ہے، اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے، تو اس میں جہاں ایک طرف اپنے اہل و عیال کو اس کے حق سے محروم کرنا لازم آتا ہے (جو اس حالف) پر واجب ہے) تو دوسری طرف وہ معصیت الہی کا سبب بھی، اس لئے اس یمین سے رجوع کرنا (یعنی اس یمین کو پورا نہ کرنا) ہی اس حنث کا کفارہ ہے۔

فَمِثْلُ ذَلِكَ أَيْضًا مَا رَوَيْنَاهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ هُوَ أَيْضًا مِنْ هَذَا الْجَنَسِ؛ لِأَنَّ الْحَالِفَ عَلَى أَهْلِهِ يَمْنَعُهَا حَقَّهَا الَّذِي لَهَا عَلَيْهِ عَاصٍ لِرَبِّهِ تَعَالَى، وَكَفَّارَتُهُ مِنْ تِلْكَ الْمَعْصِيَةِ رُجُوعُهُ عَنْهَا. (شرح مشکل الآثار: ۱۴۶/۲)

امام طحاویؒ کی یہ توجیہ جمہور کے نقطہ نظر کے مطابق ہے، یعنی ان حضرات کے نزدیک بھی وہ یمین یا قسم جو قطع رحم یا معصیت الہی کا سبب ہے، تو اس کا پورا کرنا واجب نہیں؛ بل کہ اس کا ترک واجب ہے، نیز ترک یمین پر کوئی کفارہ بھی واجب نہیں۔

وأما اذا انذر الانسان معصية مثل للهِ عليّ أن أشرب الخمر وأقتل فلانا أو اضربه واشتمه ونحوه فلا يجوز الوفاء به اجماعاً، لقوله عليه السلام "لا نذر في معصية الله".
(الفقه الإسلامي وادلته: ۲۸۲/۳)

اقوال المحدثين:

علامہ مفتی ظفر احمد عثمانی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

وقال الحافظ في الفتح: واختلف فيمن وقع منه النذر في ذلك أي في المعصية هل يجب فيه كفارة، فقال الجمهور: لا. (اعلاء السنن: ۱/۱۱۰، ط: ادارة القرآن والاسلميه، كراچي)

لیکن ائمہ احناف میں سے امام طحاوی کے علاوہ سبھوں کے نزدیک مذکورہ صورت (یعنی جب یمین یا قسم باعث قطع رحم یا معصیت الہی کا سبب ہو) میں یمین منعقد ہو جاتی ہے؛ لیکن اس کو پورا کرنا واجب نہیں ہے، تاہم حنث کی وجہ سے حالف پر یمین کا کفارہ ادا کرنا واجب ہے جیسا کہ اعلاء السنن میں ہے:

وعن احمد (وهو الصحيح من مذهبه كما صرح به الموفق في المغنی: ۱/۱۱۵) والثوري واسحاق وبعض الشافعيين والحنفية (كلهم): نعم. (یعنی ان حضرات کے نزدیک مذکورہ صورت میں کفارہ واجب ہوگا۔) (حوالہ سابق)

علامہ خطابی لکھتے ہیں:

فيكون معناه فلا يبر في يمينه لكن يحنث ويكفر. (بذل لمجهود: ۱۷۳/۸)

اسی طرح ڈاکٹر وہب زہلی کی عبارت (جو حدیث رسول ﷺ سے ماخوذ ہے) سے احناف کے نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

قال الحنفية والحنابلة يجب على ناذر المعصية كفارة يمين لا فعل المعصية
بدليل حديث عمران بن حصين وابى هريرة الثابت عن النبي ﷺ أنه قال: لا نذر في
معصية الله فكفارة يمين. (الفقه الإسلامي وأدلته: ۳/۳۸۲)

حافظ ابن حجرؒ بھی اس صورت میں حالف پر کفارہ یمین کی ادائیگی کو ضروری قرار دیتے
ہیں۔

والمراد انه يترك اللجاج فيما حلف ويفعل المحلوف عليه ويحصل له البر بآداء
الكفارة عن اليمين الذي حلفه اذا حنث. (فتح الباری: ۱۳/۳۶۶)

اشکال:

یہاں امام طحاویؒ کے استدلال پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کی
حدیث سے رجوع عن الیمین کا معنی کیسے اخذ کیا ہے؟ حالانکہ اس حدیث میں رجوع اور فنی کا لفظ
موجود نہیں ہے؟

”فان قال قائل: فليس في الحديث رجوعه ولا فيثه“. (شرح مشکل الآثار: ۲/۱۴۶)

جواب:

چوں کہ قرآن مجید کی طرح حدیث نبوی ﷺ کے مخاطب اصلاً اہل عرب تھے، جنکی
زبان عربی تھی، عربی زبان پر نہ صرف انہیں قدرت و کمال حاصل تھا؛ بل کہ اس زبان کی فصاحت
و بلاغت اور علم البیان کی لطیف اور باریک باتوں سے پورے طور پر واقف تھے، نیز سیاق
و سباق اور خطاب کے تقاضے سے بھی، اس لئے اس حدیث میں رجوع اور فنی کو ذکر کرنے کی
ضرورت نہیں پڑی۔

فَكَانَ جَوَابًا لَّهُ فِي ذَلِكَ أَنَّ ذَلِكَ الْخِطَابَ الَّذِي كَانَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلنَّاسِ خِطَابٌ عَرَبِيٌّ خَاطَبَ بِهِ قَوْمًا عَرَبًا، فَكَانَ فِيْمَا خَاطَبَهُمْ بِهِ مِنْ ذَلِكَ مَا قَدْ فَهِمُوا بِهِ عَنَّهُ مُرَادُهُ، وَهُوَ الَّذِي ذَكَرْنَا فَاعْنَاهُ ذَلِكَ عَنْ كَشْفِهِ إِيَّاهُ لَهُمْ بِلِسَانِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۳۶/۲)

نظیر:

جس طرح قرآن مجید (سورہ نور کی آیت: ۱۰) اور سورہ رعد کی آیت: ۳۱، میں شرط ذکر کی گئی ہے، مگر اس کا جواب نہیں ذکر کیا گیا ہے۔

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ، وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ﴾ (النور: ۱۰)

﴿وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ، أَوْ قُطِعَتْ بِهِ الْأَرْضُ، أَوْ كَلِمَةٌ بِهِ الْمَوْتَى بَلَّ اللَّهُ الْأُمُورَ جَمِيعًا﴾ (الرعد: ۳۱)

کیوں کہ اس کے مخاطب اصل عرب تھے، جواب اس کے سامنے عیاں تھا، اس لئے اس کا جواب نہیں ذکر کیا گیا۔

مِنْ غَيْرِ ذِكْرِهِ لِمَا كَانَ يَكُونُ لَوْ كَانَ مِنْ أَنْ يَفْعَلَ ذَلِكَ لِفَهُمِ الْمُخَاطَبِينَ بِذَلِكَ لِمَا قَدْ أَرَادَ أَنْ يَفْهَمُوهُ عَنَّهُ بِذَلِكَ الْخِطَابِ الَّذِي خَاطَبَهُمْ بِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۳۷/۲)



باب :- ۹۸

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي تَعْبِيرِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ بِأَمْرِهِ الرَّؤْيَا
الَّتِي عَبَّرَهَا، وَمِنْ قَوْلِهِ لَهُ فِي عِبَارَتِهِ أَيَّهَا: "أَصَبَتْ بَعْضًا، وَأَخْطَأَتْ بَعْضًا"

﴿ خواب کی تعبیر کا بیان ﴾

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُثْبَةَ، أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ كَانَ يُحَدِّثُ أَنَّ رَجُلًا أَتَى رَسُولَ
اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أَرَى اللَّيْلَةَ فِي مَنَامِي ظُلَّةً تَنْطِفُ السَّمْنَ، وَالْعَسَلَ،
فَأَرَى النَّاسَ..... (شرح مشکل الآثار: ۱۳۸/۲، ورواه البخاری: (۷۰۰۰)، ومسلم: (۲۲۹۶)، وابن
حبان: (۱۱۱))

خلاصہ الحدیث:

خواب کی بڑی اہمیت ہے، اس کا انکار درست نہیں، چونکہ حدیث میں ہے کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے؛ لیکن روایا صالحہ باقی ہے، جیسے صالح مؤمن دیکھتا
ہے، اور قرآن کریم میں "وَلَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" میں "البُشْرَىٰ" سے سچا خواب ہی
مراد ہے، سورہ یوسف میں "وَيُعَلِّمُكَ مِنَ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ" سے خواب کی تعبیر کا ملکہ حضرت
یوسفؑ کو اللہ نے عطا کیا تھا وہ مراد ہے، اسی وجہ سے دیگر جمیلی احباب پر انہیں ترجیح حاصل ہوئی،
بہر حال خواب اچھا بھی ہوتا ہے، اس لئے نیک لوگوں سے اس کی تعبیر معلوم کرنا چاہئے۔

چنانچہ اس باب کی پہلی روایت میں ایک صحابی نے خواب دیکھا جس کی تعبیر کیلئے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت ابو بکرؓ نے اس کے خواب کی تعبیر بیان کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”أَصَبْتَ بَعْضًا، وَأَخْطَأْتَ بَعْضًا“۔

گرچہ حدیث الباب سے یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکرؓ سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ اللہ کی قسم کے واسطہ سے تعبیری غلطی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ”لا تُقسم“ آپ قسم مت کھائیں۔

لیکن یہاں بحث یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ سے خواب کی تعبیر بتانے میں کیا غلطی ہوئی؟ جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشاندہی فرمائی۔

تعبیر کے بتانے میں غلطی یہ ہوئی کہ حضرت ابو بکرؓ نے بادل سے ٹپکنے والا گھی اور شہد دونوں سے قرآن مجید مراد لیا، اور اس کو دو اوصاف (حلاوت اور لین) سے متصف کیا، اس کو امام طحاویؒ نے اس طرح ذکر کیا ہے:

فَتَأَمَّلْنَا مَا فِي هَذِهِ الْعِبَارَةِ الْمَذْكُورَةِ فِي هَذَا الْحَدِيثِ مِنَ الْخَطِئِ الَّذِي أَخْبَرَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبَا بَكْرٍ أَنَّهُ كَانَ مِنْهُ فِيهَا.

فَوَجَدْنَا فِيهَا أَنَّهُ جَعَلَ السَّمْنَ، وَالْعَسَلَ الْمَذْكُورَيْنِ فِيهَا شَيْئًا وَاحِدًا، وَهُوَ الْقُرْآنُ ثُمَّ وَصَفَهُ بِالْحَلَاوَةِ وَاللَّيْنِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۵۱/۲)

اقوال المحدثین:

حالانکہ حضرت ابو بکرؓ کی یہ تعبیر عام اہل علم کی تعبیر سے مختلف ہے، کیونکہ ان لوگوں نے سمن و عسل (گھی اور شہد) سے صرف قرآن کریم ہی مراد نہیں لیا ہے؛ بل کہ دونوں سے دو چیزیں مراد لی ہیں، یعنی سمن سے قرآن مراد لیا ہے، اور عسل سے توراہ۔

امام طحاویؒ نے اہل علم کے اقوال اور نظریے کو اس طرح ذکر کیا ہے:

وَوَجَدْنَا أَهْلَ الْعِلْمِ بِالْعِبَارَةِ يَدْهَبُونَ إِلَىٰ أَنْهُمَا شَيْئَانِ، كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا غَيْرُ صَاحِبِهِ مِنْ أَصْلَيْنِ مُخْتَلِفَيْنِ، وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ رَدَّهُمَا إِلَىٰ أَصْلِ وَاحِدٍ، وَهُوَ الْقُرْآنُ وَإِنْ كَانَ قَدْ جَعَلَ مِنْ صِفَتِهِمَا اللَّيْنُ وَالْحَلَاوَةُ، فَإِنَّ ذَلِكَ لَا يَمْنَعُ أَنْ يَكُونَ صِفَةً لِشَيْءٍ وَاحِدٍ. (شرح مشکل الآثار: ۱۵۲/۲)

اور اہل علم کی رائے کی تائید میں حضرت عبداللہ بن عمرو العاصؓ کی روایت کو پیش کیا ہے:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ أَنَّهُ رَأَىٰ فِي الْمَنَامِ كَأَنَّ فِي إِحْدَىٰ أُضْبُعَيْهِ عَسَلًا وَفِي الْأُخْرَىٰ سَمْنًا، وَكَأَنَّهُ يُلْعَقُهُمَا فَأَصْبَحَ، فَذَكَرَ ذَلِكَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: "تَقْرَأُ الْكِتَابَيْنِ: التَّوْرَةَ، وَالْفُرْقَانَ" قَالَ: فَكَانَ يَقْرَأُ هُمَا. (شرح مشکل الآثار: ۱۵۲/۲)

راح قول:

اس حدیث سے امام طحاویؒ اور علامہ ابن الجوزیؒ نے گرچہ غسل سے قرآن پاک اور سمن سے تورات مراد لیا ہے؛ لیکن راح اور صحیح بات یہ ہے کہ ”غسل“ سے قرآن مجید اور ”سمن“ سے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہے۔

وايد ابن الجوزي مانسب للطحاوي بما اخرجہ احمد عن عبد الله بن عمرو والعاص. (فتح الباری: ۴/۱۴۷۷)

اور مفتی تقی صاحب عثمانی نے ابن التین اور امام طحاویؒ کے قول کو اس طرح تحریر کیا ہے:

وقال: ابن التين والطحاوي: موضع خطأه تفسيره العسل والسمن كليهما بشيء واحد، وهو القرآن وكان يناسب أن يفسر العسل بالقرآن والسمن بالسنة، وايداه الخطيب يقول أهل التعبير وبه جزم ابن العربي. (تكملة فتح الملهم شرح مسلم: ۱۰/۳۰۳)



باب :- ۹۹

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا زَوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي حَدِيثِ الظُّلَّةِ الَّذِي ذَكَرْنَا فِي الْبَابِ الَّذِي قَبْلَ هَذَا الْبَابِ مِنْ قَوْلِهِ لِأَبِي بَكْرٍ فِيهِ: "لَا تُقْسِمُ" هَلْ هُوَ لِكِرَاهِيَةِ الْقَسَمِ أَمْ لِمَا سِوَى ذَلِكَ؟ (شرح مشكل الآثار: ۱۵۳/۲)

﴿ قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم "لا تُقْسِمُ" کا مفہوم ﴾

خلاصہ الحدیث:

اس باب کا تعلق سابقہ باب سے ہے، جس میں یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک شخص کے خواب کی تعبیر بیان کی اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عرض کیا تھا "أَصَبْتَ أَوْ أَخْطَأْتَ" نیز جب حضرت ابو بکرؓ نے قسم کا جملہ بھی استعمال کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "لا تُقْسِمُ" کے ذریعہ قسم کھانے سے منع فرمایا، یہاں بحث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کراہیت قسم کی بنا پر قسم کھانے سے منع فرمایا تھا یا کسی اور وجہ سے؟

جیسا کہ اس سلسلہ میں امام طحاوی نے اس باب کی پہلی فصلی میں قسم سے متعلق درج ذیل آیات پیش کی ہیں:

﴿لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (القيامة: 2)

﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ﴾ (الواقعة: 75)

﴿إِذَا قَسِمُوا بِالنِّبْرِ الْمُتَمِّصِ مِنْهَا مُصْبِحِينَ وَلَا يَسْتَثْنُونَ﴾ (القلم: 17)

سورہ قیامہ اور واقعہ کی آیت میں ”لا“ زائدہ ہے، دونوں میں قسم کا تذکرہ ہے، اسی طرح سورہ قلم کی آیت میں بھی، اس لئے ان آیات سے قسم کا ثبوت ملتا ہے، چوں کہ تیسری آیت میں گرچہ ترک استثناء پر تشبیہ کی گئی ہے؛ مگر قسم کھانے پر کوئی نکیر نہیں کی گئی ہے، اس لئے اس آیت سے بھی قسم کی اباحت ثابت ہوتی ہے۔

وَكَانَ الَّذِي يَنْبَغِي لَهُمْ فِي ذَلِكَ أَنْ يَصِلُوهُ بِالرَّدِّ إِلَى مَشِيئَةِ اللَّهِ تَعَالَى فَلَمْ يُنَكِرْ عَلَيْهِمْ قَسَمَهُمْ، وَأَنْكَرَ تَرَكُهُمْ تَعْلِيْقَ ذَلِكَ إِلَى مَشِيئَةِ اللَّهِ فِيهِ (شرح مشکل الآثار: ۱۵۵/۲)

اسی طرح امام طحاویؒ نے متعدد طرق سے رسول اللہ ﷺ کی حدیث پیش کی ہے جس میں یہ بات ذکر ہے:

”لو أقسم على الله لأبره“ کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی قسم کے ساتھ کوئی بات کہتا ہے تو اللہ اسے ضرور پورا کرتے ہیں۔

بہر حال امام طحاویؒ نے دوسری فصل میں جو روایات پیش کی ہیں، ان سے یہ بات عیاں ہے کہ قسم کی اباحت حدیث سے بھی ثابت ہے۔

فَعَقَلْنَا بِمَا تَلَوْنَا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَبِمَا رَوَيْنَا مِنْ آثَارِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِبَاحَةَ الْقَسَمِ؛ لِأَنَّ الْقَسَمَ لَوْ كَانَ مَكْرُوهًا لَكَانَ مُسْتَعْمَلُهُ عَاصِيًا وَلَمَّا أَبْرَأَ اللَّهُ قَسَمَهُ..... (شرح مشکل الآثار: ۱۶۰/۲)

الغرض امام طحاویؒ کی پیش کردہ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے یہ بات واضح و آشکار ہو گئی کہ قسم کھانا مباح ہے۔

اشکال:

اگر قسم کی اباحت قرآن و حدیث سے ہے، تو پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو ”لا تقسم“ کے ذریعہ کیوں منع فرمایا؟

فَقَالَ قَائِلٌ: فَمَا مَعْنَى قَوْلِهِ لِأَبِي بَكْرٍ حِينَ أَقْسَمَ عَلَيْهِ "لَا تُقْسِمُ"؟

(شرح مشکل الآثار: ۱۶۰/۲)

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر کو "لَا تُقْسِمُ" اس لئے نہیں کہا کہ قسم مباح نہیں ہے؛ بل کہ حضرت ابو بکر نے خواب کی صحیح تعبیر جاننے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو استفسار کیا تھا اور اس کے لئے جو قسم کھایا تھا، اس کی تردید کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "لَا تُقْسِمُ" فرمایا، کیوں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا خواب کی تعبیر پر کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ انبیاء کے خواب صواب پر مبنی ہوتے ہیں؛ لیکن غیر انبیاء کے خواب ظنی ہوتے ہیں، جیسا کہ امام طحاوی نے ذکر کیا ہے:

"قِيلَ لَهُ: إِنَّ قَسَمَ أَبِي بَكْرٍ كَانَ عَلَيْهِ لِيُخْبِرَهُ بِحَقِيقَةِ الْخَطَأِ مِنْ حَقِيقَةِ الصَّوَابِ، وَكَانَ ذَلِكَ غَيْرَ مَوْضُوعٍ إِلَيْهِ فِي ذَلِكَ الْمَعْنَى؛ لِأَنَّ الْعِبَارَةَ إِنَّمَا هِيَ بِالظَّنِّ وَالتَّحْرِي لَا بِمَا سِوَاهُمَا..... (شرح مشکل الآثار: ۱۶۰/۲)

اقوال المحدثين:

امام نووی کے حوالہ سے صاحب تحفة الباری لکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر نے دراصل خواب کی صحیح تعبیر جاننے کے لئے قسم کھایا تھا؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح تعبیر بتانے سے اعراض اس لئے کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعبیر بتا دیتے، تو آئندہ جو واقعات و حادثات رونما ہونے والے ہیں مثلاً رسی کے ٹوٹنے سے ولایت عثمان کا زوال اور اسی کے جڑنے سے حضرت علی کے قبضہ میں زمام خلافت کی آمد مراد ہے، جیسا کہ شارح بخاری نے "فتح الباری" میں ذکر کیا ہے (۴۷۶/۱۳)، ان پر صحابہ کرام واقف ہو جاتے، پھر فتنہ اور فساد کی صورت پیدا ہو جاتی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح تعبیر نہیں بتائی اور حضرت ابو بکر کو قسم کھانے سے منع فرمایا۔

(قال لا تُقسِم) قال النووی وانما لم یبر النبی ﷺ قسم أبی بکر، لأن أبرار القسم مخصوص بما إذا لم یکن هناك مفسدة، ولا مشقة ظاهرة، قال: ولعل المفسدة فی ذلك ما علمه من انقطاع السبب بعثمان وهو قتله وتلك الحروب والفتن المرتبة علیه فکرها ذکرها خوف شیوعها. (تحفة الباری بشرح صحیح البخاری: ۶/۲۳۳، ط: دار الکتب العلمیة بیروت)

مفتی تقی عثمانی صاحب اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے کسی مصلحت کی بنا پر کسی بات کو مخفی رکھا ہے، تو اس میں بال کا کھال نکالنے کے لئے تعرض کرنا درست نہیں۔

والوجه الثانی: ان النبی ﷺ اعرض عن بیان وجه الخطاء مع طلب ذلك من سيدنا أبی بکر رضي الله عنه، وما ذلك الا لأنه ﷺ رأى مصلحة في اخفائه، وليس لنا أن نتعرض لما أخفا رسول الله ﷺ عن قصد وعمد. (تكملة فتح الملهم بشرح صحیح مسلم: ۱۰/۴۰۳، المكتبة الاشرفية، ديوبند)

الغرض محدثین کی توجیہات سے یہ بات واضح ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ بالا وجوہات و مصالِح کی بنا پر حضرت ابو بکرؓ کو قسم کھانے سے منع فرمایا، نہ کہ اس وجہ سے کہ قسم کھانا مباح نہیں ہے، جیسا کہ امام طحاویؒ نے اس بات کی اخیر بحث میں وضاحت کی ہے۔

فَدَلَّ ذَلِكَ عَلَى أَنَّ مَعْنَى مَا كَانَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي ذَلِكَ الْحَدِيثِ مِنْ قَوْلِهِ لِأَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: "لَا تُقْسِمُ" لَمْ يَكُنْ مَعْنَاهُ عِنْدَ ابْنِ عَبَّاسٍ أَيْضًا عَلَى كَرَاهِيَةِ الْقَسَمِ، وَلَكِنْ لِلْمَعْنَى الَّذِي ذَكَرْنَا، وَاللَّهُ تَعَالَى نَسَّأَلُهُ التَّوْفِيقَ.

(شرح مشکل الآثار: ۲/۱۶۲)



باب :- ۱۰۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ:
 ”الرُّؤْيَا عَلَى رَجُلٍ طَائِرٌ مَا لَمْ تُعْبَرْ فَإِذَا عُبِّرَتْ سَقَطَتْ“

﴿تعبیر سے پہلے خواب کی حیثیت کا بیان﴾

عَنْ يَعْلَى بْنِ عَطَاءٍ قَالَ: سَمِعْتُ وَكَيْعَ بْنَ حَدَّسٍ، يُحَدِّثُ عَنْ عَمِّهِ أَبِي رَزِينِ الْعَقِيلِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”الرُّؤْيَا عَلَى رَجُلٍ طَائِرٌ مَا لَمْ تُعْبَرْ، فَإِذَا عُبِّرَتْ سَقَطَتْ وَلَا يَقْضُهَا إِلَّا عَلَى حَبِيبٍ، أَوْ لَيْبٍ، أَوْ ذِي مَوَدَّةٍ“ . (شرح مشکل الآثار:

۶۳/۲، ورواه الترمذی: (۲۲۷۸)، وأبو داود الطيالسی فی ”مسنده“: (۱۰۸۸))

خلاصہ الحدیث:

خواب غیر معمولی اہمیت کے حامل ہے، اور اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) روئے صالحہ یعنی سچے خواب، یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرد مؤمن کے لئے بشارت ہوتے ہیں، (۲) دوسرا خواب وہ ہوتا ہے، جو شیطان کی طرف سے رنج و غم میں مبتلا کرنے والا ہوتا ہے، (۳) تیسرا وہ خواب ہوتا ہے کہ انسان جو باتیں دل میں سوچتا ہے، تو یہ خواب اسی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ (ابوداؤد شریف: ۶۸۵/۲) بہر حال انبیاء کرام کا خواب حجت ہے اور وحی کے درجہ میں ہے؛ لیکن مؤمنین کا خواب حجت نہیں؛ تاہم بشارت الہی اور فیضان ربانی کا ذریعہ ضرور ہے، اس لئے اس باب کی پہلی حدیث میں خواب کو پرندہ کے پیر سے تشبیہ دی ہے، عرب میں یہ محاورہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے کہ جس طرح پرندہ میں قرار نہیں ہوتا ہے، اسی طرح خواب میں بھی؛ لہذا جیسے ہی کوئی نیک

صالح شخص کے ذریعہ اس کی تعبیر معلوم کر لی جاتی ہے، تو تعبیر کے مطابق وہ واقع ہو جاتا ہے، بہر حال امام طحاویؒ نے اس مضمون کو اس باب کی پہلی روایت میں ذکر کیا ہے۔

اشکال:

حدیث الباب میں ”الرُّؤْيَا عَلَى رَجُلٍ طَائِرٍ مَا لَمْ تُعَبَّرَ“ (خواب تعبیر سے پہلے پرندہ کے پیر پر معلق رہتا ہے) اس کا کیا مفہوم ہے؟

جواب:

اس کا جواب امام طحاویؒ نے اس طرح پیش کیا ہے کہ خواب تعبیر سے پہلے ہو میں معلق ہوتا ہے، باقی رہتا ہے، نیز اس سے پہلے اس پر عمل نہیں ہوتا ہے؛ لیکن جیسے ہی اس کی تعبیر کی جاتی ہے فوراً وہ عمل میں آجاتا ہے، اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور تشبیہ کے ”علی رجل طائر“ سے تعبیر کیا ہے، گویا کہ تعبیر سے پہلے غیر مستقر رہتا ہے۔

أَنَّهُ قَدْ يُحْتَمَلُ أَنْ تَكُونَ الرُّؤْيَا قَبْلَ أَنْ تُعَبَّرَ مُعَلَّقَةً فِي الْهَوَاءِ غَيْرَ سَاقِطَةٍ، وَغَيْرَ عَامِلَةٍ شَيْئًا حَتَّى تُعَبَّرَ، فَإِذَا عُبِّرَتْ عَمِلَتْ حِينَئِذٍ وَذَكَرَهَا، بِأَنَّهَا عَلَى رَجُلٍ طَائِرٍ أَيْ أَنَّهَا غَيْرُ مُسْتَقَرَّةٍ،.... (شرح مشکل الآثار: ۱۶۴/۲)

نظیر:

یہاں امام طحاویؒ نے تعبیر سے پہلے خواب کی تمثیل اس مسافر شخص سے دی ہے، جو اپنے عدم استقرار کو حالت سفر میں اس طرح عکاسی کرتا ہے ”انا علی جناح طیر“ (میں پرندہ کے پیر ہوں) یہاں تک وہ سفر کو انقطاع کر کے مقیم ہو جاتا ہے، اور ایک جگہ پر قرار اختیار کر لیتا ہے، لیکن اقامت کی نیت سے پہلے جس طرح وہ غیر مستقر رہتا ہے، اسی طرح خواب تعبیر سے پہلے

غیر مستقر رہتا ہے۔

وَمِثْلُ ذَلِكَ قَوْلُ الرَّجُلِ: أَنَا عَلَى جَنَاحِ طَيْرٍ إِذَا كَانَ فِي سَفَرٍ أَيْ أَنِّي غَيْرُ مُسْتَقَرٍّ حَتَّى أَخْرُجَ مِنْ سَفَرِي فَأَسْتَقِرَّ فِي مَقَامِي. (شرح مشکل الآثار: ۱۶۳/۲)

دوسرا اشکال:

حضرت ابو بکرؓ نے جب حدیث الظلمہ میں خواب کی ایسی تعبیر کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”اصبت بعضاً، واخطأت بعضاً“ فرمایا، تو یہاں اشکال یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے اس کی تعبیر میں ایسی کیا غلطی کی؟ جو عمل کے لئے موزوں نہیں تھی؟

فَقَالَ هَذَا الْقَائِلُ: فَقَدْ عَبَّرَ أَبُو بَكْرٍ فِي حَدِيثِ الظُّلْمَةِ تِلْكَ التَّرْوِيَا الْمَذْكُورَةَ فِيهَا، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "أَصَبْتَ بَعْضًا، وَأَخْطَأْتَ بَعْضًا" فَكَانَ مَعْقُولًا أَنَّ مَا كَانَ مِنْ ذَلِكَ خَطَأً غَيْرَ عَامِلٍ فِيمَا عَبَّرَ مِنْ تِلْكَ التَّرْوِيَا مَا عَبَّرَهُ مِنْهَا عَلَيْهِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۶۳/۲)

جواب:

امام طحاویؒ نے اس اشکال کے جواب میں قلمبند کرتے ہیں کہ وہ خواب مؤثر اور قابل عمل ہوتا ہے، جس کی تعبیر بیان کی جاتی ہے، پھر اس تعبیر پر عمل ہوتا ہے، جو اُصوب الی الحق ہوتا ہے۔

نیز انہوں نے خواب کی مزید دو صورتیں ذکر کی ہیں، جن میں سے ایک صورت دوسری صورت کے مقابلہ میں اولیٰ ہوتی ہے، بہر حال اس میں دونوں شکلوں کا احتمال ہے، مگر جب معبر ایک صورت کے اعتبار سے تعبیر بیان کر دیتا ہے، تو وہی تعبیر دراصل اس کی تعبیر ہوتی ہے اور دوسری صورت منثقی ہو جاتی ہے۔

فَكَانَ جَوَابِنَالَهُ فِي ذَلِكَ أَنَّ الْعِبَارَةَ إِنَّمَا يَكُونُ عَمَلُهَا فِي الرَّؤْيَا، إِذَا عُبِّرَتْ بِهَا إِنَّمَا
تَكُونُ تَعْمَلُ إِذَا كَانَتْ الْعِبَارَةُ صَوَابًا، أَوْ كَانَتْ الرَّؤْيَا تَحْتَمِلُ وَجْهَيْنِ اثْنَيْنِ، وَاحِدٌ مِنْهُمَا
أَوَّلَى بِهَا مِنَ الْآخِرِ فَتَكُونُ مُعَلَّقَةً عَلَى الْعِبَارَةِ الَّتِي تَرُدُّهَا إِلَى أَحَدِهِمَا حَتَّى تُعْبَرَ عَلَيْهِ، وَتُرَدُّ
إِلَيْهِ فَتَسْقُطَ بِذَلِكَ وَتَكُونَ تِلْكَ الْعِبَارَةُ هِيَ عِبَارَتُهَا وَيُنْتَفِي عَنْهَا الْوَجْهُ الْآخِرُ الَّذِي قَدْ كَانَ
مُحْتَمَلًا لَهَا، وَاللَّهُ نَسَأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشكل الآثار: ۲/ ۱۶۳)



باب :- ۱۰۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الْأَشْيَاءِ الَّتِي هِيَ الْفِطْرَةُ فِي

الْأَبْدَانِ، أَوْ مِنَ الْفِطْرَةِ

﴿فطرت کا معنی اور مفہوم کا بیان﴾

عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: ”الْفِطْرَةُ قَصُّ الْأَخْفَارِ، وَأَخْذُ

الشَّارِبِ وَحَلْقُ الْعَانَةِ“ (شرح مشکل الآثار: ۲/۶۵۱، ورواه البخاری: (۵۸۸۸)، والسنائي: ۱/۵۷۱،

وأحمد: ۱۱۸/۲)

یقیناً مذہب اسلام کی آمد خیر و بھلائی کو عام کرنے کے لئے ہوئی ہے، جو انسان کو مضبوطی کے ساتھ اس فطرت کو تھامنے کی دعوت دیتا ہے، جس پر انسان کی تخلیق واقع ہوئی ہے، یہ طبعی وہ اوصاف ہیں جنہیں ذوق سلیم کے حامل اشخاص فوراً قبول کرتے ہیں، اور سنن نبویہ سے متعلق امور فطرت کو اختیار کرنے کی ترغیب و تحریض کرتے ہیں، جیسا کہ اس باب کی تمام احادیث (حضرت عمر، حضرت ابو ہریرہ، عمار بن یاسر، حضرت عائشہ رضوان اللہ اجمعین) سے یہ بات عیاں ہے۔

بہر حال یہاں ”فطرۃ“ کی تفسیر و تشریح میں علماء کا اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ نے اس سے دین مراد لیا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَطَرَتِ اللَّهُ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (سورہ روم: ۳۰) اس آیت میں ”فطرت“ سے دین مراد ہے، اسی طرح فطرت سے فطرۃ سلیمہ اور

طبع سلیم بھی مراد ہے، وہ دس چیزیں ہیں، جنہیں صاحب فطرت سلیمہ قبول کرتے ہیں اور اصحاب فطرۃ سلیمہ کے اولین مصداق حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔

اس سے سنت ابراہیمی بھی مراد ہے؛ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آیت کریمہ ﴿وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ﴾ (سورۃ بقرہ: ۱۲۴) میں کلمات سے یہی خصال فطرت مراد ہیں جو حدیث میں مذکور ہیں:

محدث کبیر شیخ خلیل احمد سہارن پوریؒ نے بھی فطرت کی اسی طرح توجیہ کی ہے:

”عشر من الفطرة“۔۔۔ عشر خصال من سنن الأنبياء الذين أمرنا ان نقتدى بهم، فكأننا فطرنا عليها كذا نقل عن أكثر العلماء، أو السنة الإبراهيمية عليه الصلاة والسلام أو ما فطرت الطباع السليمة من الأخلاق الحميدة، وركب في عقولهم استحسانا وهذا أظهر، أو المراد من الفطرة ”الدين“ كما قال تعالى: ﴿فَطَرَتِ اللَّهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (سورۃ روم: ۳۰) أن دين الله الذي اختاره لأول مفضل من البشر، وهذه الأفعال من توابع الدين۔ (بذل المجهود: ۳۳۵/۱) (در المنصود: ۱۶۳/۱)

تعارض:

امام طحاویؒ نے اس باب کے تحت چار احادیث ذکر کی ہیں، حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں صرف تین چیزوں (قص الاظفار، اخذ الشارب، وحلق العانة) (ناخن کاٹنا، مونچھ کتروانا، ناف کے نیچے بال کاٹنا) کو فطرت میں شمار کیا ہے، جبکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں پانچ امور کو (الأختان، والاستحداد، وقص الشارب، وتقليم الاظفار، وغسل البراجم و نشف الاباط وحلق العانة وانتقاص الماء) کو فطرت میں شامل کیا ہے الغرض تعداد کے اعتبار سے ان روایات میں تعارض واقع ہے۔

فَقَالَ قَائِلٌ: هَذَا تَضَادٌ شَدِيدٌ؛ لِأَنَّ فِي الْحَدِيثِ الْأَوَّلِ مِنْ هَذِهِ الْأَحَادِيثِ الَّتِي

رَوَيْتُمْوهَا فِي هَذَا الْكِتَابِ أَنَّ الْفِطْرَةَ هِيَ الثَّلَاثَةُ الْأَشْيَاءُ الْمَذْكُورَةَ فِيهِ، وَفِي الثَّانِي مِنْهَا أَنَّ الْفِطْرَةَ هِيَ الْأَشْيَاءُ الْخَمْسَةُ الْمَذْكُورَةَ فِيهِ، وَفِي الثَّلَاثِ، وَالرَّابِعِ مِنْهَا أَنَّ الْفِطْرَةَ الْعَشْرَةُ الْأَشْيَاءَ الْمَذْكُورَةَ فِيهَا. (شرح مشکل الآثار: ۱۶۸/۲)

جمع و تطبیق:

امام طحاوی نے اس کا جواب دیتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ اصلاً ان روایات میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ شروع میں فطرت میں صرف تین چیزیں تھیں، اس لئے پہلی حدیث میں تین چیزیں ذکر کی گئی ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اور اضافہ کیا، تو دوسری حدیث میں مزید دو چیزوں کا اضافہ ہوا، نیز تیسری اور چوتھی حدیث میں ان چیزوں کا اضافہ کیا، جو پہلی اور دوسری حدیث میں ذکر نہیں کی گئیں، پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں جسمانی اعمال میں شمار کر کے عبادت کا مقام عطا کیا۔

فَكَانَ جَوَابًا لَهُ أَنَّهُ لَا تَضَادَّ فِي شَيْءٍ مِنْ ذَلِكَ؛ لِأَنَّهُ قَدْ يَجُوزُ أَنْ تَكُونَ الْفِطْرَةُ كَانَتْ أَوَّلًا الثَّلَاثَةَ أَشْيَاءَ الْمَذْكُورَةَ فِي الْأَوَّلِ، ثُمَّ زَادَ اللَّهُ فِيهَا الشَّيْئَيْنِ الْآخَرَيْنِ، الْمَذْكُورَيْنِ فِي الثَّانِي مِنْهَا، ثُمَّ زَادَ اللَّهُ فِيهَا الْأَشْيَاءَ الْمَذْكُورَةَ فِي الثَّلَاثِ، وَالرَّابِعِ مِنْهَا الَّتِي لَيْسَتْ فِي الْأَوَّلَيْنِ، فَجَعَلَهَا اللَّهُ عِبَادَةً لَهُ عَلَى خَلْقِهِ فِي أَبْدَانِهِمْ، فَانْتَفَى بِمَا ذَكَرْنَا أَنَّ يَكُونَ فِي شَيْءٍ مِمَّا وَصَفْنَاهُ تَضَادًّا، وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار: ۱۶۸/۲)

اقوال المحدثين:

حافظ ابن حجر نے حدیث الباب سے متعلق تعارض کا جواب دیتے ہوئے چند باتیں تحریر کی ہیں:

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ ان روایات میں عدد کے ذکر سے حصر کرنا مراد نہیں ہے؛ لہذا پانچ یا تین کا حصر حقیقی نہیں ہے (بل کہ یہ حصر ادعائی ہے)۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ ابتداء میں فطرت سے متعلق پانچ چیزوں کا علم ہوا، اس لئے وہ پہلی روایت میں ذکر کی گئیں، پھر اس کے علاوہ امور کا علم ہوا، تو بعد میں ان امور کو بھی فطرت کا حصہ قرار دیا (جس کو امام طحاوی نے ذکر کیا ہے)۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ یہ اختلاف مقام کے اعتبار سے ہے، اس لئے ہر جگہ کے مخاطبین کے لئے جو چیزیں موزوں تھیں، ان کا اضافہ کر کے فطرت کا حصہ قرار دیا ہے۔

(۴) اسی طرح ایک جواب یہ بھی دیا ہے کہ جس روایت میں عدد کی تخصیص ہے، وہ دراصل اس کی تاکید مخصوص ہے نہ کہ حصر، مثلاً دین کے بے شمار شعبات ہیں؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ”الدين النصيحة“، ”والحج عرفة“ سے دین کو صرف ”النصيحة“ کے ساتھ حصر کرنا نہیں ہے، اسی طرح حج کے کئی ارکان ہیں ان میں سے ایک اہم رکن وقوف عرفہ ہے، اس کی تاکید کے لئے یہاں حج کو عرفہ کے ساتھ خاص کیا ہے، نہ کہ حصر کے لئے۔

وقد ثبت في احاديث أخرى زيادة على ذلك فدل على أن الحصر فيها غير مراد۔۔۔ وقيل بل كان اعلم اولا بالخمس ثم اعلم بالزيادة، وقيل بل الاختلاف في ذلك بحسب المقام، فذكر في كل موضع الاثني بالمخاطبين، وقيل اريد بالحصر المبالغة لتأكيد أمر الخمس المذكورة كما حمل عليه قوله ”الدين النصيحة“، ”والحج عرفة“ ونحو ذلك ويدل على التأكيد۔ (فتح الباری: ۱۱/۵۲۶)

علامہ شبیر احمد عثمانی اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

فطرت کے تعلق سے عدد کی تخصیص حجت نہیں، کیوں کہ مختلف روایات میں علاحدہ علاحدہ اعداد ذکر ہیں، کسی میں پانچ، تو کسی میں تین اور کسی میں دس جیسا کہ ابو ہریرہ، ابن عمر اور عائشہ کی روایت میں مذکور ہے، حتیٰ کہ ابو بکر بن العربی نے تیس (۳۰) چیزوں کو فطرت میں شمار کیا ہے۔

بہر حال اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ عدد کا ذکر زیادتی عدد کی نفی کا متقاضی نہیں ہے اور

یہی اکثر اصولیین کا قول ہے۔

”الفطرة خمس“ مفهوم العدد ليس بحجة لأنه إقتصر في هذا الحديث - وهو

حدیث ابي هريرة رضي الله عنه - علي خمس، وفي حديث ابن عمر علي ثلاث، وفي حديث

عائشة رضي الله عنها علي عشر، مع ورود غيرها واصلها أبو بكر بن العربي إلى ثلاثين، فأفادنا

ذلك أن ذكر العدد لا يقتضي نفى الزيادة عليه، وهو قول أكثر أهل الأصول.

(موسوعة فتح الملهم: ۲/۲۹۸، ط: مكتبة أشرفيه، ديوبند)



باب :- ۱۰۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ: "إِنَّ الْإِسْلَامَ بَدَأَ غَرِيبًا

وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ"

﴿عہدِ اول میں اسلام کی حیثیت کا بیان﴾

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ الْإِسْلَامَ بَدَأَ غَرِيبًا،
وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ" فَقِيلَ: مَنْ هُمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: "النُّزَاعُ مِنَ الْقَبَائِلِ".

(شرح مشکل الآثار: ۱۶۹/۲، ورواه الترمذی: (۲۶۲۹)، والدارمی: ۳۱۱/۲، وأحمد: ۳۹۸/۱)

خلاصہ الحدیث:

اس حدیث میں ”غریب“ کا لفظ آیا ہے، یہ واحد ہے، اس کی جمع غرباء ہے، غریب کا
معنی اجنبیت اور دوری کے ہیں یہ دوری چاہے وطن اور اہل و عیال کی دوری ہو یا مال و زر کی، اسی
لئے غریب اس مسافر کو بھی کہتے ہیں جو اپنے اہل و عیال اور وطن سے دور رہ کر تنہائی اور اجنبیت
کی زندگی گزارتے ہیں، اور اسی معنی میں نزاع ہے جس کی جمع نزاع ہے۔

صاحب شرح السنۃ نے نزاع کا معنی لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے:

النزاع من القبائل = النزاع جمع نزاع وهو القریب الذی نزاع عن اہله و عشیرتہ.

(شرح السنۃ: ۱۱۹/۱، بحوالہ شرح مشکل الآثار: ۱۷۰/۲)

نزاع قبائل ہیں، یہ نزاع کی جمع ہے، اس سے وہ مسافر مراد ہے جو اپنے اہل و عیال اور خاندان سے دور ہو۔

الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی ابتدائی صورت حال کو مسافر کی اجنبیت اور دوری سے تشبیہ دی ہے، جس طرح کوئی مسافر اپنے اہل و عیال اور وطن سے دور رہ کر اجنبیت کی زندگی گزارتا ہے، اور اپنے آپ کو بے سروسامانی اور بے یار و مددگار تصور کرتا ہے، اسی طرح کا ماحول اس وقت تھا، جب اسلام کی دعوت مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ صفا پہاڑی پر دی گئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت سے مکہ کی زندگی میں جو اشخاص اسلام بگوش ہوئے، وہ بھی نہتے، کمزور اور ہر اعتبار سے ضعیف اور غریب تھے، چنانچہ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا: ”إِنَّ الْإِسْلَامَ بَدَأَ غَرِيبًا“ یقیناً اسلام اجنبی کی حالت میں دنیا میں آیا اور قیامت سے پہلے اسی حالت پر اسلام آجائے گا، جیسا کہ اس باب کی پہلی حدیث میں اور آخری حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث میں ذکر ہے، کہ عنقریب تم پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ مساجد میں جمع ہوں گے لیکن ان میں ایک بھی شخص مومن نہیں ہوگا۔

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: ”لَيَأْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يَجْتَمِعُونَ فِي الْمَسَاجِدِ،
وَلَيْسَ فِيهِمْ مُؤْمِنٌ“ . (شرح مشکل الآثار: ۱۷۲/۲)

امام طحاوی نے ذکر کیا ہے کہ اسلام ابتداء میں ہر ایک کے حق میں اسی طرح غریب اور اجنبی تھا، جس طرح کوئی مسافر نئی جگہ پر جاتا ہے تو ہر ایک اس کے ساتھ اجنبیت جیسا سلوک کرتا ہے۔

فَتَأْتَانَا هَذِهِ الْأَنْتَارُ، فَوَجَدْنَا الْإِسْلَامَ دَخَلَ عَلَى أَشْيَاءَ لَيْسَتْ مِنْ أَشْكَالِهِ فَكَانَ

بِذَلِكَ مَعَهَا غَرِيبًا لَا يُعْرَفُ، كَمَا يُقَالُ لِمَنْ نَزَلَ عَلَى قَوْمٍ لَا يَعْرِفُونَهُ: إِنَّهُ غَرِيبٌ بَيْنَهُمْ. (شرح

مشکل الآثار: ۱۷۲/۲)

اقوال المحدثين:

علامہ شبیر احمد عثمانی، قاضی عیاضؒ کے حوالہ سے حدیث الباب کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے

ہیں:

اسلام کا آغاز چند لوگوں سے ہوا، تعداد مسلمانوں کی بہت کم تھی، پھر اسلام پھیلتا چلا گیا حتیٰ کہ یہ دین اسلام پوری دنیا میں عام ہو گیا، پھر اس میں نقص واخلال اس طرح پیدا ہو جائیگا کہ اسلام چند لوگوں کے ساتھ سمٹ جائے گا جیسا کہ شروع میں حالت تھی۔

قال القاضي عياض: وظاهر الحديث العموم، وان الاسلام بدأ في آحاد من الناس وقلة، ثم انتشر وظهر، ثم سيلحقه النقص والاخلال، حتى لا يبقى إلا في آحاد وقلة أيضا، كما بدأ، وجاء في الحديث تفسير الغرباء "وهم النزاع من القبائل" قال الهروي: اراد بذلك المهاجرين الذين هجروا وأوطانهم إلى الله تعالى.

(موسوعة فتح الملهم: ۱۷۲/۲-۱۷۶، ط: مكتبة اشرفيه، ديوبند)



باب :- ۱۰۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الشَّيْءِ الَّذِي يُذْهَبُ الْمَدْمَةُ فِي
الرِّضَاعِ، عَنِ الْمُرْضِعِ لِمَنْ أَرْضَعَهُ

﴿دودھ چھڑانے کے بعد مرضعہ کو انعام و بخشش دینے کا بیان﴾

عَنْ حَجَّاجِ بْنِ حَجَّاجٍ الْأَسْلَمِيِّ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا يُذْهَبُ عَنِّي
مَدْمَةُ الرِّضَاعِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "الْعُرَّةُ: الْعَبْدُ، أَوِ الْأَمَةُ". (شرح
مشکل الآثار: ۳۷۲، ۱، ورواه الطبرانی: (۳۲۰۸)، وابن حبان: (۴۲۳۰))

خلاصہ الحدیث:

حقوق کی دو قسمیں ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد، اور حقوق العباد سے وہ حقوق مراد ہیں جو بحیثیت انسان عائد ہوتے ہیں، جیسے سلام کرنا، سلام کا جواب دینا، بیماروں کی عیادت کرنا وغیرہ، ان میں سے ایک رضاعت (دودھ پلانے کا) حق ہے۔

الغرض حدیث الباب میں یہی حق مراد ہے، جو رضاعت کی وجہ سے مرضعہ کو حاصل ہوتا ہے، اس سے دو چیزیں متعلق ہیں: ایک اجرت رضاعت، جو تراضی طرفین سے طے ہوتی ہے، اور دوسری وہ چیز ہے جو مرضعہ کو عند الفصال یعنی تکمیل رضاعت کے بعد بطور بخشش کے دی جاتی ہے، اسی کو "مدمۃ الرضاع" کہتے ہیں۔

بہر حال عرب کے لوگوں کی عادت تھی کہ وہ عند الفصال مرضعہ کو انعام کے طور پر کچھ دیا

کرتے تھے، اس لئے اس حدیث میں ایک صحابی نے آپ ﷺ سے یہی سوال کیا کہ بخشش کیا ہونی چاہئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک غلام یا ایک باندی، الغرض امام طحاوی نے اسی مضمون کو باب کی پہلی حدیث اور دیگر احادیث میں ذکر کیا ہے۔

سوال:

حدیث الباب میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

جواب:

یہ بات سیموں پر عیاں ہے کہ رضاعی ماں شیر خوار بچہ کے لئے ماں کے درجہ میں ہیں؛ لہذا اس پر مرضعہ کے کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں؛ البتہ رضاعی ماں کا حق حقیقی ماں کے حق کے مقابلہ میں کمتر ہے۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۱۷۴)

در اصل اولاد کی حیات کا سبب اس کے والدین ہیں، اس لئے اولاد پر والدین کے حقوق و ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں، بالخصوص اولاد کی تربیت اور نشوونما میں ماں کا کردار زیادہ نمایاں ہوتا ہے، اسی طرح مرضعہ کا کردار ہوتا ہے، اس لئے مرضعہ کے حقوق رضیعہ اور رضیعہ پر زیادہ ہیں، کیوں کہ مرضعہ ماں کے درجہ میں ہیں، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ مرضعہ کو حکم دیا ہے کہ مرضعہ کو مدت رضاعت میں اتنی رقم دے کہ وہ اپنی ضرورت پوری کر سکے، نیز رسول اللہ ﷺ نے رضاعت کی اجرت کے علاوہ غرہ دینے کا حکم بھی دیا ہے۔

فَكَانَ جَوَابًا لَّهُ فِي ذَلِكَ أَنَّ الْمَرْضِعَةَ يَجِبُ مِنْ حَقِّهَا عَلَى مَنْ أَرْضَعَتْهُ مَا لَا خَفَاءَ بِهِ، وَأَنَّهَا تَصِيرُ بِذَلِكَ لَهُ أُمَّافِي وَجُوبِ حَقِّهَا عَلَيْهِ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۱۷۴)

امام طحاوی حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ”لا یجزی ولد والدہ الا ان یجدہ مملوکا فیشریہ فیعتقہ“ سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اولاد پر والد کے حقوق کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر والد کو

حالت رِق میں دیکھے، تو اسے خرید کر آزاد کر دے، اور اولاد کا یہ کردار حق والد کی وجہ سے ہے، اسی طرح مرضعہ جبکہ رضیع کی حیات کے سبب ہیں، تو وہ ماں کے درجہ میں ہیں؛ بل کہ ماں کے حقوق اولاد پر والد کے حقوق کے مقابلہ میں اور زیادہ ہیں، اس لئے مرضعہ کے ساتھ اس کا سلوک ماں جیسا ہونا چاہئے، اور اگر مرضعہ باندی ہے، تو اسے آزاد کرانے کی کوشش کرے؛ ہاں اگر مرضعہ پہلے سے آزاد ہے، تو آزادی کے بقدر مرضعہ کو معاوضہ دیدے، جو جہنم سے نجات و خلاصہ کا سبب ہو۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا يَجْزِي وَلَدٌ وَالِدَهُ إِلَّا أَنْ يَجِدَهُ مَمْلُوكًا فَيَشْتَرِيَهُ فَيُعْتِقَهُ" فَكَانَ ذَلِكَ إِحْبَارًا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ هَذَا الْفِعْلُ مِنَ الْوَلَدِ بِوَالِدِهِ جَزَاءٌ لَهُ عَمَّا كَانَ مِنْهُ فِيهِ بِحَقِّ أَبَوَيْهِ، وَكَانَ حَقُّ الْمَرْضِعَةِ الَّتِي ذَكَرْنَا قَدْ وَجَبَ عَلَى الْمَرْضِعِ بِرِضَاعِهَا إِيَّاهُ حَتَّى صَارَتْ لَهُ بِذَلِكَ، أُمَّا وَحَتَّى صَارَ مَا كَانَ مِنْهَا إِلَيْهِ سَبَبًا لِحَيَاتِهِ، وَحُقُوقُ الْوَالِدَاتِ عَلَى أَوْلَادِهِنَّ فَوْقَ حُقُوقِ آبَائِهِمْ عَلَيْهِمْ وَسَنَدٌ كَثُرَ ذَلِكَ، وَمَا رَوَى عَنْ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيهِ فِيمَا بَعُدَ مِنْ كِتَابِنَا إِنْ شَاءَ اللَّهُ، وَلَمَّا كَانَ ذَلِكَ كَذَلِكَ وَلَمْ يَقْدِرِ الْمَرْضِعُ عَلَى فِكَالِكَ مَنْ أَرْضَعَهُ مِنَ الرِّقِّ إِذَا كَانَ غَيْرَ رَقِيقٍ أَمَرَ أَنْ يُعَوِّضَهَا مِنْ ذَلِكَ مَا تَقْدِرُ أَنْ تَفْعَلَ فِيهِ الْعَتَاقِ الَّذِي يَكُونُ بِهِ فِدَاءٌ لَهَا مِنَ النَّارِ.

(شرح مشکل الآثار: ۱۷۵/۲)

اقوال المحدثین:

ملا علی قاری نے بھی ذکر کیا ہے کہ اہل عرب کے یہاں ایک اچھی روایت ہے کہ مرضعہ کو دودھ چھڑانے کے وقت رضیع کے والدین اجرت کے علاوہ داود ہش سے نوازتے، جو حدیث الباب پر عمل کا بڑا مظہر ہے، اور یہی ”مذمتہ الرضاع“ کا معنی ہے۔

وكانت العرب (يستحبون) أن يرضخوا للظئر بشيء سوى الأجرة عند الفصال

وہوالمستئول عنه . (مرقاۃ المفاتیح: ۳۰۵/۶)

محدث کبیر شیخ خلیل احمد سہارنپوریؒ نے بھی اہل عرب کی اس عادت حسنہ کو ذکر کیا ہے، جو مذمۃ الرضاع کا تقاضہ تھا۔

وكانوا يستحبون أن يهبوا المرزعة عند فصال الصبي شيئاً سوى الأجرة.

(بذل المجہود: ۶۲۲/۷)

مولانا عبدالرحمن مبارکپوریؒ نے بھی ”بمذمۃ الرضاع“ سے وہ حق لازم مراد لیا ہے، جو رضاع کی وجہ سے شیر خوار بچہ کے والدین پر اجرت رضاعت کے علاوہ دینا مستحب ہے۔

والمراد بمذمة الرضاع الحق الازم بسبب الرضاع فكانه يسقط عنى حق

المرزعة، حتى اكون قد ادبته كاملاً، وكانوا يستحبون أن يعطوا للمرزعة عند فصال

الصبي شيئاً سوى اجرتها. (تحفة الاحوذی: ۲۶۵/۳، کتاب النکاح، الکتبۃ اشرفیہ دیوبند)



باب :- ۱۰۴

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوِيَ فِي انْتِشَاقِ الْقَمَرِ فِي زَمَنِ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ تَصْدِيقًا
لِقَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَاُنْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ [القمر: 1]

﴿شق قمر کے واقعہ کا بیان﴾

عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: "اُنْشَقَّ الْقَمَرُ، وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ". (شرح مشکل الآثار: ۱۷۷/۲، والبيهقي: ۲۶۲/۲، وأبو نعيم: (۲۱۱)، والطيالسي: (۲۹۵))

خلاصہ الحدیث:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ معجزات انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہیں، اور ہر نبی کے ذریعہ جو معجزہ صادر ہوا وہ دراصل اس دور کا غماز تھا، اور اسی نبی کی امت کی ضرورت و تقاضہ کا پیش خمیہ تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں سحر اور جادو کا بڑا دور دورہ تھا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں عصا، ید بیضا عطا فرمایا، اسی طرح سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اہل عرب کو عربی زبان پر بڑانا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فصیح و بلیغ عربی زبان میں نہ صرف قرآن کریم عطا کیا؛ بل کہ امت کی عاجزی کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن کے مثل یا ایک آیت لانے کے لئے چیلنج بھی کیا، ﴿قُلْ لِّئِنْ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ يَّاتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَّاتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَتْ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظٰهِرًا﴾ (بنی اسرائیل: ۸۸)

اسی طرح کفار مکہ کی طلب پر شق قمر کا معجزہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارہ سے رونما

ہوا، جس کا ذکر سورہ قمر کی آیت میں اس طرح کیا گیا ہے: ﴿اَقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَاَنْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ [القمر: 1]

بہر حال امام طحاویؒ نے اسی واقعہ شق قمر کو اس باب میں اہتمام کے ساتھ ذکر کیا ہے، جیسا کہ حضرت علیؓ کی حدیث میں ہے، اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں بھی واقعہ شق قمر کو بیان کیا گیا ہے۔

عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: "اَنْشَقَّ الْقَمَرُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "اَشْهَدُوا". (شرح مشکل الآثار: ۱۷۸/۲)

الغرض حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ، حذیفہؓ، ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ کی حدیث نقل کرنے کے بعد امام طحاویؒ یہ ثابت کرتے ہیں کہ شق قمر کے واقعہ کا تحقق ہو چکا ہے۔

فَكَانَ فِيْمَا ذَكَرْنَا عَنْ عَلِيٍّ، وَابْنِ مَسْعُودٍ، وَحُذَيْفَةَ، وَابْنِ عُمَرَ، وَابْنِ عَبَّاسٍ، وَأَنَسٍ تَحْقِيقُهُمْ اِنْشِقَاقَ الْقَمَرِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۸۲/۲)

سوال:

لیکن بعض علماء نے شق قمر کا انکار کیا ہے کہ ابھی یہ پیش نہیں آیا ہے، قیامت کے دن پیش آئے گا، آیت میں "اَقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ" کو "يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعُ" سے متعلق کرتے ہیں، کیوں کہ دونوں کا تعلق قیامت سے ہے، اس لئے شق قمر بھی قیامت کے موقع پر پیش آئے گا۔

سوال ثانی:

نیز ان لوگوں نے اپنی جہالت و نادانی کی بنا پر یہ بھی کہا ہے کہ انشقاق القمر کا واقعہ (جو پیش آچکا ہے) یہ صرف حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں ذکر ہے۔

وَذَكَرَ بِجَهْلِهِ أَنَّ ذَلِكَ لَمْ يَزِرْهُ أَنَّهُ قَدْ كَانَ إِلَّا ابْنُ مَسْعُودٍ. (شرح مشکل الآثار: ۱۸۳/۲)

وَقَدْ زَعَمَ بَعْضُ مَنْ يَدَّعِي التَّأْوِيلَ وَيَسْتَعْمِلُ رَأْيَهُ فِيهِ، وَيَقْتَصِرُ عَلَى ذَلِكَ وَيَتْرُكُ ذِكْرَ مَا كَانَ عَلَيْهِ مِنْ قَبْلَهُ فِيهِ مِنْ صَحَابَةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَمِنْ تَابِعِيهِمْ أَنَّهُ لَمْ يَشَقَّ وَأَنَّهُ إِنَّمَا يَشَقُّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ..... (شرح مشکل الآثار: ۱۸۲/۲)

جواب:- (۱)

سورہ قمر آیت ﴿وَأَنْشَقَّ الْقَمَرَ﴾ (القمر: ۱) کا تعلق ”آیت: ۶“ یَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَى شَيْءٍ نَكِيرٍ سے نہیں ہے، بل کہ اس کا تعلق آیت (۱۲) ﴿وَإِنْ يَرَوْا آيَةً﴾ (القمر: ۲) سے ہے، اس لئے کہ سورہ قمر آیت (۲) میں ”آیہ“ سے علامت و نشانی مراد ہے، جو قیامت سے پہلے دنیا میں ظاہر ہوتی ہے، نہ کہ قیامت کے دن، لہذا شق قمر بھی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، اس لئے یہ بھی عام نشانیوں کی طرح دنیا میں ظاہر ہوگی، جیسا کہ سورہ اسراء میں آیت سے نشانیاں مراد ہیں اور ان کا ظہور دنیا میں ہو چکا ہے، اس لئے یہ دعویٰ اور اعتراض غلط اور بے بنیاد ہے کہ انشقاق القمر قیامت کے دن پیش آئے گا۔

وَأَمَّا مَا ذَكَرَهُ مِنْ أَنَّ قَوْلَ اللَّهِ تَعَالَى: ﴿وَأَنْشَقَّ الْقَمَرَ﴾ (القمر: ۱) إِنَّمَا يَرِجِعُ إِلَى مَا ذَكَرَ أَنَّهُ صَلَاحٌ لَهُ مِمَّا ذَكَرَ نَاهُ عَنْهُ مِنَ الشُّورَةِ الْمَذْكُورِ ذَلِكَ فِيهَا، فَإِنَّ فِي قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: ﴿وَإِنْ يَرَوْا آيَةً﴾ (القمر: ۲) يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌّ دَلِيلًا عَلَى خِلَافِ مَا قَالَهُ فِيهَا، وَدَلِيلًا عَلَى أَنَّ ذَلِكَ لَمْ يَعْنِ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؛ لِأَنَّ الْآيَاتِ إِنَّمَا تَكُونُ فِي الدُّنْيَا قَبْلَ الْقِيَامَةِ، كَمَا قَالَ اللَّهُ وَتَعَالَى: ﴿وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا﴾ (الإسراء: ۵۹)۔ (شرح مشکل الآثار: ۱۸۳/۲)

حضرت ابن مسعودؓ کے قول کی توجیہ:-

(۱) بعض لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ ابن مسعودؓ کا قول شاذ کے قبیل سے ہے، اس لئے کہ اس میں اس بات کا احتمال ہے جس کا ذکر ابن مسعودؓ نے کیا ہے۔

(۲) ابن مسعودؓ کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ شق قمر جب ہوگا، تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ انشقاق قمر ہوگا، تو فجر کے دو ٹکڑوں کے درمیان جبل حرا آجائے گا، لیکن یہ دعویٰ غلط ہے۔

ثُمَّ قَالَ هَذَا الشَّاذُّ: وَقَدْ يُحْتَمَلُ قَوْلُ ابْنِ مَسْعُودٍ يَعْنِي الَّذِي حَكَاهُ هَذَا الشَّاذُّ عَنْهُ، وَهُوَ أَنَّهُ ذَكَرَ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: وَقَدْ يُحْتَمَلُ قَوْلُ ابْنِ مَسْعُودٍ: ”كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَيْهِ فَلَقَتَيْنِ وَحِرَاءَ بَيْنَهُمَا“ أَيُّ كَأَنِّي أَرَاهُ إِذَا انْشَقَّ كَذَلِكَ... (شرح مشکل الآثار: ۱۸۳/۲)

سوال:

قریش مکہ آپ ﷺ کو ابن ابی کبشہ کہتے تھے، تو اب سوال یہ ہے کہ ابو کبشہ کون تھے؟ جس کی طرف قریش نے آپ ﷺ کو منسوب کیا ہے؟

وَسَأَلَ سَائِلٌ عَنْ مَعْنَى قَوْلِ قُرَيْشٍ عِنْدَ انْشِقَاقِ الْقَمَرِ: هَذَا سِحْرٌ سَحَرَكُمْ بِهِ ابْنُ أَبِي كَبْشَةَ يُرِيدُونَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَا كَانَ مُرَادُهُمْ بِذَلِكَ؟ وَمَنْ أَبُو كَبْشَةَ الَّذِي نَسَبُوهُ إِلَيْهِ؟ (شرح مشکل الآثار: ۱۸۵/۲)

جواب:

ہارون بن محمد العسقلانی سے روایت ہے کہ ابو کبشہ آپ ﷺ کے جد امجد ابو قتیلہ و جز بن غالب ہیں، جو قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کو ابو کبشہ اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ سب سے پہلے شخص تھے، جنہوں نے شعری نامی ستارے کی عبادت کی، اور عبادت کی وجہ سے یہ بتلاتے تھے کہ یہی ایک ستارہ ہے جس کی وجہ سے آسمان میں چوڑائی میں روشنی پھیلتی ہے۔

الغرض جس طرح ابوکبشہ نے اہل عرب کی شعری کی عبادت کے معاملہ میں مخالفت کی اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے دین سے علاحدگی اختیار کی، گویا کہ دونوں مخالفت میں برابر کے شریک ہیں، اس لئے قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ابوکبشہ کی نسبت کی۔

وَكَانَتِ الْعَرَبُ تَظُنُّ أَنْ أَحَدًا لَا يَعْلَمُ شَيْئًا إِلَّا بِعَرَقٍ يَنْزِعُهُ شَبَهُهُ، فَلَمَّا خَالَفَ رَسُولَ اللَّهِ دِينَ قُرَيْشٍ قَالَتْ قُرَيْشٌ: نَزَعَهُ أَبُو كَبْشَةَ؛ لِأَنَّ أَبَا كَبْشَةَ خَالَفَ النَّاسَ فِي عِبَادَةِ الشُّعْرَى، فَكَانُوا يَنْسُبُونَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِ، ذَلِكَ وَكَانَ أَبُو كَبْشَةَ سَيِّدًا فِي خُزَاعَةَ لَمْ يُعَيَّرْ وَارَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهِ مِنْ تَقْصِيرٍ كَانَ فِيهِ، وَلَكِنْ أَرَادُوا أَنْ يُشَبَّهُوهُ بِهِ فِي الْخِلَافِ لِمَا كَانَ النَّاسُ عَلَيْهِ. (شرح مشکل الآثار: ۱۸۵/۲)

سیرت نگار میں ابن ہشام سے اس سلسلہ میں کئی اقوال ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ ابوکبشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ماں شریک والد کی کنیت تھی، (یعنی وہب بن عبد مناف کی کنیت تھی) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی والد حارث بن عبد العزیٰ کی کنیت ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ سلمیٰ اخت عبدالمطلب کے والد کی کنیت ابوکبشہ ہے، لیکن ان میں زیادہ مشہور رائے وہی ہے، جو امام طحاوی نے نقل کی ہے، یعنی اس سے وہ شخص مراد ہے جو تنہا شعری نام ستارہ کی پرشتش کرتا تھا، لوگوں نے عبادت میں اپنے دین سے عدول کرنے کی بنا پر ان کی طرف ابوکبشہ کی نسبت کی۔

واما الذی كانت کفار قریش تذکرہ وتنسب النبی ﷺ ونقول قال ابن ابی کبشہ۔۔۔ فقيل فيه اقوال انها كنية أبيه لامة وهب بن عبد مناف، وقيل كنيته أبيه من الرضاة الحارث بن عبد العزی۔۔۔ واشهر من هذه الاقوال كلمها عند الناس انهم شبهوه برجل كان يعبد الشعري وحده دون العرب فنسبوه اليه لخروجه عن دين قومه۔

(سیرة ابن ہشام: ۳۷۸/۲)

اسی طرح حاشیہ تفسیر قرطبی پر ذکر ہے:

وعلى هامش تفسير القرطبي: يريد رسول الله ﷺ، وكان المشركون يقولون للنبي ﷺ ابن ابي كبشة شبهوه بأبي كبشة، رجل من خزاعة خالف قريشا من عبادة الاوثان أو هي كنية وهب بن عبدمناف جده ﷺ من قبل امه، لانه كان نزع اليه في النسبة او كنية زوج حليلة السعدية. (تفسير قرطبي: ۱۰/۲۳۳)

أول من عبده أبي الشعري ابو كبشة احد اجداد النبي ﷺ من قبل امهاته، ولذلك كان مشركون قريش يسمون النبي ﷺ ابن ابي كبشة حين دعا الى الله وخالف اديانهم. (تفسير قرطبي: ۱۴/۱۱۹)

علامہ حافظ ابن کثیر نے نقل کیا ہے قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص تھا، جس نے قریش کی مخالفت کر کے شعری نام کے ستارہ کی عبادت کی، اس لئے اس کو ابو کبشہ کہتے تھے، اور جب رسول اللہ ﷺ نے عبادت میں قریش کی مخالفت کی، تو آپ ﷺ کو بھی قریش ابو کبشہ کہنے لگے۔

ابن ابي كبشة: رجل من خزاعة خالف قريشا في عبادة الاوثان وعبد الشعري فلما خالفهم النبي ﷺ في عبادة الأوثان شبهوه به- وقيل ان ابنا ابي كبشة كان جد النبي ﷺ من قبل أمه- (تفسير ابن كثير: ۷/۲۳۹)



باب :- ۱۰۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ نَهْيِهِ عَنْ قَفِيْزِ الطَّحَّانِ

﴿ قفیز طحان کی حیثیت کا بیان ﴾

عَنْ بَعْضِ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ: "نَهَى عَنْ عَسْبِ التَّيْسِ، وَكَسْبِ الْحَجَّامِ، وَقَفِيْزِ الطَّحَّانِ". (شرح مشکل الآثار: ۱۸۶/۲، ورواه البخاری: (۲۲۸۳) ومسلم: (۱۵۶۸))

خلاصہ الحدیث:

اسلام کے پانچ شعبجات ہیں: ایمانیات، عبادات، معاملات، اخلاقیات، اور معاشرت، ان میں معاملات کا شعبہ بڑا ہی اہم ہے، اسلام نے اس کے ہر پہلو کی وضاحت کی ہے، کہ کون سا معاملہ درست ہے؟ اور کون سا معاملہ درست نہیں، اسی بنا پر اجیر کے عمل سے ایک حصہ کو اجرت قرار دینا ناجائز قرار دیا ہے، اور قفیز طحان والی صورت کو ناجائز قرار دیا ہے، اس مسئلہ کی توجیہ کے لئے امام طحاوی نے اس باب میں احادیث کو جمع کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اجارہ کی صحت کے لئے اجیر کی اجرت کا متعین کرنا شرط ہے، وہیں مستاجر کے پاس اجارہ کے وقت اس کا پایا جانا بھی شرط ہے، لیکن قفیز طحان والی صورت میں اجرت موجود نہیں ہوتی ہے؛ بل کہ اجرت معدوم ہوتی ہے، اور جب اجرت معدوم ہوتی ہے، تو اجارہ فاسد ہوتا ہے، لہذا یہ صورت ناجائز ہونی چاہئے، البتہ مشائخ بلخ نے عرف اور تعامل کی بنیاد پر اس کی اجازت دی ہے۔ (شرح مشکل الآثار: ۱۸۸/۲)

امام طحاویؒ کے علاوہ دیگر فقہاء احناف نے اس مسئلہ کو بڑے شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے، چنانچہ صاحب ہدایہ رقمطراز ہیں: کہ بیع کی یہ صورت فاسد ہے، اس لئے کہ اس میں اجیر کے عمل کے ایک جزء کو اجرت قرار دیا جاتا ہے جو معدوم ہے،

ومن دفع الی حائل غزلا لیسجدہ بالنصف فله اجر مثله۔۔۔ الخ۔ (ہدایہ: ۲/۲۸۹)

قال الشامی: مطلب یخص القیاس والأثر بالعرف العام دون الخاص قال فی التبین ومشائخ بلخ، یجیزون عمل الطعام ببعض المجهول ونسح الثوب ببعض المنسوج لتعامل أهل بلادهم بذلك ومن لم یجوزہ قاسه علی قفیز الطحان۔ (شامی: باب الاجارة الفاسدة: ۵۸/۶، ط: دار الفکر، -----)

مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ لکھتے ہیں:

قفیز الطحان اس کو کہتے ہیں کہ کسی شخص کو گندم دے کر یہ کہے کہ اس کا آٹا بناؤ اور اس کا ایک قفیز تمہاری اجرت ہوگی، اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اس بنیاد پر یہ صورت امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے اعتبار سے ناجائز ہے؛ لیکن مشائخ بلخ نے عرف و تعامل کی بنیاد پر جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۲/۲۴۲)

مشائخ بلخ فرماتے ہیں کہ تعامل کی بنیاد پر نص کی تخصیص درست ہے، اس لئے جب بلخ جیسے شہروں میں اجیر کے عمل کے ایک چیز کو اجرت کا رواج اور تعامل ہے تو اس بنیاد پر قفیز طحان کی تخصیص قرار دے کر اجارہ کی مذکورہ صورت درست اور جائز ہوگی جیسا کہ صاحب محیط البرہانی نے قلمبند کیا ہے:

ومشائخ بلخ کفصیر بن یحییٰ ومحمد بن سلمة وغیرہما کانوا یفتون بجواز ہذہ الاجارة فی الثیاب لتعامل أهل بلادهم فی الثیاب والتعامل حجة یترکہ بہ القیاس ویخص

به الأثر، وتجویز هذه الاجارة في الثياب للتعامل بمعنى تخصيص النص الذي ورد في قفيز الطحان، لان النص ورد في قفيز الطحان لا في الحائك الا ان الحائك نظيره فيكون وارداً فيه دلالة فمتى تركنا العمل بدلالة هذا النص في الحائك و عملنا بالنص في قفيز الطحان كان تخصيصاً لا تر كالأصل وتخصيص النص بالتعامل جائز. (المحيط البرهاني: ۳۷۳/۷)

اسی طرح صاحب بنایہ نے ذکر کیا ہے کہ قفیز طحان کی صورت مذارعة اور مضاربة کے قبیل سے ہے؛ بل کہ ان دونوں صورتوں کے جواز کے مقابلہ میں قفیز طحان کی صورت جواز کے زیادہ مستحق ہے۔ وجہ فرق یہ ہے کہ اجیر بطور اجرت کے جو چیز حاصل کرتا ہے، وہ یہاں موجود ہے، لیکن مذارعة اور مضاربة میں وہ معدوم ہی نہیں؛ بل کہ علی وجہ الخضر ہے اس لئے قفیز طحان کی صورت تعامل کی وجہ سے جواز و درستگی سے زیادہ قریب ہے۔

والمعنى المذكور موجود في كل منهما أى في المزارعة والمضاربة بل هذا أولى بالجواز من المضاربة والمزارعة، فان الذى يأخذ منه الجزء هنا محقق الوجود وهناك معدوم على خطر الوجود، لم يكن هذا المعنى ما نعامن جواز المزارعة والمضاربة فهنا أحق وأولى ان لا يمنع. (البنایہ شرح الهدایہ: ۲۹۷/۱۰)



باب :- ۱۰۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا كَانَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي مَا بَيْنَ سَجْدَتَيْهِ فِي صَلَاتِهِ

هَلْ هُوَ ذِكْرُ اللَّهِ تَعَالَى، أَوْ سَكُوتٌ بِلَا ذِكْرٍ؟

﴿جلسہ کے وقت کی دعا کا بیان﴾

عَنْ حَدِيثِهِ أَنَّهُ انْتَهَى إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُصَلِّي بِاللَّيْلِ تَطَوُّعًا، فَقَالَ: ”اللَّهُ أَكْبَرُ ذُو الْمَلَكُوتِ وَالْجَبْرُوتِ وَالْكَبْرِيَاءِ وَالْعِظْمَةِ“ ثُمَّ قَرَأَ الْبَقْرَةَ، ثُمَّ رَكَعَ فَكَانَ رُكُوعُهُ نَحْوًا مِنْ قِيَامِهِ، (شرح مشکل الآثار: ۱۸۹/۲، ورواه أبو داود: (۸۷۳)، والترمذي في ”الشمائل“: (۲۷۰)، والسنائي: (۱۹۹/۲))

خلاصہ الحدیث:

دعا مومن کے لئے ایک عظیم ہتھیار ہے، دعا عبادت کی روح ہے، دعا عبادت ہے، اور دعا سے گریز متکبرین کی صفت ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف دعا کی ہے؛ بلکہ دعا کرنے کے طریقے اور آداب کے ساتھ ساتھ قبولیت کے مواقع کی بھی رہنمائی کی ہے، اور یہ بھی بتایا ہے کہ مواقع مستجابہ میں دو سجدوں کے درمیان کا وقت بھی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ یہ دعا ”رب اغفر لی وارحمنی“ پڑھتے تھے، اسی بنا پر امام طحاوی نے اس باب کی احادیث سے ثابت کیا ہے کہ دو سجدوں کے درمیان (جلسہ) میں یہ دعا ”رب اغفر لی، رب اغفر لی“ پڑھنی چاہئے۔

بہر حال اس باب کے تحت روایات لانے کا مقصد اور غرض یہ ہے کہ دو سجدوں کے درمیان (جلسہ ہے) بیٹھتے ہیں اس میں کوئی ذکر یا دعا پڑھنا ہے یا سکوت رہنا ہے؟ اس سلسلہ میں حضرت حدیفہؓ کی روایت سے یہ بات عیاں ہے کہ ہر نماز کی تمام رکعات کے جلسہ میں یہ دعا ”رَبِّ اغْفِرْ لِي رَبِّ اغْفِرْ لِي“ پڑھنی چاہئے، جیسا کہ امام طحاویؒ نے اپنے اس جملہ سے ثابت کیا ہے۔

فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُولُ فِيمَا بَيْنَ سَجْدَتَيْهِ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ مِنْ رَكَعَاتِ صَلَاتِهِ تِلْكَ: ”رَبِّ اغْفِرْ لِي رَبِّ اغْفِرْ لِي“ .

(شرح مشکل الآثار: ۱۹۰/۲)

لیکن اس کا ثبوت حدیث الباب اور حضرت علیؓ کی روایت سے ہے، ان کے علاوہ کسی اور صحابی کی روایت سے نہیں ہے اور نہ کسی تابعی سے کوئی روایت ہے۔

البتہ قیاس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جلسہ میں بھی مصلیٰ کو دعا کے بجائے ذکر اللہ کرنی چاہئے، کیوں کہ صلاۃ میں جتنے ارکان ہیں ان میں سے ہر رکن میں ذکر، تسبیح و تہلیل مقرر ہے، چنانچہ سجدہ میں ”سبحان ربی الاعلیٰ“ ہے تو رکوع میں ”سبحان ربی العظیم“ اور قومہ میں ”ربنا لک الحمد“ ہے، اسی طرح جلسہ میں ذکر اللہ ہی ہونا چاہئے؟

امام طحاویؒ نے قیاس کو اس طرح تحریر کیا ہے:

فَكَانَتْ أَقْسَامُ الصَّلَاةِ كُلِّهَا مُسْتَعْمَلٌ فِيهَا ذِكْرُ اللَّهِ تَعَالَى غَيْرَ خَالِيَةٍ مِنْ ذَلِكَ غَيْرِ الْقَعْدَةِ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ الَّتِي ذَكَرْنَا، فَكَانَ الْقِيَاسُ عَلَى مَا وَصَفْنَا أَنْ يَكُونَ حُكْمُ ذَلِكَ الْقِسْمِ أَيْضًا مِنَ الصَّلَاةِ كَحُكْمِ غَيْرِهِ مِنْ أَقْسَامِهَا، وَأَنْ يَكُونَ فِيهِ ذِكْرُ اللَّهِ تَعَالَى كَمَا كَانَ فِي غَيْرِهِ مِنْ أَقْسَامِهَا، وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار: ۱۹۱/۲)

بہر حال جلسہ میں مذکورہ دعایا ذکر کے پڑھنے کی حیثیت کے سلسلہ میں اختلاف ہے، حنفیہ کے نزدیک اس کا پڑھنا نفل ہے، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک فرض، اور نفل دونوں نماز میں اس کا پڑھنا نفل ہے، مگر امام احمد کے مشہور قول کے مطابق ایک بار پڑھنا واجب ہے اور تین بار مستحب، یہی قول امام اسحاق بن راہویہ کا ہے اور داؤد النطاہری کا ہے۔

چنانچہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

وهو قول اكثر الفقهاء لان النبي صلى الله عليه وسلم لم يعلمه المسئى في صلاته.

(در المنصود: ۳۰۲/۲)

وذكر القاضي ثناء الله الفاني فتى في كتابه "مالا بد منه".

أنه يقول في الجلسة "اللهم اغفر لي وارحمني وعافني واهدني وارزقني واجبرني

وارفعني". (بحواله معارف السنن: ۲۸/۳)



باب :- ۱۰۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلي مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي ثَوَابِ مَنْ أَعْتَقَ رَقَبَةً وَفِي مَنْ قَصَدَ إِلَيْهِ
بِذَلِكَ مِنَ الرِّقَابِ مِنَ الذَّكْرَانِ، وَمِنَ الْإِنَاثِ

﴿ غلام آزاد کرنے کی فضیلت کا بیان ﴾

قَالَتْ: قَالَ أَبِي عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”مَنْ أَعْتَقَ رَقَبَةً مُسْلِمَةً، أَوْ
مُؤْمِنَةً وَقَى اللَّهُ تَعَالَى بِكُلِّ عَضْوٍ مِنْهَا عَضْوًا مِنْهُ مِنَ النَّارِ“ . (شرح مشکل الآثار: ۱۹۲/۲، ورواه
النسائي: ۳۶۹/۷، والطبراني: (۱۸۶) وابن سعد: ۳۶۲/۸))

خلاصہ الحدیث:

اسلام نے مسلمانوں کو جہاں دیگر معاملات میں بہت سے احکامات دیئے ہیں، وہیں غلام اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے ساتھ ساتھ آزاد کرنے کی بڑی ترغیب و تحریش کی ہے کہ انسان کا آزاد ہونا ایک ایسی بشری حق ہے، جس کی وجہ سے نہ صرف حقوق اور اہلیت شہادت حاصل ہوتی ہے؛ بل کہ زندگی کے تمام تر اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں، حتیٰ کہ ولایت تکلیم، ولایت نکاح اور ولایت نظر بھی، اس لئے آزاد ہونا رقیبت کے مقابلہ میں حیات نو کے درجہ میں ہے، اسی لئے حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت کو آزاد کیا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے اعضاء کو جہنم کی تکلیف سے آزاد کر دیں گے۔

الغرض حریت وہ قوت حکیمہ ہے، جس کے ذریعہ انسان کو اپنے اوپر اور دوسروں کے اوپر

قوت تنفیذ حاصل ہوتی ہے، اور ولایت نکاح اور رویت ہلال کی شہادت کا حق حاصل ہوتا ہے، یتیم اور نابالغ کے مال میں تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، لیکن رقیہ موت کے درجہ میں ہے، اس لئے کہ اسے غیر پر کیا خود اپنے اوپر ولایت کا حق حاصل نہیں ہوتا؛ چنانچہ کوئی غلام اپنا نکاح مولیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا، کیونکہ غلام اور باندی دونوں آزاد ہونے سے پہلے ایک فطری حق حریت سے محروم رہتے ہیں، اس کی بازیابی کے لئے آزادی ضروری ہے، جو کبھی مولیٰ کے آزاد کرنے سے حاصل ہوتی ہے، تو کبھی مولیٰ کا اس کے بدلہ معاوضہ لے کر آزاد کرنے سے، بہر حال اس کے لئے روپیہ دینا اور غلام کو خرید کر آزاد کرنا نہ صرف ایک مستحسن عمل ہے بل کہ یہ جہنم کی آگ سے خلاصی کا ذریعہ بھی ہے۔

سوال:

امام طحاویؒ نے غلام کی آزادی کے سلسلہ میں کئی روایات ذکر کی ہیں، اکثر روایات میں ”رقبہ“ کے ساتھ ایمان یا اسلام کا وصف متصف ہے، تاہم بعض احادیث میں ”رقبہ“ کے ساتھ اسلام یا ایمان کی قید نہیں ہے، تو کیا آزادی کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے (رقبہ مؤمنہ) مؤمن غلام یا مؤمنہ باندی کو آزاد کرنا ضروری ہے؟

اسی طرح کیا نر مادہ (غلام و باندی) کی آزادی میں فرق ہے یا نہیں؟ اسی طرح آزاد کرنے والا مرد ہو یا عورت، تو اس میں بھی کوئی فرق ہے یا نہیں؟

فَكَانَ مَا رَوَيْنَاهُ مِنْ هَذِهِ الْأَثَارِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى عَتَاقِ رَقَبَةٍ مَوْصُوفَةٍ فِي بَعْضِهَا بِالْإِيمَانِ، أَوْ بِالْإِسْلَامِ، وَفِي بَعْضِهَا: ”مَنْ أَعْتَقَ رَقَبَةً“ بِغَيْرِ ذِكْرِ لَهَا بِإِيمَانٍ وَلَا بِإِسْلَامٍ، فَنَظَرْنَا هَلْ رُوِيَ عَنْهُ فِي هَذَا الْبَابِ تَفْرِيقٌ بَيْنَ ذِكْرَانِ الرَّقَابِ وَبَيْنَ

إِنَائِهَا؟ وَهَلْ رُويَ عَنْهُ تَفْرِيقُ بَيْنِ الْمُعْتَقِينَ مِنَ الذُّكُورِ وَالْإِنَاثِ؟.

(شرح مشکل الآثار: ۱۹۶/۲)

جواب:

اس سلسلہ میں صاحب شرح مشکل الآثار نے کعب بن مرہؓ کی حدیث کو کئی طرق سے جمع کیا ہے، اس سے یہ بات بے غبار ہوتی ہے کہ آزادی کی فضیلت کے لئے ”رقبہ مؤمنہ“ (یعنی غلام اور باندی دونوں کا مسلمان ہونا) ضروری ہے، یوں تو کسی بھی بُردہ کو آزاد کرنا باعث اجر ہے، لیکن اگر کسی مسلمان بُردہ کو آزاد کیا جائے تو اس کے اجر کی حیثیت اور ثواب کی مقدار اور زیادہ ہوگی، البتہ اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ معتق مرد ہو یا عورت، اور معتق مذکر ہو یا مؤنث۔

فَعَقَلْنَا بِذَلِكَ أَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِمَا ذَكَرَهُ فِي الْأَثَارِ الْأُولَى أَرَادَ مِنَ الْمُعْتَقِينَ، وَمِنَ الْمُعْتَقِينَ التَّكَافُرَ فِي ذَلِكَ، وَأَنْ يَكُونَ الْمُعْتَقُ إِنْ كَانَ ذَكَرًا يَكُونُ الَّذِي يُفُكُّ بِهِ نَفْسَهُ مِنَ النَّارِ ذَكَرًا مُسْلِمًا، أَوْ أُتْنِيحِينَ مُسْلِمَيْنِ، وَأَنَّ الْمُعْتَقَ إِنْ كَانَ أُتْنِيحِينَ الَّذِي يُفُكُّ بِهِ نَفْسَهَا مِنَ النَّارِ أُتْنِيحِينَ مُسْلِمَةً، وَأَنَّ ذَلِكَ كُلَّهُ لَمْ يُجْعَلْ إِلَّا فِي الرِّقَابِ الْمُؤْمِنَاتِ دُونَ مَنْ سِوَاهُنَّ مِنَ الرِّقَابِ الْكَافِرَاتِ وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار: ۲۰۰/۲)

اقوال المحدثين:

حافظ ابن حجرؒ نے ابن منیرؒ کے قول کو نقل کرتے ہیں کہ جس گردن کو جہنم سے آزادی ملے گی اس کو چاہئے کہ وہ رقبہ مؤمنہ ہو۔

وقال ابن المنير: فيه اشارة إلى انه ينبغي في الرقبة التي تكون للكفارة أن يكون

مؤمنة. (فتح الباری: ۳۲۸/۵)

مفتی تقی عثمانی صاحب نے امام نوویؒ کے حوالہ سے لکھا ہے:

رقبة کی آزادی میں ”مومنة“ کی قید زیادتی ثواب کے لئے ہے، یعنی مسلمان بڑدہ کو آزاد کرنے میں غیر مسلمان بڑدہ کے مقابلہ میں ثواب زیادہ ملتا ہے۔

قال النووي: تقييد الرقبة بالمومنة يدل على أن هذا الفضل الخاص إنما هو في عتق المومنة، وأما غير المومنة ففيه أيضا فضل بلا خلاف، ولكن دون فضل المومنة.

(تكملة فتح الملهم: ۲۸۸/۷)



باب :- ۱۰۸

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا زَوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيمَا كَانَ أَمْرًا بِهِ الَّذِينَ ذَكَرُوا وَاللَّهُ

مِنْ بَنِي سُلَيْمٍ أَنَّ صَاحِبًا لَهُمْ أَوْجَبَ فِي الْعِتَاقِ لِذَلِكَ

﴿قصاص کے وجوب کا بیان﴾

عَنْ وَائِلَةَ بِنِ الْأَسْقَعِ قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَفَرٌ مِنْ بَنِي سُلَيْمٍ فَقَالُوا:
إِنَّ صَاحِبًا لَنَا أَوْجَبَ قَالَ: "فَلْيُعْتِقْ رَقَبَةً يُفْدي اللّٰهُ بِكُلِّ عَضْوٍ مِنْهُ عَضْوًا مِنْهُ مِنَ النَّارِ".

(شرح مشکل الآثار: ۲/۲۰۱، ورواه النسائي في الكبير: (۳۸۹۱) واحمد: ۴/۱۰۰۷، والطبراني: ۲۲/۲۲۱))

خلاصہ الحدیث:

یہ بات اہل علم پر مخفی نہیں کہ اسلام نے جہاں حقوق اللہ کی حفاظت و پاسداری کا حکم دیا ہے، وہیں حقوق العباد کی حفاظت کی ترغیب دی ہے، نیز اس کی ادائیگی میں کمی اور نقصان کی صورت میں قصاص کے نفاذ کا حکم فرمایا ہے، اسی بنا پر امام شاطبیؒ نے پورے احکام شریعت کے مقاصد و مصالح پانچ شمار کئے ہیں، حفظ نفس، حفظ مال، حفظ عرض، حفظ دین اور حفظ نسل اور ان میں سے ایک اہم مقصد حفظ نفس ہے، جس کی بقا اور تحفظ صرف قصاص سے ممکن ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (البقرة: ۱۷۹)

(اور لوگوں کو قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے۔)

لیکن یہاں پر یہ بات بھی یاد رہے کہ قاتل پر قصاص کے نفاذ کے لئے شریعت نے کچھ شرطیں مقرر کی ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے، ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مقتول پر قاتل کی ملکیت نہ ہو، اگر ملکیت یا شبہ ملکیت ہے، تو قاتل پر قصاص واجب نہیں، چنانچہ مذکورہ باب کی روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنیاد پر قاتل پر قصاص واجب کرنے کے بجائے ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔

گرچہ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، یعنی ائمہ ثلاثہ کے یہاں قاتل پر قصاص نہیں ہے؛ لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قاتل سے قصاص لیا جائے گا جیسا کہ امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ کی کتاب ”الأصل“ میں ہے: **وَإِذَا قَتَلَ الْحُرَّ الْمَمْلُوكَ عَمْدًا فَإِنْ عَلَيْهِ فِيهِ الْقَصَاصُ**. (الأصل للإمام محمد بن الحسن الشیبانی: ۵۷۳/۶، ط: دار ابن حزم)

تعارض:

حدیث الباب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قاتل اگر ایک غلام آزاد کر دے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کو جہنم سے آزاد کر دیں گے، جبکہ دوسری روایت میں قبیلہ والوں کو قاتل کی طرف سے غلام آزاد کرنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ غریف الدیلمی کی حدیث میں ہے:

قَالَ: أَتَيْنَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي صَاحِبٍ لَنَا قَدْ أُوجِبَ يَعْنِي: النَّارَ بِالْقَتْلِ، فَقَالَ: "أَعْتَقُوا عَنْهُ رَقَبَةً يُعْتَقِ اللَّهُ بِكُلِّ عَضْوٍ مِنْهُ عَضْوًا مِنْهُ مِنَ النَّارِ". (شرح مشکل الآثار: ۲۰۵/۲-۲۰۴)

اس اعتبار سے دونوں احادیث میں تعارض واقع ہوا ہے۔

جمع و تطبیق:

درحقیقت یہاں کوئی تعارض نہیں ہے؛ کیونکہ اگر وہ قاتل آزاد کرے گا، تو یہی سمجھا جائے

گا کہ قوم نے آزاد کیا، اس لئے کہ وہ اسی قوم کا ایک فرد ہے۔ اگر قوم نے اس کے حکم سے غلام آزاد کیا، تو یوں سمجھا جائے گا کہ قاتل نے آزاد کیا ہے۔

کیونکہ عربی لغت میں ایسا عرف مستعمل ہے کہ اگر قبیلہ کا ایک فرد غلام آزاد کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس قبیلہ نے آزاد کیا، اہل عرب کہتے ہیں: "اعتقه خزاعہ لعناق رجل من خزاعہ آیاہ" قبیلہ خزاعہ نے اس قبیلہ کے ایک شخص کی طرف سے آزاد کیا۔

وَإِنْ وَجَبَ حَمْلُهُ عَلَى مَا يَسْتَقِيمُ فِي اللُّغَةِ، فَإِنَّ اللُّغَةَ الْعَرَبِيَّةَ تُطْلَقُ فِي مَنْ أَعْتَقَهُ وَاحِدًا مِنْ قَبِيلَةٍ، أَنْ يُقَالَ: إِنَّ تِلْكَ الْقَبِيلَةَ أَعْتَقَتْهُ، فَيَقُولُونَ: أَعْتَقْتَهُ خُزَاعَةٌ لِعِنَاقِ رَجُلٍ مِنْ خُزَاعَةَ إِيَّاهُ. (شرح مشکل الآثار: ۲۰۷/۲)

وَأَنْ يَقُولُوا حِكَايَةً عَنْهُ: "أَعْتَقُوا عَنْهُ رَقَبَةً" بِأَمْرِكُمْ إِيَّاهُ وَحَتِّكُمْ لَهُ عَلَى عِنَاقِ رَقَبَةٍ عَنْ نَفْسِهِ يُضَافُ عِنَاقُهَا إِلَيْكُمْ، وَإِلَيْهِ جَمِيعًا فَتَعُودُ بِذَلِكَ مَعَانِي مَا فِي هَذَيْنِ الْفَضْلَيْنِ إِلَى مَعْنَى وَاحِدٍ وَهُوَ عِنَاقُ الرَّجُلِ الَّذِي كَانَ مِنْهُ ذَلِكَ الدَّنْبُ عَنْ نَفْسِهِ الرَّقَبَةَ الَّتِي تَكُونُ كَفَارَةً لِدُنْبِهِ وَفَكَأَنَّ كَالَهُ مِنَ النَّارِ مِنْهُ، وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار: ۲۰۷/۲)

اقوال المحدثین:

ملا علی قاریؒ نے "اعتقوا عنہ" سے اقارب قاتل مراد لیا ہے، لہذا اگر قاتل کے اقارب ورشتہ دار نے اس کی طرف سے ایک غلام آزاد کیا، تو وہ قاتل کے قتل کا کفارہ کے قائم مقام ہوگا۔ (یعنی وہ قاتل کی طرف سے آزادی تصور کی جائے گی۔)

فقال: اعتقوا "أي أقارب القاتل أو أصحابه أو الخطاب للقاتل وجمع تغليباً أو تعميماً للحكم في مثل فعله (عنه) أي عن قتله وعوضه (يعتق الله). (مرقاة المفاتيح: ۵۰۳/۶)



باب :- ۱۰۹

بَابُ بَيَانِ مُشْكِالِ مَا زُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ: "لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ لَا أُصَلِّيَ عَلَيْهِ"

يَعْنِي: الْمُعْتَقَ لِعِيدِهِ السِّتَّةِ الَّذِينَ هُمْ جَمِيعُ مَالِهِ عِنْدَ مَوْتِهِ،

وَمِنْ غَضَبِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ ذَلِكَ

﴿ ضیاع مال پر وعید کا بیان ﴾

عَنْ أَبِي زَيْدٍ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ أَعْتَقَ سِتَّةَ مَمْلُوكِينَ لَهُ عِنْدَ مَوْتِهِ لَيْسَ

لَهُ مَالٌ غَيْرُهُمْ، فَبَلَغَ ذَلِكَ النَّبِيَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَعَضِبَ مِنْ ذَلِكَ وَقَالَ: "لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ لَا

أُصَلِّيَ عَلَيْهِ" ثُمَّ دَعَا مَمَالِيكَهٖ فَجَزَّأَهُمْ ثَلَاثَةَ أَجْزَاءٍ، فَأَقْرَعَ بَيْنَهُمْ فَأَعْتَقَ اثْنَيْنِ، وَأَرَقَّ

أَرْبَعَةً". (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۰۸)، ورواه أبو داود: (۳۹۶۰)، والنسائي: (۳۹۷۳)

خلاصہ الحدیث:

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں، ان میں سے ایک مہتمم بالشان نعمت

مال ہے، عام طور پر اس کے حصول اور انفاق کے طریقے میں افراط و تفریط کی صورت پیدا ہو جاتی

ہے، دین اسلام کے علاوہ کسی مذہب کی تعلیمات میں صحیح رہنمائی نہیں ملتی ہے، یہ دین اسلام ہی کا

طرہ امتیاز ہے کہ اس نے مال جیسی عظیم نعمت کے سلسلہ میں نہ صرف رہنمائی کی ہے بل کہ حصول

مال کا جائز اور حلال طریقہ کیا ہے؟ اور انفاق کا صحیح مصرف کیا ہے؟ دونوں واضح کیا ہے۔

یقیناً مال میں غلام بھی شامل ہے، قرآن و حدیث میں اس کی آزادی کو عبادت ہی نہیں

بل کہ اسے معتق کے لئے حیات نو قرار دیا ہے، البتہ اسلام نے اپنے تمام غلام کو آزاد کرنے سے منع فرمایا ہے، جس سے معتق کا مفلس ہونا لازم آئے۔

اسی وجہ سے باب کی پہلی حدیث میں ذکر ہے کہ ایک انصاری صحابی نے اپنے چچے غلام کو آزاد کر دیا، حالانکہ اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی مال نہیں تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ملی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس سے ناراضگی ظاہر کی، بل کہ یہ بھی کہا کہ اگر اس کی موت ہوگئی، تو میں اس کی جنازہ کی نماز نہیں پڑھوگا۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معتق کے تمام غلام کو طلب کیا اور ثلث کے اعتبار سے تقسیم کیا، دو غلام کی آزادی کا فیصلہ فرمایا، اور چار غلام کو اپنی اصلی حالت میں رہنے دیا، تاکہ معتق کے ورثہ جائداد سے محروم نہ ہو اور موسیٰ علیہ پر موسیٰ کا احسان بھی ثابت ہو جائے۔

سوال:

یہاں سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کی آزادی پر ناراضگی کیوں ظاہر کی؟ اور اس معتق پر نماز جنازہ پڑھنے سے کیوں انکار کیا؟ جبکہ وہ غلاموں کا مالک تھا؟

فَفِيمَا رَوَيْنَا عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِنَّكَارُهُ عَلَى الْمُعْتَقِ فِي مَرَضٍ مَوْتِهِ جَمِيعَ عِبِيدِهِ، وَغَضَبُهُ مِنْ ذَلِكَ، وَهَمُّهُ مِنْ أَجَلِهِ أَنْ لَا يُصَلِّيَ عَلَيْهِ فَسَأَلَ سَائِلٌ عَنِ الْمَعْنَى الَّذِي مِنْ أَجَلِهِ كَانَ ذَلِكَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: وَقَدْ كَانَ ذَلِكَ الْمَرِيضُ مَالِكًا لِمَمَالِكِهِ حِينَ كَانَ مِنْهُمْ فِيهِمْ مَا كَانَ مِنَ الْعِتْقِ لَهُمْ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۱۰-۲۰۹)

جواب:

امام طحاویؒ لکھتے ہیں کہ جو لوگ مرض موت میں ہوتے ہیں، ان کے لئے دو باتوں کا احتمال رہتا ہے، ایک بات یہ ہے کہ اسی حالت میں موت ہو جائے، دنیا کو الوداع کر دے،

دوسری بات یہ کہ وہ مریض صحت یاب ہو جائے، اس لئے مریض کی وصیت اس کے تمام مال میں نافذ نہیں ہوتی؛ بلکہ تہائی مال میں ہی نافذ ہوتی ہے، تاکہ تندرست ہونے کے بعد وہ مریض خود دوسرے کا محتاج نہ ہو، اور نہ اس کے ورثاء محروم ہوں۔

لیکن انصاری صحابی نے اس سے پہلو تہی کی، اور تمام غلام کو آزاد کر دیا، اس کا یہ عمل قابل مذمت تھا، اور آپ ﷺ قابل مذمت اشخاص کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے، اس لئے آپ ﷺ نے اس کے عمل پر خفگی ظاہر کی، اور نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کیا۔

فَكَانَ جَوَابِنَالَهُ فِي ذَلِكَ أَنْ أَفْعَالَ الْمَرَضَى فِي أَمْرٍ اضْمِهِمُ الَّتِي يَتَوَقَّوْنَ مِنْهَا مَقْصَرٌ بِهِمْ فِيهَا عَنْ تَقْوِذِهَا مِنْ جَمِيعِ أَمْوَالِهِمْ، وَمَرْدُودُهُ إِلَى أَثْلَاتِ أَمْوَالِهِمْ غَيْرَ مُتَجَاوِزَةٍ إِلَى مَا هُوَ أَكْثَرُ مِنْهَا مِنْ أَمْوَالِهِمْ، وَلَمَّا كَانَ ذَلِكَ كَذَلِكَ وَجَبَ أَنْ يَكُونَ مَنْ حَلَّ بِهِ مَرَضٌ قَدْ يُحْتَمَلُ أَنْ يَكُونَ يَمُوتُ فِيهِ وَقَدْ يُحْتَمَلُ أَنْ يَخْرُجَ مِنْهُ أَنْ لَا يَتَبَسَّطَ فِي أَمْوَالِهِ تَبَسُّطَ الْأَصْحَاءِ فِي أَمْوَالِهِمْ؛ لِأَنَّهُ قَدْ يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ فِي مَرَضٍ يَمْنَعُهُ مِنْ ذَلِكَ، وَقَدْ يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ فِي مَرَضٍ لَا يَمْنَعُهُ مِنْ ذَلِكَ إِلَّا أَنْ الْأَوْلَى بِهِ الْإِحْتِيَاظُ لِنَفْسِهِ، وَلَمَنْ حُبَسَ بِقِيَّةِ مَالِهِ بَعْدَ ثُلُثِهِ عَلَيْهِ مِمَّنْ يَرِثُهُ، فَإِذَا خَرَجَ عَنْ ذَلِكَ وَتَبَسَّطَ فِي جَمِيعِهِ كَمَا يَتَبَسَّطُ الْأَصْحَاءُ فِي مِثْلِهِ كَانَ بِذَلِكَ مَذْمُومًا، وَمِنْ سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرْكُهُ لِلصَّلَاةِ عَلَى الْمَذْمُومِينَ فَهَذَا عِنْدَنَا وَجْهُ هَمِّ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرْكُهُ الصَّلَاةَ عَلَى ذَلِكَ الْمُتَوَفَّى قَدْ لَحِقَهُ هَذَا الدَّمُ، وَغَضَبِهِ مِنْ فِعْلِهِ الَّذِي مِنْ أَجْلِهِ حَلَّ ذَلِكَ الْمَحَلَّ عِنْدَهُ. (شرح مشکل الآثار: ۲۱۰/۲)

اقوال المحدثين:

ملا علی قاری امام نووی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بطور زجر و توبیخ کے قابل مذمت اشخاص کی نماز جنازہ میں شریک نہیں ہوتے۔

قال النووي: هذا محمول على أن النبي ﷺ وحده كان يترك الصلاة عليه

تشديدًا وتغليظًا وزجرًا لغيره على مثل فعله. (مرقاة المفاتيح: ۱۱/۷)

سوال:

کوئی سائل یہ کہے کہ اس جیسے مسائل میں قرعہ کا عمل ہوگا یا یہ عمل منسوخ ہو چکا ہے؟

وَسَأَلْ سَائِلٌ آخَرَ عَنِ الْقُرْعَةِ فِي مِثْلِ هَذَا، هَلْ هِيَ مُسْتَعْمَلَةٌ الْآنَ أَمْ لَا؟ (شرح مشکل

الآثار: ۲/۲۱۰)

جواب:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے، اہل حجاز اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وہ اب بھی مستعمل ہے اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ منسوخ ہو چکا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب نسخ پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک یمنی آدمی آیا، (جبکہ حضرت علیؓ اس وقت یمن کے حاکم تھے) اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول ﷺ! حضرت علیؓ کے پاس تین اشخاص آئے، ایک بچہ کے بارے میں جھگڑتے ہوئے، جنہوں نے اس کی ماں سے بدسلوکی کیا تھا، ایک ہی طہر میں، تو آپ ﷺ نے ان کے درمیان قرعہ ڈالا ایک کا قرعہ نکلا، بچہ اس کے حوالہ کر دیا۔ راوی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے نواجذ ظاہر ہو گئے۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۱۲)

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا حضرت علیؓ کے اس فیصلہ پر انکار نہ کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ قرعہ اس وقت رائج تھا۔

وَفِي تَرْكِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنْكَارَ ذَلِكَ عَنْ عَلِيٍّ رِضَاهُ بِهِ مِنْهُ، وَأَنَّ
الْحُكْمَ كَانَ فِيهِ عِنْدَهُ يَوْمَئِذٍ كَذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۱۴)

سوال:

قرعہ کا عمل کیسے منسوخ ہوگا جب کہ رسول اللہ ﷺ جب بھی سفر کا ارادہ کرتے، تو اس سے پہلے اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے تھے؟

فَإِنَّ قَالَ قَائِلٌ: فَكَيْفَ تَكُونُ الْقُرْعَةُ مَنْسُوخَةً، وَقَدْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ يَفْعَلُهَا بَيْنَ نِسَائِهِ عِنْدَ إِرَادَتِهِ السَّفَرَ بِأَحَدَاهُنَّ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۱۵)

جواب:

امام طحاوی قلم بند کرتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں قرعہ کا استعمال کئی کاموں کے لئے ہوتا تھا، کبھی اس سے ”بینہ“ کی طرح لوگوں کے حقوق کو لازم کرتے، تو کبھی اس کا استعمال تطیب قلب کے لئے ہوتا، لیکن بعد میں قرعہ کے ذریعہ احکام و حقوق کا ثبوت یہ حکم منسوخ ہو گیا، البتہ سفر کے وقت بیویوں کی تطیب قلب کے لئے قرعہ کا استعمال کرنا اب بھی باقی ہے، اور یہ درست ہے۔

لہذا حضرت عائشہؓ کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا قرعہ کا عمل کرنا بیویوں کی تطیب قلب کے لئے تھا، وہ اس وقت جائز تھا اور اب بھی جائز ہے؛ لیکن احکام کا ثبوت اس کے ذریعہ یہ منسوخ ہو چکا ہے۔

فَكَانَ جَوَابَنَا لَهُ فِي ذَلِكَ أَنَّ الَّذِي ذَكَرْنَا مِنَ الْقُرْعَةِ الْمَنْسُوخَةِ هِيَ الْقُرْعَةُ
الْمُسْتَعْمَلَةُ كَانَتْ فِي الْأَحْكَامِ بِهَا حَتَّى يَلْزَمَ لُزُومَ مَا يُحْكَمُ فِيهِ بِمَا سِوَاهَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ
وَاخَرَهَا، وَأَمَّا هَذَا الَّذِي ذَكَرْتَ فَلَمْ يَسْتَعْمَلْ عَلَى سَبِيلِ الْحُكْمِ بِهِ، وَإِنَّمَا اسْتَعْمَلَ عَلَى

تَطْيِيبِ النَّفْسِ وَنَقْيِ الظُّنُونِ، لَا لِمَا سَوَى ذَلِكَ إِلَّا..... (شرح مشکل الآثار: ۲۱۷/۲)

اقوال المحدثين:

علامہ شوکانی کے حوالہ سے صاحب بذل نے لکھا ہے کہ قرعہ والی حدیث منسوخ ہے۔

وقال بعضهم: ان حدیث القرعة منسوخ. (بذل المجہود: ۳۲۶/۸)

والقرعة أنكروا كون القرعة حجة شرعية كما قررہ ابن الهمام.

(۳۲۳/۸-۳۹/۵، بحوالہ حاشیہ بذل المجہود: ۳۲۳/۸)

علامہ ظفر احمد عثمانی نے لکھا ہے: قرعہ کا استعمال بیویوں کی تطہیب نفس کے لئے مستحب ہے۔

”وانظر مالو سافر بهن هل يقسم“ وفيه ايضا: قلنا كان استحبابا لتطيب قلوبهن لان مطلق الفعل لا يقتضى الوجوب مع انه صلى الله عليه لم يكن القسم واجبا عليه.

(اعلاء السنن: ج: ۱، ص: ۱۱۸، ط: ادارة القرآن والعلوم الاسلامية كراچی، پاکستان)

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

احناف و مالکیہ کا نظریہ ہے کہ اب قرعہ ثبوت نسب میں معتبر نہیں، البتہ بیویوں کے مابین تقسیم باری میں قرعہ کا استعمال استحباباً جائز ہے۔

واستدل به علي مشروعية القرعة في القسمة بين الشركاء وغير ذلك كما تقدم في

أواخر الشهادات.

والمشهور عن الحنفية والمالكية عدم اعتبار القرعة. (فتح الباری: ۳۵۷/۹، ط: دار

البيان العربي)



باب :- ۱۱۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ:
”الْحَلَالُ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنَ وَبَيْنَ ذَلِكَ أُمُورٌ مُشْتَبِهَاتٌ“

﴿ حلال و حرام اور امور مشتبہ کا بیان ﴾

عَنِ الشَّعْبِيِّ قَالَ: سَمِعْتُ التُّعْمَانَ بْنَ بَشِيرٍ، يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ:
”إِنَّ الْحَلَالَ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنَ، وَإِنَّ بَيْنَ ذَلِكَ أُمُورًا مُشْتَبِهَاتٍ“ وَرُبَّمَا قَالَ: ”مُشْتَبِهَةٌ،
وَسَأْضُرِبُ لَكُمْ مَثَلًا، إِنَّ لِلَّهِ حِمَىً وَإِنَّ حِمَى اللَّهِ مَا حَرَّمَ، وَإِنَّهُ مَنْ يَرَعَ حَوْلَ الْحِمَى
يُوشِكُ أَنْ يَرْتَعَ“.

(شرح مشکل الآثار: ۲/۲۱۹، ورواه البخاري: (۵۲)، والدارمي: ۲/۲۳، والبيهقي: ۵/۲۶۳))

خلاصہ الباب:

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ دین عطا کیا ہے، جو کامل ہے اور جامع بھی، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الکلم عطا کئے ہیں، اور جوامع جامع کی جمع ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ کلمہ مختصر ہو؛ لیکن معانی کا سمندر ہو، چنانچہ اس باب کی پہلی حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم میں سے ہے، علامہ کرمائی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث ان چار احادیث کی ایک اہم کڑی ہے، جس پر اسلام کا دار و مدار ہے جیسا کہ صاحب بذل نے ذکر کیا ہے:

وقوله: ”الحلال بین والحرام بین“ أصل كبير في كثير من الامور والاحكام اذا

وقعت فيها الشبهة أو عرض فيها الشك. (بذل المجهود: ۱۲/۱۱)

الغرض حدیث الباب میں جہاں مسلمانوں کو ایمان کے ساتھ اعمال بجالانے کی تعلیم دی ہے اور کسب حلال، رزق حلال حاصل کرنے اور مال حرام سے اجتناب کرنے کی تاکید کی ہے وہیں اس کے ساتھ ساتھ مشتبہ مال سے بچنے کی خوب تاکید فرمائی ہے، اور پہلی حدیث اس بات کی طرف مشیر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہارے سامنے اس کی ایک مثال دیتا ہوں، اللہ رب العزت کی ایک چراگاہ ہے، اور یہ چراگاہ محرمات (حرام کردہ کام) ہیں، اور جو چراگاہ کے پاس اپنا جانور چراتا ہے، قریب ہے کہ وہ چراگاہ میں جا پڑے۔

سوال:

معارض نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہاں مذکورہ حدیث پیش کرنے کا مقصد کیا ہے؟

فَسَأَلْ سَائِلٌ عَنِ الْمَعْنَى الْمَقْصُودِ إِلَيْهِ بِهَذَا الْحَدِيثِ مَا هُوَ؟ (شرح مشکل الآثار:

(۲۲۱/۲)

جواب:

حقیقت یہ ہے کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن عبادات و اعمال کی ادائیگی ضروری ہے، ان میں سے بعض کا ذکر قرآن میں بہت ہی واضح ہے، اس کے معنی کو سمجھنے میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے، اور ان احکام کو محکم کہتے ہیں مثلاً نسبی رشتدار، مرد اور عورت کا آپس میں نکاح کا حرام ہونا، بہن اور بھائی کی بیٹی سے نکاح کی حرمت وغیرہ۔

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعُمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ ﴾ (النساء: ۲۳)

البتہ قرآن میں بعض وہ آیات ہیں جو تشابہ کے قبیل سے ہیں، یعنی جن میں حلت و حرمت دونوں کا شبہ ہوتا ہے، لیکن مراد واضح نہیں ہوتا، جیسا کہ امام طحاویؒ نے ذکر کیا ہے: ”وكان المتشابه منه الذي لم يكشف لهم مراده فيه منه.“ (شرح مشکل الآثار: ۲۲۱/۲) اس کی مثال حد سرقہ کی آیت وغیرہ ہے۔

اسی طرح امام طحاویؒ اس کے جواب میں قلم بند کرتے ہیں: بندوں پر جو احکام ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق محکم سے ہے، تو دوسرے کا تعلق تشابہ سے، محکم کی مثال نسبی عورتوں سے نکاح کی حرمت۔

﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخْرُ
مُتَشَابِهَاتٌ﴾ (ال عمران: ۷) ﴿حُزِمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ﴾ (النساء: ۲۳)

اور تشابہ جس کا معنی واضح نہ ہو جیسے حد سرقہ کی آیت اور حیض ابیض کا حیض اسود سے ممتاز ہونا، وغیرہ۔

قرآن مجید کی طرح ذخیرہ احادیث میں بھی بعض احادیث محکم ہیں، تو بعض تشابہ، بہر حال ”والحلال بئین“ کا مطلب یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ہیں جو ماکولات و مشروبات کے قبیل سے ہیں، جن کا معنی دو دو چار کی طرح عیاں ہے، جیسے بیع کا حلال ہونا، دن اور رات میں پانچ اوقات کی نماز فرص ہونا، حالت سفر میں مسافر کو قصر کی اجازت، ایام حیض میں حائضہ کے لئے نماز اور روزہ ترک کرنا اور طہر میں روزہ کی قضا ضروری قرار دینا، اور نماز کی قضا واجب نہ ہونا وغیرہ۔

فَكَانَ الْمُحْكَمُ وَالْمُتَشَابَهُ اللَّذَانِ ذَكَرَهُمَا فِي كِتَابِهِ، هُمَا الْجِنْسَانِ اللَّذَانِ ذَكَرْنَا
وَمِنْهَا مَا أَجْرَاهُ عَلَى لِسَانِ نَبِيِّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلَى هَذَا الْمَعْنَى وَأَجْرَى بَعْضُهُ عَلَى لِسَانِهِ

مُحْكَمًا مَكْشُوفَ الْمَعْنَى كَالصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ، وَكَمَا يَقْضُرُهُ الْمَسَافِرُ مِنْهَا فِي سَفَرِهِ، وَكَمَا لَا يَقْضُرُهُ مِنْهَا فِيهِ، وَيَكُونُ فِيهِ فِي سَفَرِهِ كَمَثَلِ مَا كَانَ فِيهِ..... (شرح مشکل الآثار: ۲۲۱/۲)

اور ”الحرام بین“ کا مطلب یہ ہے کہ چیزوں میں بہت سی ہیں، جن کی حرمت واضح ہے، جیسے سود کا حرام ہونا، شراب، خنزیر کا حرام ہونا وغیرہ۔

البتہ بعض وہ احکام ہیں جو حلال و حرام دونوں کا احتمال رکھتے ہیں، جیسے ملک و بیہین کے ذریعہ جمع بین الاختین کرنا، جس کو بعض حلال اور بعض حرام تصور کرتے ہیں۔

فَكَانَ مَعْنَى قَوْلِهِ: ”الْحَلَالُ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنَ“ هُوَ مَا كَانَ مِنَ الْحَلَالِ الْمُحْكَمِ، وَمِنَ الْحَرَامِ الْمُحْكَمِ، (شرح مشکل الآثار: ۲۲۲/۲)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جن کا حلال و حرام ہونا اپنی ذات و صفات میں اپنے ظاہری دلائل کی وجہ سے واضح ہو، ”وینہما مشتبهات“ یعنی بعض وہ چیزیں ہیں جن میں دو متعارض دلیلوں کی وجہ سے حرام و حلال کا شبہ ہوتا ہے۔

”الحلال بین والحرام بین“ ائی فی عینہا و وصفہا وینہما مشتبهات“ والمعنی انہما موحدۃ اکتسبت الشبہ من وجہین متعارضین۔ (فتح الباری: ۱۷۳/۱)

سوال:-

کیا مشتبه امور میں حکام کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا؟

جواب:-

یقیناً مشتبه امور میں حکام کو فیصلہ کرنے کا مجاز ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرے، جیسا

کہ حدیث میں ہے، مجتہد اجتہاد کرتا ہے اور اس کا اجتہاد درستگی کو پالیتا ہے، تو اسے دوہرا اجر ملتا ہے اور اگر غلطی ہو جاتی ہے تو ایک اجر ملتا ہے؛ کیوں کہ مجتہد غیر منصوص فیہ مسائل میں صرف اجتہاد کا مکلف ہے، اصابۃ الصواب کا مکلف نہیں، چاہے اس کا اجتہاد صواب پر مبنی ہو یا خطا پر۔

فَكَانَ جَوَابَنَا لَهُ فِي ذَلِكَ أَنَّ الْمُفْتَرَضَ عَلَى الْحُكَّامِ فِي ذَلِكَ بَعْدَ اجْتِهَادِ رَأْيِهِمْ فِيهِ
إِمْضَاءُ مَا يُؤَدِّيهِمْ فِيهِ أَرَأُوهُمْ إِلَيْهِ كَمَا أَمَرَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ....

عَنْ عَمْرِو بْنِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ
فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ فَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ".... (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۲۳)

اس کے بعد امام طحاوی لکھتے ہیں:

وَفِي ذَلِكَ مَا قَدْ دَلَّ أَنَّ الْمُفْرُوضَ عَلَى الْحُكَّامِ اسْتِعْمَالُ الْاجْتِهَادِ فِي مَا يَحْكُمُونَ
بِهِ، وَأَنَّهُ قَدْ يَكُونُ مَعَهُ الصَّوَابُ، وَقَدْ يَكُونُ فِيهِ الْخَطَأُ، وَأَنَّهُمْ لَمْ يُكَلَّفُوا فِي ذَلِكَ إِصَابَةَ
الصَّوَابِ، وَإِنَّمَا كَلَّفُوا فِيهِ الْاجْتِهَادَ، وَأَنَّهُ وَاسِعٌ لَهُمْ فِي ذَلِكَ إِمْضَاءُ الْحُكُومَاتِ عَلَيْهِ، ثُمَّ
يَرْجِعُ الْمَحْكُومُ لَهُمْ فِي ذَلِكَ إِلَى الْمَعْنَى الَّذِي كَانُوا عَلَيْهِ قَبْلَ تِلْكَ الْحُكُومَاتِ لَهُمْ مِنَ
الْوَرَعِ عَنِ الدُّخُولِ فِيهَا وَمِنَ الْإِقْدَامِ عَلَيْهَا.... (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۲۳)

سوال:

کیا اس کی کوئی مثال ہے جس کے ذریعے اس جنس کے مسئلہ کی حقیقت تک رسائی آسان ہو جائے۔

فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: فَهَلْ يَتَهَيَّأُ لَكَ كَشْفُ ذَلِكَ لَنَا فِي مَسْأَلَةٍ مِنْ هَذَا الْجِنْسِ حَتَّى نَقِفَ

عَلَيْهِ؟ (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۲۳)

جواب:

ہاں یہ مسئلہ مسلم ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے ”انت علی حرام“ کہا تو کیا اس کی بیوی مطلقہ ہو جائے گی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے۔

- (۱) بعض علماء کے نزدیک تین طلاق واقع ہوگی۔
- (۲) دوسرے کے یہاں ایلاء واقع ہوگا۔
- (۳) بعض علماء کے نزدیک ظہار ہوگا۔
- (۴) بعض علماء کے نزدیک ایک طلاق بائن واقع ہوگی۔
- (۵) بعض علماء کے نزدیک اس سے ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔

قُلْنَا لَهُ: نَعَمْ قَدْ اِخْتَلَفَ اَهْلُ الْعِلْمِ فِي رَجُلٍ قَالَ لِامْرَأَتِهِ: اَنْتِ عَلَيَّ حَرَامٌ، فَقَالَ قَائِلُونَ مِنْهُمْ: قَدْ طَلَّقْتَ عَلَيْهِ ثَلَاثَ تَطْلِيقَاتٍ لَا تَحِلُّ لَهُ بَعْدَهُنَّ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ، وَقَالَ قَائِلُونَ مِنْهُمْ: اِنَّهَا يَمِينٌ يَكُونُ بِهَا مُؤَلِيًا، وَقَالَ قَائِلُونَ مِنْهُمْ: اِنَّهَا ظَهَارٌ يُكْفَرُهَا مَا يُكْفَرُ الظَّهَارَ وَقَالَ قَائِلُونَ مِنْهُمْ: اِنَّهَا تَطْلِيقَةٌ تَبِينُ بِهَا مِنْهُ اِلَّا..... (شرح مشکل الآثار: ۲۲۳/۲)

اب اگر اس مسئلہ میں کوئی شخص اس کی حرمت کا قائل ہو، اتفاق سے وہ اس مسئلہ میں مبتلاء ہو گیا، اور مقدمہ کسی ایسے حاکم کی عدالت میں پیش ہوا، جو حلت کا قائل تھا، اور اس نے بقاء نکاح کا فیصلہ کر دیا، تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

اس سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔

چنانچہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ فیصلہ کے مطابق عمل کیا جائے گا، امام محمد اسی کے قائل ہیں، جب کے دوسرے علماء کی رائے ہے کہ قاضی کے فیصلہ کو مسترد کر دیا جائے گا، یہی قول امام

ابو یوسف کا ہے اور یہی قول زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ اس میں زیادہ احتیاط ہے۔

وَقَعَ فِي اخْتِلَافٍ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ، فَطَائِفَةٌ مِنْهُمْ تَقُولُ: لَهُ اسْتِعْمَالُ ذَلِكَ وَتَرْكُ رَأْيِهِ فِيهِ
الَّذِي يُخَالِفُهُ، وَمِمَّنْ كَانَ يَقُولُ ذَلِكَ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ، وَطَائِفَةٌ مِنْهُمْ تَقُولُ: بَلْ يَسْتَعْمَلُ
فِي ذَلِكَ مَا يَرَاهُ، وَيَتْرُكُ ذَلِكَ الْحُكْمَ إِذَا كَانَ إِنَّمَا هُوَ حُكْمٌ لَهُ لَا حُكْمٌ عَلَيْهِ، وَمِمَّنْ كَانَ
يَقُولُ ذَلِكَ أَبُو يُوسُفَ، وَهُوَ أَوْلَى الْقَوْلَيْنِ عِنْدَنَا بِالْحَقِّ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ.

(شرح مشکل الآثار: ۲/۲۲۵)

اقوال المحدثين:

امام طحاوی کے علاوہ دیگر محدثین کی رائے اس مسئلہ میں مختلف ہے، چنانچہ حضرت حسن بصری نیت کا اعتبار کرتے ہوئے ایک طلاق کے قائل ہیں، اور عدم نیت کی صورت میں ”انت علی حرام“ کو یمین کے معنی میں لیا ہے۔

أبي قال الحسن البصري: إذا قال لامرأته: انت علي حرام، الاعتبار فيه نيته،
ووصل عبدالرزاق هذا التعليق عن معمر عنه قال: إذا نوى طلاقاً فهو طلاق والافهوي يمين
وقول ابن مسعود وابن عمرو به قال النخعي وطاؤوس. (عمدة القاري: ۲۰/۳۲۰)

وبه قال النووي رحمته الله لكن قال ان نوى واحدة فهي بائن، وقال الحنفية مثله. (فتح

الباري: ۲۲۸/۹، ط: دار البيان القرى الازهر)

امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ ”انت علی حرام“ کے قول سے کوئی طلاق بغیر نیت کے واقع نہیں ہوگی، ہاں اس سے متکلم جتنی طلاق کا ارادہ کرے گا وہ طلاق واقع ہوگی، اور اگر اس

سے تحریم و تکرم کی نیت ہے، تو اس کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی؛ البتہ متکلم پر کفارہ یمین واجب ہوگا۔

وقال الشافعی لیس قوله ”انت علیّ حرام“ بطلاق حتی ینویہ فإن اراد الطلاق فهو ما اراد من الطلاق وان قال أردت تحریما لا طلاقا کان علیه کفارة یمین۔ (عمدة القاری: ۲۴۰/۲۴۰، ط: بیروت لبنان)



باب :- ۱۱۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيمَا سَكَتَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ

﴿مَسْكُوتٌ عَنْهُ أَمْرٌ كِي حَيْثِيَّتِ اُورِ حَكْمٌ كَا بِيَانِ﴾

عَنْ أَنَسٍ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُمْ سَأَلُوا النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالُوا: أَعَارِبٌ يَأْتُونَنَا بِلُحْمَانٍ مُشْتَرَحَةٍ، وَالْجُبْنِ، وَالسَّمْنِ، وَالْفِرَاءِ، مَا نَدْرِي مَا كُنْتُمْ إِسْلَامِيهِمْ؟ قَالَ: ”انظروا ما حَرَّمَ عَلَيْكُمْ فَأَمْسِكُوا عَنْهُ، وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَإِنَّهُ عَفَا لَكُمْ عَنْهُ، ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ (مريم: 64)، وَادْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ“ . (شرح مشکل الآثار:

۲۲۶/۲، ورواه الترمذي: (۱۷۲۶)، وابن مجه: (۳۳۶۷)، والبزار: (۲۲۳۱))

خلاصۃ الحدیث:

دین اسلام ایک دین فطرت ہے، اس میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے جو انسانوں کی طاقت سے باہر ہو، جیسا کہ باری تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (بقرہ: ۲۳۳) لہذا جن احکام سے سکوت برتی گئی ہے، وہ عفو ہیں، اگر اس کی تحقیق کرنا ضروری قرار دیا جاتا، تو انسان پر حرج عظیم لازم آتا، ایسے ہی مضمون کی طرف باب کی پہلی حدیث مشیر ہے۔

چنانچہ حضرت معاویہ بن قرۃؓ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ بہت سے اعرابی لوگ ہمارے پاس گوشت کے

ٹکڑے، پنیر، گھی اور دباغت دی ہوئی کھالیں لاتے ہیں؛ لیکن ہمیں ان کے اسلام کی حقیقت معلوم نہیں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ جو چیزیں تم پر حرام کی گئی ہیں، ان سے بچو! اور جن چیزوں میں سکوت اختیار کیا گیا، ان میں تم کو معاف کر دیا گیا، اور تمہارے پروردگار بھولے نہیں ہیں، اللہ رب العزت کا نام لیا کرو۔“

تعارض:

اس حدیث میں حلال و حرام چیزوں کے درمیانی چیزوں کو عفو قرار دیا گیا ہے، یعنی جس کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، جبکہ اس سے پہلے باب میں ان چیزوں کو مشتبہ اور واجب الاحتراز کہا گیا ہے اس اعتبار سے یہ باب اور اس سے پہلے باب کی دونوں حدیثوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جمع و تطبیق:

اصلاً مذکورہ دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ حدیث الباب میں ”ما سکت عنہ“ کا حکم بیان کیا گیا ہے وہ عفو ہے۔ اور ”ما سکت عنہ“ اس کو کہا جاتا ہے، جس کے حلال و حرام ہونے میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی ہے۔

لیکن اس سے پہلے باب کی حدیث میں حلال و حرام کے اعتبار سے چیزوں کو مشتبہ قرار دیا گیا ہے، یہ اس لئے کہ اس کے بارے میں متعارض نص وارد ہے، حقیقت میں دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔

نیز امام طحاویؒ نے فرمایا ہے کہ چیزوں میں سے (جو مسکوت عنہ کے قبیل سے ہیں، ان میں سے) بعض کو اللہ تعالیٰ نے حلال میں شامل کیا جو اس کے جنس سے ہیں؛ البتہ جو حرام کے جنس ہیں ان کو حرام قرار دیا ہے، جن چیزوں کے ظاہر کو دیکھ کر استعمال کرنے کا حکم دیا کہ یہ حلال

ہے، یہاں تک کہ ان کے علاوہ حرام چیزوں کا علم ہو جائے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے، تو لوگوں کو تنگی میں ڈالتے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و فضل سے لوگوں سے مشقت کو دور کیا۔

وَالْأَشْيَاءُ الْمُرَادَةُ فِي هَذَا عِنْدَنَا، وَاللَّهُ أَعْلَمُ هِيَ الْأَشْيَاءُ الَّتِي مِنْ جِنْسِ مَا ذَكَرَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ تَوْسِعَةً مِنَ اللَّهِ عَلَى عِبَادِهِ فِي الطَّعَامِ الَّذِي يَأْكُلُونَهُ مِنَ الذَّبَائِحِ الَّتِي أَبَاحَهَا اللَّهُ لَهُمْ مِنْ أَيْدِي مَنْ أَحَلَّ لَهُمْ ذَبَائِحَهُمْ وَحَرَّمَ عَلَيْهِمْ ذَبَائِحَ أَضْدَادِهِمْ مِنَ الْمَجُوسِ، وَعَبَدَةِ الْأَوْثَانِ وَجَعَلَ لَهُمْ اسْتِعْمَالَ ظَاهِرِهَا، وَعَلَى أَنَّهُمَا مِمَّا أَحَلَّ حَتَّى يَعْلَمُوا مَا سِوَى ذَلِكَ مِمَّا حَرَّمَ عَلَيْهِمْ، وَلَوْ شَاءَ عَزَّ وَجَلَّ لَضَيَّقَ ذَلِكَ عَلَيْهِمْ فَلَمْ يُبَحِّهِمْ أَكْلَ شَيْءٍ مِنَ اللَّحْمَانِ حَتَّى يَعْلَمُوا مَنْ ذَابِحُوهَا، وَهَلْ هُمْ مِمَّنْ يَحِلُّ ذَبَائِحُهُمْ أَمْ مِمَّنْ سِوَى ذَلِكَ؟ وَكَانَ فِي ذَلِكَ إِعْنَاتُ اللَّهِ تَعَالَى لَهُمْ كَمَا قَالَ: ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْتَنَّكُمْ﴾ (البقرة: 220) وَلَكِنَّهُ خَفَّفَ ذَلِكَ وَرَفَعَهُ عَنْهُمْ رَحْمَةً مِنْهُ لَهُمْ وَتَفَضُّلاً مِنْهُ عَلَيْهِمْ.

(شرح مشکل الآثار: ۲۲۸/۲-۲۲۷)

اقوال المحدثين:

صاحب ”الدر المنصور“ فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ کی حدیث میں جو حکم مذکور ہے یعنی عفو وہ مسکوت عنہ امر ہے اور نعمان ابن بشیرؓ کی حدیث میں جو حکم مذکور ہے، وہ امر مشتبہ ہے؛ لہذا یہاں چار مراتب ہوئے: (۱) حلال (۲) حرام (۳) مسکوت عنہ یعنی وہ شیء جس کے بارے میں نہ دلیل حلت موجود ہو اور نہ دلیل حرمت (۴) مشتبہ یعنی جس امر میں دلائل متعارض ہوں حلت و حرمت کے بارے میں تو اس کا حکم وجوب ترک ہے ”ترجیحاً للحرمة“۔

(الدر المنصور: ۵/۳۳۰)

حافظ ابن رجبؒ نے اپنی کتاب ”جامع العلوم والحکم“ میں بیان کیا ہے:

مسکوت عنہ وہ امر ہے جس کا حکم حلت و حرمت اور وجوب کے اعتبار سے مذکور نہ ہو، وہ

معفو عنہ ہے، اس کے فاعل پر کوئی حرج نہیں۔

قال الحافظ ابن رجب في "الجامع العلوم والحكم" ۲/۱۶۵-۱۳۶ بتحقیقنا
واما المسکوت عنه، فهو ما لم یذکر حکمہ بتحلیل ولا ایجاب ولا تحريم فيكون معفوا
عنه لا حرج على فاعله۔۔۔ (بحوالہ حاشیہ شرح مشکل الآثار: ۲/۲۲۹)

اسی طرح حافظ ابن رجب حضرت ابوالدرداءؓ سے تخریج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے، وہ حلال ہیں اور جن
چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، وہ حرام ہیں، اور جن کے سلسلہ میں خاموشی اختیار کی ہے، وہ معاف ہیں۔

عنه أن النبي ﷺ قال ما أحل الله في كتابه فهو حلال، وما حرم فهو حرام وما
سكت عنه فهو عفو فاقبلوا من الله عافيته فإن الله لم يكن لينسى شيئاً ثم تلا هذه الآية
﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ (مریم: ۶۳)۔

وقال الحاكم صحيح الاسناد (جامع العلوم والحكم: ۳/۲)

الغرض مسکوت عنہ کے سلسلہ میں علماء کی تین آراء ہیں:

ایک یہ ہے کہ وہ ممنوع ہے، دوسری مباح، تیسری رائے توقف ہے جیسا کہ علامہ ابن
دقیق العید نے اپنی کتاب "شرح الأربعین حدیثاً النوویة" میں ذکر کیا ہے:

اختلف العلماء في الأشياء قبل ورود الشرع بحكمها أهل هي على الحظر أو على
الإباحة أو الوقف على ثلاثة مذاهب وذلك مذکور فی کتب الاصول۔

(ص: ۷۲، مکتبۃ التراث الإسلامی بحوالہ ادارۃ الازھر)



باب :- ۱۱۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي أَمْرِ الرَّجُلَيْنِ اللَّذَيْنِ
كَانَا اخْتَصَمَا إِلَيْهِ فِي أَشْيَاءَ قَدْ كَانَ تَقَادَمَ أَمْرُهَا، وَذَهَبَ مَنْ يَعْرِفُهَا أَنْ يَقْسِمَاهَا
بَيْنَهُمَا وَأَنْ يُحْلِلَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بَعْدَ ذَلِكَ صَاحِبَهُ

﴿دوسرے کے مال پر ظماً قبضہ کرنے کا بیان﴾

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: اخْتَصَمَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ رَجُلَانِ فِي أَرْضٍ قَدْ هَلَكَ
أَهْلُهَا، وَذَهَبَ مَنْ يَعْلَمُهَا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، وَلَمْ يَنْزِلْ
عَلَيَّ فِيهِ شَيْءٌ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ، فَمَنْ أَقَطَعَ لَهُ قِطْعَةً مِنْ مَالِ
أَخِيهِ ظُلْمًا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِسْطَاطًا مِنْ نَارٍ فِي وَجْهِهِ" فَبَكَى الرَّجُلَانِ، وَقَالَ كُلُّ وَاحِدٍ
مِنْهُمَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ حَقِّي لَهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "تَوَخَّيَا، ثُمَّ اسْتَهِمَا ثُمَّ
لِيُحْلِلْ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْكُمَا صَاحِبَهُ" (شرح مشکل الآثار: ۲۳۰/۲، ورواه أبو داود: (۳۵۸۴)،

والدارقطني: (۳۵۸۵)، والبيهقي: (۶۶۷۶))

یہ بات مسلم ہے کہ شریعت مطہرہ قیامت تک کے لئے ہے، لیکن سلسلہ نبوت آپ
صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے، اس کے بعد ہر مومن پر ضروری ہے کہ اپنی مرضی سے اپنے آپ پر اللہ
کے احکام کو جاری کرے، مگر انسان کی طبیعت میں حرص اور خود غرضی اس طرح رکھی ہوئی ہے
کہ انسان کے ہاتھ سے راہ اعتدال کی رسی چھوٹ جاتی ہے، لیکن اس کو احساس بھی نہیں ہوتا، پھر
معاشرہ میں حق تلفی اور ظلم و زیادتی کی مختلف صورتیں پنپنے لگتی ہیں، اور یہ ظلم و زیادتی انسان کو باہمی

نزاع و اختلاف سے دوچار کرتی ہے، ایسے موقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ وہ کسی ایسی شخصیت یا ادارہ کے سامنے پہنچے، جو معاملات کی تحقیق کر کے حق اور ناحق کو متعین کرے اور دونوں فریقوں پر حق کو نافذ کر کے نزاع کو دور کرے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات میں امت پر لازم کیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکم بنائے، اور بارگاہ نبوی میں جو فیصلہ ہو، اس پر نہ صرف عمل کرے؛ بل کہ دل کی آمادگی کے ساتھ بسر و چشم اسے قبول بھی کرے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ﴾ (نساء: ۵۹)

(اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرے، تو اس امر کو اللہ اور رسول کی طرف حوالہ کر لیا کرو)۔

الغرض اس باب کی پہلی حدیث میں قضاة کو اصول قضاء کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہے، لیکن اگر بشر ہونے کی وجہ سے قاضی نے کسی کے حق میں غلط فیصلہ کر دیا تو مدعی کے لئے اس مال کا استعمال ناجائز ہوگا، بل کہ اس پر ضروری ہوگا کہ وہ مال صاحب مال کے حوالہ کر دے، ہاں اگر مدعی کو مدعی علیہ استعمال کی اجازت دیدے، تب اس کے لئے وہ مال مباح ہوگا، ورنہ وہ مال اس کے لئے حرام ہوگا، جس سے احتراز ضروری ہے، جیسا کہ یہ مضمون حضرت ام سلمہؓ کی روایت میں ہے۔

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: جَاءَ رَجُلَانِ مِنَ الْأَنْصَارِ يَخْتَصِمَانِ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَوَارِيثَ بَيْنَهُمَا قَدْ دَرَسَتْ لَيْسَتْ لَهُمَا بَيِّنَةٌ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَإِنَّهُ يَأْتِينِي الْخَصْمُ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَبْلَغَ مِنْ بَعْضٍ فَأَقْضِي لَهُ بِذَلِكَ وَأَحْسَبُ أَنَّهُ صَادِقٌ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِحَقِّ مُسْلِمٍ فَإِنَّمَا هِيَ قِطْعَةٌ مِنْ نَارٍ فَلْيَأْخُذْهَا، أَوْ فَلْيَدَعْهَا" فَبَكَى الرَّجُلَانِ وَقَالَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا: حَقِّي لِأَخِي، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَمَا إِذْ قَدْ فَعَلْتُمَا هَذَا فَأَذْهَبَا فَاقْتَسِمَا وَتَوَخَّيَا الْحَقَّ، ثُمَّ اسْتَهِمَا، ثُمَّ لِيَحْلِلْ كُلُّ

وَاحِدٍ مِنْكُمْ صَاحِبُهُ“ (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۳۲)

تعارض:

محلل کسی کے لئے مال کو حلال اور جائز اس وقت کر سکتا ہے جب کہ وہ (محلل) اس کا مالک ہو، صرف قبضہ میں ہونا کافی نہیں، لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تحلیل کا حکم دینا کیسے درست ہوگا؟ چوں کہ یہاں محلل اس زمین کا مالک نہیں ہے؟ (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۳۳)

جمع و تطبیق:

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث سے وہ معنی مراد نہیں لیا ہے جیسا کہ آپ نے سمجھا ہے؛ بل کہ اس سے یہ مراد لیا ہے کہ دوسرے کے حق کی وجہ سے اس کے لئے اس زمین سے انتفاع حرام تھا، لیکن جب صاحب حق نے انتفاع کی اجازت دے دی، تو اب اس کا استعمال درست اور جائز ہو گیا۔

فَكَانَ جَوَابًا لَهُ أَنَّ التَّحْلِيلَ الَّذِي فِي هَذَا الْحَدِيثِ لَمْ يُرَدِّ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا تَوَهَّمَهُ عَلَيْهِ، وَإِنَّمَا أَرَادَ بِهِ أَنَّ الشَّيْءَ الَّذِي يَفْتَسِمَانِيهِ قَدْ يَكُونُ فِيمَا أَخَذَهُ أَحَدُهُمَا حَقٌّ لِصَاحِبِهِ فَيَكُونُ حَرَامًا عَلَيْهِ أَخْذُهُ، وَحَرَامًا عَلَيْهِ الْإِنْتِفَاعُ بِهِ، وَإِذَا حَلَّلَهُ مِنْهُ حَلَّ لَهُ الْإِنْتِفَاعُ بِهِ، وَكَانَ ذَلِكَ حَرَامًا عَلَيْهِ لَوْلَمْ يَكُنْ ذَلِكَ التَّحْلِيلُ.

(شرح مشکل الآثار: ۲/۲۳۳)

اقوال المحدثين:

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ حکم بطور تقویٰ کے ہے (یعنی یہ حکم فتویٰ اور فیصلہ کے طور پر نہیں ہے)، هو الظاهر أن هذا من طريق الورع والتقوى لا من باب الحكومة والفتوى.

(مرقاۃ المفاتیح: ۷/۲۵۷) اور آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ مقدار حق کے تعین میں خیر کا ارادہ کرو، یہ اس بات پر دال ہے کہ صلح صرف شیء معلوم میں ہی صحیح ہوتی ہے اور خیر کا ارادہ کرنا مفید ظن ہے، اس لئے اس کے ساتھ قرعہ کو بھی شامل کر لیا، اور قرعہ ”بینہ“ کی ایک قسم ہے، تاکہ ان دونوں کا حق قوی ہو جائے، اور پھر تحلیل کا حکم دیا، تاکہ ان دونوں کی جدائی براءت اور طیب نفس کے ساتھ ہو اور اس میں دلیل یہ ہے کہ میراث مجہولہ ہمارے احناف کے نزدیک صحیح ہے، لہذا یہاں تحلیل احتیاط پر محمول ہے۔

علامہ خطابیؒ کی توجیہ:

لکھتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ صلح صرف شیء معلوم میں ہی درست ہے، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ان دونوں کو مقدار حق کی تعین میں خیر کا ارادہ طلب کرنے کا حکم دیا، پھر آپ ﷺ نے صرف ارادہ خیر پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ قرعہ کو بھی شامل کیا ہے اور یہ خیر کا ارادہ کرنا صرف ظن غالب ہے، اور قرعہ ”بینہ“ کی ایک نوع ہے، پس وہ ارادہ خیر کی طلب سے زیادہ قوی ہے، پھر آپ ﷺ نے ان دونوں کو تقسیم کے بعد تحلیل کا حکم دیا، تاکہ ان دونوں کے درمیان جدائی، براءت اور رضامندی کے ساتھ ہو۔

اور تحلیل اس چیز میں صحیح ہوتی ہے، جو ذمہ میں واقع ہو، نہ کہ اعیان میں؛ لہذا یہاں تحلیل سے وہ مراد لینا لازم آئے گا، جس عین چیز پر اس کی تقسیم واقع ہوتی ہے اور اس عین چیز پر دونوں میں سے کسی ایک کو خراج اور غلبہ حاصل ہو، اس کی تحلیل مراد ہے۔

قال الخطابی:

وفیه دلیل علی أن الصلح لا یصح الا فی الشیء المعلوم ولذلك أمرهما۔۔۔
بالتوخی فی مقدار الحق ثم تم یقنع علیہ السلام بالتوخی حتی ضم إلیہ القرعة؟ وذلك ان

النوخی انما هو اکثر الرأى وغالب الظن والقرعة نوع من البينة، فهى أقوى من القوخی، ثم امرها عليه السلام بعد ذلك بالتحليل ليكون افتراقها عن تعین برأة وطیب نفس فرضی وفيه دلیل على ان التحليل إنما یصح فیما كان معلوم المقدار غیر مجهول الكمية وقد جمع هذا الحديث ذكر القسمة والتحليل والقسمة لا تكون الا فی الأعیان والتحليل لا یصح الا فیما یقع فی الذمم دون الأعیان.

فوجب ان یصرف معنی التحليل إلى ما كان من خراج وغلة حصلت لأحدهما على العین التي وقعت فیہ القسمة انتهى. (عون المعبود: ۲۲۱/۶)

اور مولانا عاقل صاحب نے ”الدر المنضود“ میں لکھا ہے کہ: ہر ایک اس تقسیم سے اپنے ہی حق کو لینے کا ارادہ کرے، یعنی اس سے زائد نہیں، پھر جب وہ دو جگہ رکھا جائے، تو قرعہ اندازی کرو تعیین حصہ کے بارے میں، پھر جس کے نام جو حصہ نکلے وہ اس کو لے لے، اور اس کے باوجود بھی آپس میں ایک دوسرے کو اپنا حق معاف کرے اور یہ حکم احتیاطاً ہے۔

(الدر المنضود: ۲۲۷/۵)



باب :- ۱۱۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الْمُرَادِ بِقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَ كُمْ تَطْهِيرًا﴾ (الأحزاب: 33) مَنْ هُمْ؟

﴿اہل بیت کی فضیلت کا بیان﴾

عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدٍ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: لَمَّا نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ دَعَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلِيًّا، وَفَاطِمَةَ، وَحَسَنًا، وَحُسَيْنًا عَلَيْهِمُ السَّلَامُ، فَقَالَ: "اللَّهُمَّ هَؤُلَاءِ أَهْلِي". (شرح مشكل الآثار: ۲/۲۳۵)، ورواه مسلم: (۲۳۰۳) والترمذي: (۲۹۹۹)، احمد: (۱۸۵/۱)

خلاصہ الحدیث:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو تہذیب نفس، تصفیہ قلب اور تزکیہ باطن کے اعتبار سے اس مقام و مرتبہ پر فائز فرمایا ہے، جو دیگر انبیاء کرام سے ممتاز کرتا ہے، اور جس کے حصول کے بعد آپ ﷺ معصوم کہلائے گئے، اسی طرح آپ ﷺ کے اہل (اہل بیت) کو تہذیب نفس، تصفیہ قلب کے اعتبار سے اعلیٰ مقام و مرتبہ مرحمت فرمایا، جو دیگر امتیوں سے ممتاز و فائق کرتا ہے، جس کے حصول کے بعد محفوظ و مغفور کہلائے۔

الغرض باب کی پہلی حدیث رسول اللہ ﷺ اور اہل بیت کی فضیلت کے سلسلہ میں ہے، چنانچہ حضرت عامر بن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَ كُمْ تَطْهِيرًا﴾ (الأحزاب: 33) (اور اللہ

تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ اے گھروالوں تم سے آلودگی کو دور رکھے اور تم کو پاک صاف رکھے (نازل ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ اور حسینؓ کو بلایا اور فرمایا اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں، اور اس کی تائید حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے ”عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: ”نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ فِي رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلِيٍّ، وَفَاطِمَةَ، وَحَسَنٍ، وَحُسَيْنٍ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ ﴿۱۰﴾ اِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴿۱۱﴾ (الأحزاب: 33). (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۳۶)

سوال:

اس آیت میں اہل بیت سے کون مراد ہیں؟

جواب:

اہل بیت سے صرف امہات المؤمنین ہی مراد ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں مخاطب ازواج مطہرات ہی کو ہے۔

فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: فَإِنَّ كِتَابَ اللَّهِ يُدُلُّ عَلَى أَنَّ أَزْوَاجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُمُ الْمَقْصُودُونَ بِتِلْكَ الْآيَةِ؛ لِأَنَّهُ قَالَ قَبْلَهَا فِي السُّورَةِ الَّتِي هِيَ فِيهَا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ ﴿۱۰﴾﴾ (الأحزاب: 28) إِلَى قَوْلِهِ: ﴿يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ ﴿۱۱﴾﴾ (الأحزاب: 32) إِلَى قَوْلِهِ: ﴿الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾ (الأحزاب: 33) فَكَانَ ذَلِكَ كُفْلَهُ يَزِدُّنَ بِهِ؛ لِأَنَّهُ عَلَى خِطَابِ النِّسَاءِ لَا عَلَى خِطَابِ الرِّجَالِ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۳۷)، لیکن اس قول پر دو اعتراض ہوئے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

(۱) ایک اعتراض یہ ہے کہ آیت میں مذکر صیغہ کیوں استعمال کیا گیا ہے؟

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت عامر بن سعد عن ابیہ کی اس قول کے معارض ہے یعنی

حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف حضرت علیؓ، حسنؓ، حسینؓ اور فاطمہؓ کے لئے دعا

کی ہے، ازواج کو شامل نہیں کیا ہے۔

جواب اعتراض اول:

عربی زبان میں بسا اوقات مؤنث کے بجائے مذکر کا صیغہ مستعمل ہوتا ہے، کیونکہ مذکر کا صیغہ ”اہل“ کے اعتبار سے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ﴾ و اجاب الأولون عن هذا بأن التذكير باعتبار لفظ الاهل كما قال سبحانه ﴿قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَجِيدٌ﴾ (هود: ۴) و كما يقول الرجل لصاحبه كيف اهلك يريد زوجته أو زوجته. (تحفة الاحوذى: ۹۹/۹)

جواب اعتراض ثانی:

یہ آیت گرچہ ازواج مطہرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ لیکن چوں کہ آیت کا اسلوب عام ہے اور مؤنث کے بجائے مذکر ضمیر مستعمل ہے، اس لئے عام مردوں کی شمولیت کی بھی گنجائش ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کے لئے دعا کی، تاکہ وہ بھی آیت میں شامل ہو جائے، دوسری بات یہ ہے کہ خطاب نساء کے بعد ”لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ“ کے ذریعہ خطاب رجال بھی ہے، یہ بدیہی بات ہے اللہ تعالیٰ اپنے قول ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (الأحزاب: 33) سے شرافت رجال اور عظمت کونماں یا کرنے کے لئے مردوں کو مراد لیا ہے۔

فَكَانَ جَوَابًا لَهُ أَنْ الَّذِي تَلَاهُ إِلَى آخِرِ مَا قَبَلَ قَوْلِهِ: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ﴾ (التوبة: 55) الْآيَةَ خِطَابًا لِأَزْوَاجِهِ، ثُمَّ أَعْقَبَ ذَلِكَ بِخِطَابِهِ لِأَهْلِهِ بِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ﴾ (الأحزاب: 33) الْآيَةَ فَجَاءَ عَلَى خِطَابِ الرِّجَالِ، لِأَنَّهُ قَالَ فِيهِ: ﴿لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ

الْبَيْتِ وَيُطَهِّرُهُمْ ﴿(الأحزاب: 33) وَهَكَذَا خِطَابُ الرِّجَالِ، وَمَا قَبْلَهُ فَجَاءَ بِهِ بِالتُّونِ وَكَذَلِكَ خِطَابُ النِّسَاءِ فَعَقَلْنَا أَنَّ قَوْلَهُ: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ﴾ (الأحزاب: 33) الْآيَةَ خِطَابَ لِمَنْ أَرَادَهُ مِنَ الرِّجَالِ بِذَلِكَ لِيُعَلِّمَهُمْ تَشْرِيْفَهُ لَهُمْ وَرَفَعَتْهُ لِمُقْدَارِهِمْ أَنْ جَعَلَ نِسَاءَهُمْ مَنْ قَدْ وَصَفَهُ لِمَا وَصَفَهُ بِهِ مِمَّا فِي الْآيَاتِ الْمُتَلَوَاتِ قَبْلَ الَّذِي خَاطَبَهُمْ بِهِ تَعَالَى، وَمَادَّلَ عَلَى ذَلِكَ أَيْضًا. (شرح مشکل الآثار: ۲۳۷/۲)

قول ثانی:

اہل بیت سے صرف حضرت علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، اور حسینؑ ہی مراد ہیں، یہ اہل تشیع کا قول

ہے۔۔۔۔

فقد استدلل الروافض بهذا الحديث على أن أهل البيت هم علي وفاطمة وأولادهما فقط، وعلي أنهم معصومون من الخطاء لأن الله تعالى أذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهيرا. (فتح المسلم: ۸۳/۱۱)

اور حضرت زید بن ارقمؓ سے بھی یہی منقول ہے، اور غالباً حضرت ابوسعید خدریؓ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے، اور امام نوویؒ کا بھی اسی طرف رجحان معلوم ہوتا ہے، اور امام طحاویؒ کے طرز سے بھی یہی نقطہ نظر معلوم ہوتا ہے۔

فَدَلَّ مَا رَوَيْنَا فِي هَذِهِ الْآثَارِ مِمَّا كَانَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى أُمَّ سَلَمَةَ مِمَّا ذَكَرَ فِيهَا لَمْ يُرِدْ بِهِ أَنَّهَا كَانَتْ مِمَّنْ أُرِيدَ بِهِ مِمَّا فِي الْآيَةِ الْمُتَلَوَّةِ فِي هَذَا الْبَابِ، وَأَنَّ الْمُرَادِينَ بِمَا فِيهَا هُمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَعَلِيٌّ، وَفَاطِمَةُ، وَحَسَنٌ، وَحُسَيْنٌ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ دُونَ مَنْ سِوَاهُمْ. (شرح مشکل الآثار: ۲۳۵/۲)

مذکورہ حضرت سعد بن عامر عن ایہ اور اس جیسی دیگر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ

اہل بیت سے حضرت علیؑ، فاطمیؑ، حسنؑ، اور حسینؑ ہی مراد ہے۔

فقد استدل الروافض بهذا الحديث على أن أهل البيت هم علي وفاطمة وأولادهما فقط وعلي أنهم معصومون من الخطاء لأن الله تعالى أذهب عنهم الرجس وطهرهم تطييراً.
(فتح الملهم: ۸۳/۱۱)

تعارض:

لیکن ام سلمہؓ کی یہ روایت عنْ أُمِّ سَلَمَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَمَعَ فَاطِمَةَ، وَالْحَسَنَ، وَالْحُسَيْنَ، ثُمَّ أَدْخَلَهُمْ تَحْتَ ثَوْبِهِ ثُمَّ جَاءَ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى: "رَبِّ هَؤُلَاءِ أَهْلِي" قَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ: فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ فَتَدْخِلْنِي مَعَهُمْ؟ قَالَ: "أَنْتِ مِنْ أَهْلِي". (شرح مشکل الآثار: ۲۳۷/۲) باب کی پہلی روایت سے متعارض ہے، اس لئے اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات بھی اہل بیت کے مصداق میں شامل ہیں۔

امام طحاویؒ نے اس تعارض کا دو جواب دیئے ہیں:

جواب اول:

یہ عین ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اہل بیت سے ازواج مطہرات ہوں، اس لئے کہ عربی زبان میں بیوی کو "اہل بیت" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ حدیث افک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے بارے میں "من يعذرني من رجل قد بلغ آذاه في أهلي" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ قَوْلُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأُمِّ سَلَمَةَ جَوَابًا مِنْهَا لَهَا عِنْدَ قَوْلِهَا لَهُ: "تَدْخِلْنِي مَعَهُمْ": "أَنْتِ مِنْ أَهْلِي" فَكَانَ ذَلِكَ مِمَّا قَدْ يُجَوِّزُ أَنْ يَكُونَ أَرَادَ بِهِ أَنَّهَا مِنْ

أَهْلِهِ؛ لِأَنَّهَا مِنْ أَزْوَاجِهِ وَأَزْوَاجُهُ أَهْلُهُ، كَمَا قَالَ فِي حَدِيثِ الْإِفْكِ الَّذِي قَدْ... (شرح مشکل الآثار: ۲۳۷/۲)

اور حضرت ام سلمہ کی اس روایت سے اس بات کی تائید بھی ہوتی ہے:-

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ فِي بَيْتِي: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (الأحزاب: 33)، يَعْنِي فِي سَبْعَةِ جِبْرِيلَ، وَمِيكَائِيلَ، وَرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَعَلِيٍّ، وَفَاطِمَةَ، وَالْحَسَنَ، وَالْحُسَيْنَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَأَنَا عَلَى بَابِ الْبَيْتِ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَلَسْتُ مِنْ أَهْلِ الْبَيْتِ؟ قَالَ: "إِنَّكَ مِنْ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ" وَمَا قَالَ: "إِنَّكَ مِنْ أَهْلِ الْبَيْتِ". (شرح مشکل الآثار: ۲۳۹/۲)

جواب ثانی:

یہ ممکن ہے کہ ”انک من اہلی“ سے یہ مراد ہو کہ تو میرے متبعین میں سے ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: ”رب إن ابني من أهلي“ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”انه ليس من اهلك“ تو جس طرح اتباع نہ کرنے والوں کو اہل سے خارج کر دیا گیا (حالانکہ وہ ان کا صلی بیٹا ہے)، اسی طرح اتباع نہ کرنے والوں کو اہل میں شامل کیا گیا ہے، چاہے کوئی رشتہ ہو یا نہ ہو؟

اور اس بات کی تائید حضرت وائلہؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت وائلہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمیٰؓ، فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ کو ایک چادر میں لیا اور ”﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (الأحزاب: 33)“ پڑھی اور فرمایا ”اللهم هؤلاء اہلی، انہم اہل الحق“ حضرت وائلہ فرماتے

ہیں کہ میں نے کہا: حضور میں بھی آپ کے اہل میں سے ہوں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”وَأَنْتَ مِنْ أَهْلِ“ جبکہ حضرت وائلہ سے تعلق بھی نہیں تھا جو حضرت ام سلمہ سے تھا، اس لئے کہ وہ قریشی بھی نہیں تھے؟ اس جواب کو امام طحاوی نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

حَدَّثَنِي وَائِلَةُ قَالَ: أَتَيْتُ عَلِيًّا فَلَمْ أَجِدْهُ، فَقَالَتْ فَاطِمَةُ انْطَلِقْ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوهُ قَالَ: فَجَاءَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَدَخَلَ وَدَخَلَتْ مَعَهُمَا فَدَعَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحَسَنَ، وَالْحُسَيْنَ فَأَقْعَدَ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَلَى فِخْدِهِ، وَأَدْنَى فَاطِمَةَ مِنْ حِجْرِهِ وَرَزُو جِهَا، ثُمَّ لَفَّ عَلَيْهِمْ ثَوْبًا وَأَنَا مُتَبِدٌ، ثُمَّ قَالَ: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ﴾ (التوبة: 55) الْآيَةَ، ثُمَّ قَالَ: ”اللَّهُمَّ هَؤُلَاءِ أَهْلِي إِنَّهُمْ أَهْلُ حَقِّي“ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ وَأَنَا مِنْ أَهْلِكَ قَالَ: ”وَأَنْتَ مِنْ أَهْلِي“ قَالَ: وَائِلَةُ فَإِنَّهَا مِنْ أَرْجَى مَا أَرْجُو. وَوَائِلَةُ أَبْعَدُ مِنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ أُمَّ سَلَمَةَ مِنْهُ، لِأَنَّهُ إِنَّمَا هُوَ رَجُلٌ مِنْ بَنِي لَيْثٍ لَيْسَ مِنْ قُرَيْشٍ... (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۳۶)

فَمِثْلُ ذَلِكَ أَيْضًا مَا كَانَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَوَابًا لِأُمِّ سَلَمَةَ: ”أَنْتِ مِنْ أَهْلِي“ يُحْتَمَلُ أَنْ يَكُونَ عَلَى هَذَا الْمَعْنَى أَيْضًا، وَأَنْ يَكُونَ قَوْلُهُ لَهَا ذَلِكَ كَقَوْلِهِ مِثْلَهُ لَوَائِلَةَ... (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۳۶)

اقوال المحدثين:

مولانا عبدالرحمن صاحب مبارکپوری لکھتے ہیں کہ سورہ احزاب آیت (۳۳) کے سلسلہ میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے، حضرت ابن عباس، عکرمہ، عطاء، کلبی، مقاتل اور سعید بن جبیر نے فرمایا کہ یہاں اہل بیت سے مراد بالخصوص ازواج مطہرات ہیں، کیوں کہ بیت سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

گھر اور آپ ﷺ کی ازواج کی رہائش گاہ ہیں، اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

وَأَذْكُرَنَّ مَا يُثَلَّىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا
﴿الأحزاب: ۳۳﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ الٰی قوله.... لَطِيفًا خَبِيرًا

اور حضرت ابوسعید الخدریؓ، مجاہد، قتادہ اور حضرت کلبیؓ سے دوسرا قول یہ ہے کہ اہل بیت سے حضرت علی، حضرت فاطمہ، اور حضرات حسنینؓ مراد ہیں، ان حضرات نے یہ دلیل پیش کی ہیں کہ آیت میں خطاب کے لئے جو صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہ مذکر کا صیغہ ہے نہ کہ مؤنث کا ”قوله عنکم و لیطہرکم“ اگر عورتوں کے ساتھ خاص ہے تو اللہ تعالیٰ ”عنکن“ اور ”لیطہرکن“ مؤنث کا صیغہ ضرور استعمال کرتے جب کہ یہاں معاملہ تو اس کے برعکس ہے۔

وقال ابوسعید الخدری ومجاہد وقتادہ وروی عن الکلبی أن اهل البيت المذکورین فی الآیة، علی وفاطمة والحسن والحسین، خاصة ومن حججهم الخطاب فی الآیة بما یصلح للذکور لا للإناث وهو قوله عنکم و لیطہرکم، ولو كان للنساء خاصة لقال عنکن و لیطہرکن. (تحفة الاحوذی: ۲۶۷/۹)

اور فصل الخطاب میں امام فخر الدینؒ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ اہل بیت سے مراد آپ ﷺ کی اولاد اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات اور حضرات حسنین رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اور ان میں آپ ﷺ کی بیٹی کے ساتھ معاشرت اور آپ ﷺ کے ساتھ ملازمت کی بنا پر ان میں حضرت علیؓ بھی شامل ہیں۔

وقال فی (مفصل الخطاب) نقلا عن الامام فخر الدين: الأولى أن يقال: هم -- یعنی اهل البيت -- اولاده وازواجه صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ والحسن والحسين رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ منهم وعلی أيضا من اهل بيته لبسبب معاشرته بنت النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ وملازمته صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ. (لمعات التنقيح: ۲۹۱/۹)

امام نوویؒ کا قول:

یہ ہے کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں سے ہیں کہ ان لوگوں نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سکونت اختیار کیں، اور آپ کی کفالت میں رہیں۔

المراد انهن من اهل بيته الذين يساكنونه ويعولهم. (شرح مسلم للنووي: ۲/۲۸۰)



باب :- ۱۱۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي إِثْبَاتِ الشُّؤْمِ، وَمَا رُوِيَ عَنْهُ فِي نَفْسِهِ

﴿عورت، گھوڑا اور گھر سے بدشگونی لینے کا بیان﴾

عَنْ ابْنِ عُمَرَ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: ”إِنَّمَا الشُّؤْمُ فِي ثَلَاثَةٍ فِي الْمَرْأَةِ، وَالْفَرَسِ وَالذَّارِ“ . (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۴۹) ، ورواه البخاري: (۵۰۹۳) ، ومسلم: (۲۲۲۵) ، وأبو داود: (۳۹۲۲) ، والنسائي: (۲۲۰۷۶) .

شریعت مطہرہ نے مسلمانوں کو جہاں توکل علی اللہ کی اعلیٰ تعلیم دی ہے، جو صرف شریعت اسلامی ہی کا طرہ امتیاز ہے، وہیں شریعت مطہرہ نے مسلمانوں کو اسباب کے اختیار کرنے کی بھی اجازت دی ہے؛ لیکن ساتھ ہی ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال میں اس بات پر متنبہ فرمایا کہ اسباب کو اس طرح اختیار نہ کیا جائے کہ وہ توکل کے منافی ہو، کیونکہ ان اسباب کو اختیار کرنا توکل کے خلاف ہے، ان ہی اسباب میں سے ایک سبب بدشگونی (بدفالی) بھی ہے؛ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق الطیرۃ شِرْکُ، الطیرۃ شِرْکُ، الطیرۃ شِرْکُ (بدشگونی شرک ہے) فرمایا کہ مسلمانوں کو بدفالی کرنے سے ڈرایا۔

الغرض اس باب کی پہلی حدیث میں اسی بدفالی کے متعلق وارد ہوئی ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بدشگونی صرف عورت، گھوڑے اور گھر میں ہے۔

تعارض:

حضرت ابن عمرؓ اور حضرت حمزہ بن عبد اللہ عن ابیہ دونوں کی روایت میں اولاً مطلقاً طیرہ کی نفی کی ہے اور بعد میں تین چیزوں کا استثناء کیا گیا ہے؛ لیکن پہلی روایت میں عَنْ حَمَزَةَ، وَسَلِيمِ ابْنِي عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: ”إِنَّمَا السُّؤْمُ فِي ثَلَاثَةٍ فِي الْمَرْأَةِ، وَالْفَرَسِ وَالذَّارِ“ (شرح مشکل الآثار: ۲۵۰/۲)

فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ إِثْبَاتُ السُّؤْمِ فِي هَذِهِ الثَّلَاثَةِ الْأَشْيَاءِ، وَقَدْ رُوِيَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي ذَلِكَ مَا مَعْنَاهُ خِلَافُ هَذَا الْمَعْنَى. (شرح مشکل الآثار: ۲۵۰/۲) لہذا بظاہر تعارض ہے۔

جمع و تطبیق:

حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل جاہلیت کے عقیدہ کے متعلق خبر دی ہے کہ وہ ان تین چیزوں میں بدفالی کیا کرتے تھے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں صراحتاً مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اہل جاہلیت کی خبر دینے کے لئے وارد ہوا ہے، اور حضرت جابرؓ کی روایت میں مطلقاً طیرہ سے منع فرمایا ہے، جس میں یہ ہے کہ اشیاء ثلاثہ بھی شامل ہے، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشیاء ثلاثہ میں یمن (جو کہ بدفالی کی ضد ہے) کو ثابت فرمایا ہے، جیسا کہ حضرت معاویہ بن حکمؓ کی روایت میں ہے:

وَقَدْ رُوِيَ عَنْ عَائِشَةَ إِنَّكَارَ هَذَا ذَلِكَ، وَإِحْبَارَ هَذَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا قَالَ ذَلِكَ إِحْبَارًا مِنْهُ عَنْ أَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ أَنَّهُمْ كَانُوا يَقُولُونَ غَيْرَ أَنَّهَا ذَكَرْتُهُ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالطَّيْرَةِ لَا بِالسُّؤْمِ، وَالْمَعْنَى فِيهِمَا وَاحِدٌ، وَإِذَا كَانَ ذَلِكَ كَذَلِكَ كَانَ مَا رُوِيَ عَنْهَا مِمَّا حَفِظْتُهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ إِضَافَتِهِ ذَلِكَ الْكَلَامَ إِلَى أَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ أَوْلَى مِمَّا رُوِيَ عَنْ غَيْرِهَا فِيهِ عَنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۲۵۲/۲)

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ حَكِيمٍ، عَنْ عَمِّهِ مُحَمَّدِ بْنِ مُعَاوِيَةَ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُولُ: "لَا شَوْمَ، وَقَدْ يَكُونُ الْيَمْنُ فِي الْمَرْأَةِ، وَالْفَرَسِ، وَالذَّابَّةِ". (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۵۳)

اقوال المحدثین:

صاحب در المنصو و لکھتے ہیں کہ:

”ان تكن الطيرة“ سے مقصود اظہار تر و دو شک نہیں ہے، بل کہ اس سے بھی اثبات ہی مقصود علی وجہ المبالغہ ہے، جیسے یوں کہیں اگر میرا دنیا میں کوئی دوست ہے، تو وہ زید ہے، اسی طرح یہاں اس حدیث میں مقصود ہے کہ ان تین اشیاء میں طیرہ بالضرورة وبالیقین ہے۔ (الدر المنصود: ۱۲۰/۶)

ابن العربی فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیوں کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی، تو ان چیزوں میں ہوتی اور امام رازی نے یہ فرمایا ہے کہ اگر واقعی نحوست ہوتی، تو یہ تین چیزیں منحوس ہونے کے زیادہ لائق ہیں۔

قال ابن العربي معناه إن كان خلق الله الشؤم في شيء مما جرى من بعض العادة فانما يخلقه في هذه الاشياء، قال الرازي محمل هذه الرواية إن يكون الشؤم حقا فهذه الثلاثة احق به. (فتح الباری: ۱۵۰/۶)

مولانا یحییٰ کاندھلوی نے اپنے شیخ کی تقریر سے لکھا ہے، اس کی تطبیق کی صورت یہ ہے کہ نحوست سے ذاتی نحوست مراد ہے، اور یہاں ذاتی نحوست کی نفی کی گئی ہے، تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر کسی چیز میں ذات کے اعتبار سے نحوست ہوتی، تو ان تین چیزوں میں ضرور ہوتی، لیکن ان تین چیزوں میں نحوست نہیں ہے، تو دوسری چیزوں میں بھی نحوست نہیں ہوگی۔

ووجه الجمع بينهما ما كتب مولانا محمد يحيى من تقرير شيخه أن الطيرة بمعنى

الشؤم الذاتی، والنحوسية الخلقية، منتفیه حیث اوردها بلفظ ”ان“ الشرطیه الدالة علی أنه غیر واقع فالمعنی لو تحقق الشؤم بهذا المعنی، لکان فی هذه الثلاثة غیر متحقق فیها فلا یتحقق فی شیء. (بذل المجهود: ۱۱/۶۵)

اور صاحب لمعات رقمطراز ہیں:

اس باب میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ منفی روایت سے نحوست ذاتی کی نفی کی گئی ہے، اور اس کا اعتقاد رکھنا زمانہ جاہلیت کے امور میں سے ہے، اور تمام چیزوں میں مؤثر حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور ان چیزوں میں نحوست کا ہونا عادت اور تقدیر کی وجہ سے ہے، لہذا منفی روایت سے نحوست کی نفی مراد ہے اور مثبت روایت سے عادت اور خلق تقدیر مراد ہے، اور ان چیزوں کے ساتھ خاص کرنے کی حکمت تو شارع کے حوالہ سے ہے۔

ووجه التطبيق أن التأثير بالذات منفي، واعتقاده من أمور أهل الجاهلية، والمؤثر في الكل هو الله، والكل بخلقه وتقديره وإثباتها في هذه الأشياء بجريان عادة الله سبحانه بالخلق فيها وجعلها أسبابا عادية، فالنفي راجع إلى التأثير بالذات، والإثبات بالعادة، والحكمة في تخصيص هذه الأشياء موكولة إلى علم الشارع. (لمعات التنقيح: ۷/۵۳۶)



باب :- ۱۱۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الْغُولِ مِنْ إِثْبَاتِهِ، وَمِنْ نَفْيِهِ

﴿قَوْلِ رَسُولِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "لَا غُولَ" كَمَا مَفْهُومٌ أَوْ آيَةِ الْكُرْسِيِّ كِي تَلَاوَتِ كَابِيَانِ﴾

عَنْ أَبِي أَيُّوبَ أَنَّهُ كَانَ فِي سَهْوَةٍ لَهُ فَكَانَتْ الْغُولُ تَجِيءُ فِتْنًا خُذُ، فَشَكَى ذَلِكَ إِلَى النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ لَهُ: "إِذَا رَأَيْتَهَا فَقُلْ بِسْمِ اللَّهِ أَجِيبِي رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" فَأَخَذَهَا، فَحَلَفَتْ أَنْ لَا تَعُودَ، فَجَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُ: "مَا فَعَلْتَ أَسِيرُكَ؟" قَالَ: حَلَفْتُ أَنْ لَا تَعُودَ، فَقَالَ: "كَذَبْتَ وَهِيَ عَائِدَةٌ"، فَفَعَلَ ذَلِكَ مَرَّتَيْنِ، أَوْ ثَلَاثًا.... (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۵۶)، ورواه الترمذی: (۲۸۸۰)، وأحمد: ۴۲۳/۵، والطبرانی فی "الكبير": (۴۰۱۱))

خلاصہ الحدیث:

یقیناً شیطان انسان کا بڑا دشمن ہے، شروع سے انسان کو ضرر اور گزند پہنچانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے نیک اور مخلص بندوں کو شیطان کے مکر و فریب سے نجات دی ہے، وہیں اس سے خلاصی کے لئے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زبان سے کچھ دعائیں بھی بتلائی ہیں، ان میں ایک آیت الکرسی ہے۔

یہ وہ آیت ہے جو قرآن کی تمام آیات میں سب سے افضل آیت ہے، اور حدیث شریف میں اس کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کو ایک

قیدی کے جھوٹ اور مکر و فریب سے نجات پانے کے لئے یہی آیت کو پڑھ کر سونے کا حکم فرمایا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں ایسے کلمات سکھاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ اس وجہ سے نفع پہنچائے گا (اور وہ یہ ہے کہ) جب تم (سونے کے لئے اپنے بستر پر جاؤ تو آیت الکرسی ”اللہ لا إله إلا هو الحي القيوم الخ۔۔۔ وهو العلي العظيم“ تک پوری آیت پڑھو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ ہمیشہ ایک نگہبان (فرشتہ) رہا کرے گا، اور صبح تک تمہارے پاس کوئی شیطان (خواہ وہ انسان میں سے ہو یا جنات میں سے دینی یا دنیوی تکلیف و اذیت پہنچانے کے لئے) نہیں آئے گا، یہی پورا واقعہ حضرت ابویوب انصاریؓ کی روایت میں ذکر کیا گیا ہے۔

اشکال:

باب کی پہلی حدیث سے جن اور بھوت کا ثبوت ہوتا ہے؛ جبکہ اس سے پہلے باب کی احادیث میں سے حضرت جابرؓ کی حدیث میں ”لَا عَدْوَى وَلَا طَيْرَةَ وَلَا غُؤْلَ“ (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۵۳) اس کی نفی کی گئی ہے، اس طرح مذکورہ دونوں میں تعارض پایا جا رہا ہے۔

فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ إِبْتِثَاتُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغُؤْلَ . وَقَدْ ذَكَرْنَا فِي الْبَابِ الَّذِي قَبْلَ هَذَا الْبَابِ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: ”لَا غُؤْلَ“ فَفِي ذَلِكَ نَفْيُهُ لِلْغُؤْلِ . (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۵۷)

جواب:

در حقیقت دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے؛ کیوں کہ یہاں نسخ و منسوخ کا قاعدہ جاری کیا گیا ہے، چنانچہ حضرت ابویوبؓ کی حدیث مقدم ہے اور حضرت جابرؓ کی حدیث مؤخر ہے اور جو روایت مؤخر ہوتی ہے، وہ نسخ ہوتی ہے، لہذا حضرت جابرؓ کی حدیث سے

حضرت ابو ایوبؓ کی حدیث منسوخ ہے، جیسا کہ امام طحاویؒ نے ذکر کیا ہے:

فَقِيلَ لَهُ: لَيْسَ ذَلِكَ بِحَمْدِ اللَّهِ عَلَى التَّضَادِّ، إِذْ كَانَ قَدْ يُحْتَمَلُ أَنْ يَكُونَ الْغُولُ قَدْ كَانَ مَا فِي حَدِيثِ أَبِي أَيُّوبَ، ثُمَّ رَفَعَهُ اللَّهُ تَعَالَى عَنْ عِبَادِهِ عَلَى مَا فِي حَدِيثِ جَابِرٍ وَذَلِكَ أَوْلَى مَا حُمِلَتْ عَلَيْهِ الْأَثَارُ الْمَرْوِيَّةُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذَا. (شرح مشكل الآثار: ۲۵۷/۲)

اقوال المحدثين:

مولانا عبدالرحمن مبارکپوریؒ ”الجزری“ کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ حدیث ابو ایوب انصاریؓ اور حضرت جابرؓ کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے جن بھوت کی نفی کرنا مراد نہیں ہے بل کہ اس سے عرب والوں کے ایک جاہلانہ عقائد کی نفی کرنا مقصود ہے، کیوں کہ عرب والوں کا عقیدہ تھا کہ بیابان میں جن و شیاطین لوگوں کے سامنے آکر راستہ سے بھٹکا دیتا ہے، یا ہلاک کر دیتا ہے، تو آپ ﷺ نے ان کے اس عقائد جاہلانہ کی نفی کی ہے، اور آپ نے ”لا غول ولا صفر“ کے ذریعہ جن و شیاطین کی نفی کی ہے، لہذا دونوں حدیثوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔

وقال الجزري: الغول احد الغيلان وهي جنس من الجن والشياطين، كانت العرب تزعم أن الغول في الفلاة تترأوى للناس فتغول تغولا أي تلون تلونا في صور شتى وتغفلهم أي تضلهم عن الطريق وتهلكهم، فنفاه النبي ﷺ وأبطله يعني بقوله ”لا غول ولا صفر“. (تحفة الاحوذى: ۱۳۹/۸)

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ لکھتے ہیں:

یہاں ”لا غول“ سے اس کی تاثیر کی نفی مراد ہے، عین غول اور اس کے وجود کی نفی مراد

نہیں ہے۔

”لا عُول“ بضم العین نوع من الجن كانوا يريدون أن له تأثيرا في الاضلال عن الطريق والاهلاك، وانه يتصور بصور مختلفة، فنفي الشارع التأثير، وليس هدا نفي العین الغول ووجوده فقد جاء إن الأذان يدفع الغيلان. (بذل المجهود: ۶۳۳/۱۱)

اسی طرح صاحب لمعات^{لتنقیح} نے لکھا ہے:

یہاں ”لا عُول“ سے عین بھوت اور اس کے وجود کی نفی مراد نہیں ہے، بل کہ لوگوں کے اس گمان کو باطل کرنا مقصود ہے کہ وہ مختلف شکلیں اختیار کرتے ہیں، اور لوگوں کو بہکاتے ہیں۔

ولیس قولہ: ”لا عُول“ نفي لعین الغول ووجوده وانما فيه ابطال زعم العرب في اغتياله وتلونه في الصور المختلفة يقول: لا تصدقوا. (لمعات التنقيح: ۵۳۰/۷)

نیز صاحب عون المعبود قلم بند کرتے ہیں:

”لا عُول“ سے عین غول کی نفی مراد نہیں، بل کہ لوگوں کے اس زعم کو دور کرنا ہے کہ وہ بھوت مختلف شکلیں اختیار کرتے اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ کوئی بھی شریر جن انسان کو گمراہ کرنے پر قادر نہیں۔

وقيل قوله ”لا عُول“ ليس نفي لعین الغول ووجوده وانما فيه ابطال زعم العرب في تلونه بالصور المختلفة واغتياله فيكون المعنى بقوله لا عُول أنها- لا تستطيع أن تضل أحدا. (عون المعبود: ۲۱۱/۱۰)



باب :- ۱۱۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ: "أَقْرُوا الطَّيْرَ عَلَى مَكَانَتِهَا"

﴿ قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم "أَقْرُوا الطَّيْرَ عَلَى مَكَانَتِهَا" کے مفہوم کا بیان ﴾

عَنْ أُمِّ كُرَيْزٍ قَالَتْ: أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَدِيثِ فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ: "أَقْرُوا الطَّيْرَ عَلَى مَكَانَتِهَا". (شرح مشکل الآثار: ۲۵۸/۲)، ورواه أبو داود: (۳۸۵۵)،
والحاكم: ۲۳۷/۲، والبيهقي: ۳۱۱/۹))

خلاصہ الحدیث:

اسلام سے پہلے عرب میں بہت سے ایسے اعمال و افعال مروج تھے، جو عقیدہ قضاء و قدر کے خلاف تھے ان میں سے ایک عمل یہ تھا کہ پرندوں کے ذریعہ بدشگوننی اس طرح لیتے کہ پرندہ اگر دائیں طرف اڑتا، تو اسے نیک فالی کی علامت تصور کرتے؛ لیکن اگر اس کا پرواز بائیں طرف ہوتا، تو اسے بد فالی اور ناکامی کا سبب جان کر سفر ملتوی کر دیتے؛ مگر اسلام نے اس غلط عقیدہ کی تردید کی ہے، کہ کامیابی اور ناکامی کا تعلق قضاء و قدر سے ہے؛ لہذا پرندوں کو تکلیف پہنچا کر شگون اور بد فالی لینا درست نہیں ہے، چنانچہ حدیث الباب میں یہی مضمون مذکور ہے۔

بہر حال اس حدیث کے شان و رود کے سلسلے میں علماء کے مختلف آراء و اقوال ہیں، لیکن ان میں سے سب سے بہتر قول دو ہیں، جس کو امام طحاوی نے امام شافعی سے روایت کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ امام شافعی حدیث مذکور "أَقْرُوا الطَّيْرَ عَلَى مَكَانَتِهَا" (پرندوں کو ان کے انڈوں پر بیٹھا

رہنے دو) کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ایام جاہلیت میں عرب والوں کا یہ جاہلانہ عقیدہ تھا کہ جب وہ کسی کام کے ارادے سے گھر سے نکلتے تے، تو سب سے پہلے جو پرندہ نظر آتا، اسے اڑاتے تھے کہ اس کام میں کامیابی ہے؟ پھر وہ اپنے کام کی طرف آگے بڑھتے اور اگر وہ پرندہ دائیں طرف سے اڑ کر بائیں جانب سے گزرتا، تو اس سے بدفالی لیتے اور سمجھتے کہ اس میں ناکامی ہے؛ چنانچہ وہ وہیں سے واپس ہو جاتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی دن وہ اپنے گھر سے نکلتا اور کوئی پرندہ نظر نہیں آتا، تو وہ پرندے کے گھونسلے کو حرکت دیتا، تا کہ وہ دیکھے کہ پرندہ کدھر کو اڑتا ہے، اور اسی پر وہ اپنی تقدیر کا فیصلہ کرتا تھا، اس لئے حدیث میں ”أَفْرُوا الطَّيْرَ عَلَى مَكْنَاتِهَا“ سے ان کے اس جاہلانہ عقائد کی تردید کی گئی ہے ”پرندے کے گھونسلے کو حرکت دے کر اسے مت اڑاؤ“ اس کو اپنے انڈوں پر بیٹھے رہنے دو، کیونکہ پرندہ تمہاری تقدیر کا فیصلہ نہیں کر سکتا، دراصل تقدیر تو قضاء الہی میں سے ہے، اس کے بعد امام طحاوی نے فرمایا کہ یہ بہتر جواب ہے، امام شافعی کے اس جواب کو اختیار کرنے سے دیگر اشکالات و جوابات اور مزید کلام کی ضرورت نہیں۔

فَسَمِعْتُ الْمُزَنِّيَّ يَقُولُ: قَالَ الشَّافِعِيُّ فِي قَوْلِهِ: "أَفْرُوا الطَّيْرَ عَلَى مَكْنَاتِهَا" كَانَ أَحَدُهُمْ إِذَا غَدَا مِنْ مَنَزَلِهِ يُرِيدُ أَمْرًا يُطَيِّرُ أَوَّلَ طَائِرٍ يَرَاهُ فَإِنْ سَنَحَ عَنْ يَسَارِهِ فَاجْتَالَ عَنْ يَمِينِهِ قَالَ: هَذِهِ طَيْرُ الْأَيَّامِ فَمَضَى فِي حَاجَتِهِ وَرَأَى أَنَّهُ سَيَسْتَنْجِحُهَا، وَإِنْ سَنَحَ عَنْ يَمِينِهِ فَمَرَّ عَنْ يَسَارِهِ قَالَ: هَذِهِ طَيْرُ الْأَشَائِمِ فَرَجَعَ، وَقَالَ: هَذِهِ حَاجَةٌ مَشْتَوْمَةٌ، وَإِذَا لَمْ يَرَ طَائِرًا سَانِحًا وَرَأَى طَائِرًا فِي وَكْرِهِ حَرَكَهَ مِنْ وَكْرِهِ، لِيَطِيرَ فَيَنْظُرَ مَا يَسْلُكُ لَهُ مِنْ طَرِيقِ الْأَشَائِمِ، أَوْ مِنْ طَرِيقِ الْأَيَّامِ فَيَسْبُهُ قَوْلُهُ: "أَفْرُوا الطَّيْرَ فِي مَكْنَاتِهَا" أَيُّ لَا تُحَرِّ كُوهَا فَإِنَّ تَحْرِيكَهَا وَمَا تَعْمَلُونَ لَهُ مِنَ الطَّيْرَةِ لَا يَصْنَعُ شَيْئًا، وَإِنَّمَا يَصْنَعُ فِيمَا تَتَوَجَّهُونَ لَهُ قَضَاءُ اللَّهِ تَعَالَى

.....الخ۔

فَهَذَا جَوَابٌ حَسَنٌ يُغْنِينَا عَنِ الْكَلَامِ فِي هَذَا الْبَابِ بِغَيْرِ مَا ذَكَرْنَا فِيهِ عَنِ الشَّافِعِيِّ .

(شرح مشکل الآثار: ۲/۲۵۹)

اقوال المحدثين:

(۱) ملا علی قاریؒ نے بھی قریب قریب یہی بات ذکر کی ہے، چنانچہ ان کی عبارت یہ ہے:

كان الرجل في الجاهلية اذا اراد حاجة اتي طيرا في وكره فنفره فاذا طار ذات اليمين مضى لحاجته وان طار ذات الشمال رجع فنهوا عن ذلك أي لا تزجروها وأقروها على مواضعها فانها لا تضر ولا تنفع. (مرقاة المفاتيح: ۷/۷۲۴)

(۲) محدث کبیر شیخ خلیل احمد سہارنپوریؒ نے بھی ”بذل المجہود“ میں علامہ طیبی کے حوالے سے یہی بات نقل کی ہے:

”كان الرجل في الجاهلية اذا اراد حاجة اتي طيرا في وكره، فنفره، فإن طار ذات اليمين مضى لحاجته، وإن طار ذات الشمال رجع، فنهوا عن ذلك أي: لا تزجروها وأقروها على مواضعها فانها لا تضر ولا تنفع. (بذل المجہود: ۶۰۷/۹)

(۳) علامہ مناویؒ نے بھی ”فیض القدير“ میں یہی بات نقل کی ہے:

أي اقروها في او كارها فلا تنفروها عن بيضها ----- كان احدهم اذا سافر نفر طير أفان طار يميناً تفأول وان طار شمالاً تشاؤم ورجع. (فيض القدير: ۷۰/۲)



باب :- ۱۱۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي أَمْرِهِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ فِي حَجِّهِ بِالْقِيَامِ
عَلَى بُدْنِهِ وَبِمَا أَمَرَ بِهِ فِي ذَلِكَ وَخَاطَبَهُ بِهِ فِيهِ

﴿ قصاب کو اجرت کے طور پر ذبیحہ کا ایک حصہ دینے کا بیان ﴾

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ أُقِيمَ عَلَى بُدْنِهِ وَأَنْ
أُقَسِّمَ جُلُودَهَا وَجِلَالَهَا وَأَمَرَنِي أَنْ لَا أُعْطِيَ الْجَازِرَ مِنْهَا شَيْئًا، وَقَالَ: "نَحْنُ نُعْطِيهِ مِنْ
عِنْدِنَا". (شرح مشكل الآثار: ۲/۲۶۰، ورواه البخاری: (۱۷۱۶)، ومسلم (۱۳۱۷)، وأبو داود: (۱۷۶۹))

خلاصہ الحدیث:

تملیک کی دو قسمیں ہیں: تملیک الاعمیان اور تملیک المنافع، پھر ان دونوں میں سے ہر
ایک کی دو قسمیں ہیں: بعوض اور بلاعوض، اگر تملیک العین بالبعوض کی صورت ہے، تو یہ صورت بیع
کی ہے؛ لیکن تملیک المنافع بالمنافع ہے، تو اسے شریعت میں اجارہ کہتے ہیں، اور اجارہ میں
اجرت کا متعین ہونا ضروری ہے؛ چونکہ قربانی کے جانور کو ذبح کرنے کے لئے قصاب سے خدمت
لینا اجارہ کے قبیل سے ہے، جس کی اجرت اس عمل کے ایک جز کو متعین کرنا اور ذبیحہ کا ایک حصہ
بطور اجرت کے دینا درست نہیں ہے، چنانچہ اسی بنا پر باب کی پہلی حدیث میں یہ مضمون وارد
ہوا ہے، حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے بدنوں
کی نگرانی کے لئے مقرر کیا اور فرمایا کہ اس کی جھول کھال وغیرہ صدقہ کر دو، نیز فرمایا کہ قصاب کو

اس کے گوشت میں سے کچھ نہ دینا۔

تعارض:

حدیث الباب سے سمجھ میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے قصاب کو جانوروں کا گوشت دینے سے مطلقاً منع فرمایا ہے؛ لیکن اگر وہ قصاب مسکین ہے، تو اس کو قربانی کے جانور کا گوشت دیکر مساکین کی طرح دینے کی اجازت دی ہے۔

وَفِي هَذَا الْحَدِيثِ بَيَانٌ مِّنْعِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلِيًّا مِنْ إِعْطَاءِ الْجَزَارِ مِنْهَا شَيْئًا أَنَّهُ كَانَ فِي جَزَارَتِهِ إِيَّاهَا الَّتِي يَسْتَحِقُّهَا، وَأَنَّ ذَلِكَ لَمْ يُرَدِّ بِهِ أَنْ لَا يُعْطِيَهُ إِنْ كَانَ مِسْكِينًا مِنْهَا كَمَا يُعْطَى مَنْ سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاكِينِ مِنْهَا. (شرح مشکل الآثار: ۲۶۳/۲)

جمع و تطبیق:

امام طحاوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو اجرت کے طور پر دینے سے منع کیا ہے، اس لئے کہ عامل کے عمل کے ایک چیز کو اجرت بنانا لازم آتا ہے اور یہ درست نہیں، نہ کہ مسکین ہونے کی حیثیت سے؛ لہذا مسکین ہونے کی حیثیت سے دینا جائز ہے جیسا کہ دیگر مسکینوں کو دیا جاتا ہے۔

مِّنْعِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلِيًّا مِنْ إِعْطَاءِ الْجَزَارِ مِنْهَا شَيْئًا أَنَّهُ كَانَ فِي جَزَارَتِهِ إِيَّاهَا الَّتِي يَسْتَحِقُّهَا، وَأَنَّ ذَلِكَ لَمْ يُرَدِّ بِهِ إِلَّا يُعْطِيَهُ إِنْ كَانَ مِسْكِينًا مِنْهَا كَمَا يُعْطَى مَنْ سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاكِينِ مِنْهَا. (شرح مشکل الآثار: ۲۶۳/۲)

اقوال المحدثین:

حافظ ابن حجرؒ اور علامہ بغویؒ نے بھی اس تعارض کی یہی توجیہ فرمائی ہے، جو امام طحاویؒ نے

فرمائی ہے، کہ قصاب کو بطور اجرت کے گوشت دینا درست نہیں، تاہم فقراء کو دینے میں کوئی قباحت نہیں۔

قال والنهي عن اعطاء الجزار المراد به ان لا يعطي منها عن اجرتہ وكذا قال البغوی فی ”شرح السنة“ وأما اذا اعطى أجرته كاملة ثم تصدق على الفقراء فلا بأس بذلك. (فتح الباری: ۳۸۰/۳)

سوال:

فقہی اعتبار سے اس باب کی روایات و آثار سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں؟

فَسَأَلُ سَائِلٌ عَنْ مَا فِي هَذِهِ الْآثَارِ مِنَ الْفَوَائِدِ مِنْ وُجُوهِ الْفِقْهِ. (شرح مشکل الآثار: ۲۶۳/۲)

جواب:

بلاشبہ ان روایات سے بے شمار فوائد حاصل ہوئے ہیں، خاص طور پر امام طحاوی نے یہاں ذکر کیا ہے کہ ان آثار سے درج ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں:

- (۱) ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ صاحب جانور خود اپنے جانور کی قربانی کرے۔
- (۲) دوسرا فائدہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو ہدی کی جھول اور لگام کو صدقہ کرنے کا حکم دیا۔
- (۳) ہدی کی نخر اور ذبح پر اجرت لینا جائز ہے، جو صاحب ہدی پر واجب ہوتی ہے۔
- (۴) بدنہ کو نخر کے بعد اس کا گوشت ہدی کرنے والا کھا سکتا ہے۔

(۵) ہدایا میں شرکت جائز ہے۔

وَفِيهِ أَيْضًا إِجَازَتُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ الشَّرِكَةَ فِي الْهَدَايَا. (شرح مشکل الآثار: ۲۶۷/۲)

(۶) ہدی کی ناک میں چاندی کی نتھیاں پہنانا درست ہے۔

الْأُجْرَةُ وَفِيهِ أَيْضًا إِجَازَتُهُ اسْتِعْمَالَ الْفِضَّةِ فِي الْبُرَّةِ لِلْهَدَايَا. (شرح مشکل الآثار:

۲۶۷/۲)



باب :- ۱۱۸

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ: "أَنَا كُمْ أَهْلُ الْيَمَنِ هُمْ أَلْيَنُ قُلُوبًا وَأَرْقُ أَفْعِدَةً الْإِيْمَانُ يَمَانٌ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَّةٌ" وَمَنْ أَهْلُ الْيَمَنِ الَّذِينَ عَنَاهُمْ بِذَلِكَ؟

﴿ یمن والوں کے ایمان کی فضیلت کا بیان ﴾

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: "أَنَا كُمْ أَهْلُ الْيَمَنِ أَلْيَنُ قُلُوبًا، وَأَرْقُ أَفْعِدَةً، الْإِيْمَانُ يَمَانٌ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَّةٌ". (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۶۸)، ورواه البخاري: (۳۳۹۰)،
وَأحمد في "الفضائل": (۱۶۵۶)

خلاصہ الحدیث:

انسان پر اللہ تعالیٰ کے ان گنت احسانات اور انعامات ہیں، ان میں سب سے عظیم اور مہتمم بالشان نعمت "ایمان" کی نعمت ہے، روئے زمین پر نہ اس سے بڑھ کر کوئی اور نعمت موجود ہے، نہ اس کے برابر، دنیا کی ہر نعمت، آسائش و سہولت، آرام و راحت چار روزہ اس مختصر زندگی کے ساتھ ختم ہو جائے گی، لیکن ایمان وہ نعمت ہے، جس کا ثمرہ دونوں جگہوں میں باقی رہے گا، نیز اس کے ساتھ ساتھ عمل صالح کی وجہ سے مؤمنین کے ایمان میں زیادتی ہوتی رہے گی، اسی وجہ سے کسی کا ایمان دوسرے کے مقابلہ میں اقویٰ ہوتا ہے، تو کسی کا ادنیٰ۔

چنانچہ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کی تعریف و تحسین فرمائی کہ اہل یمن تمہارے پاس آئیں گے، وہ بڑے نرم دل والے ہوں گے اور ایمان یمن کا ایمان ہے اور حکمت

تو یمن کی حکمت ہے۔

الغرض اس تعریف تحسین کا پس منظر یہ ہے کہ دربار رسالت میں بنو تمیم کے کچھ افراد آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے بنو تمیم بشارت ہو!، انہوں نے اس سے بشارت مال سمجھ کر کہا کہ لایئے، جلدی دیجئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات ناگوار گزری، اسی اثنا میں اہل یمن کا وفد آیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی یہی ارشاد فرمایا کہ اے اہل یمن تمہیں بشارت ہو! انہوں نے دین کو ترجیح دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں آپ کی بشارت قبول ہے، ہم آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ آپ سے ”تفقه فی الدین“ حاصل کریں، تو جواب سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اور ان کے حق میں تشبیہی کلمات ارشاد فرمائے۔

تعارض:

اہل یمن سے کون مراد ہے؟ حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں: اس سے اہل تہامہ مراد ہے، لیکن حضرت ابوسعید انصاریؓ کی روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں ”أَشَارَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ نَحْوَ الْيَمَنِ فَقَالَ: ”الْإِيمَانُ هَاهُنَا أَلَا وَإِنَّ الْقَسْوَةَ وَغِلْظَ الْقُلُوبِ فِي الْفَدَّادِينَ أَصْحَابِ الْإِبِلِ حَيْثُ يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ فِي رَبِيعَةَ، وَمُضَرَ“۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۷۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلوں کی سختی ربیعہ اور مضر میں ہے اور اہل تہامہ میں سے اکثر مضر سے تعلق رکھتے ہیں، لہذا دونوں روایتوں میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے، اس طور پر کہ حدیث اول میں بقول سفیان بن عیینہ اہل تہامہ کے دلوں میں نرمی ہے اور دوسری روایت میں ہے کہ اہل تہامہ میں سختی ہے۔

فَأَضَافَ الْقَسْوَةَ وَغِلْظَ الْقُلُوبِ إِلَى الْفَدَّادِينَ مِنْ رَبِيعَةَ، وَمُضَرَ، فَكَانَ فِي ذَلِكَ مَا قَدَّ دَلَّ عَلَى أَنَّ الْمُضَافَ إِلَيْهِمْ مِنَ الْإِيمَانِ، وَالْحِكْمَةِ وَالْفِقْهِ هُمْ أَضْدَادُهُمُ الَّذِينَ لَيْسُوا مِنْ

رَبِيعَةَ، وَلَا مُضَرَ. (شرح مشکل الآثار: ۲۷۲/۲)

جواب:

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ حدیث اول میں لفظ ”یمن“ سے یمن مراد ہے، نہ کہ تہامہ، جیسا کہ فرمایا:

أَنَّ أَهْلَ الْيَمَنِ الْمُرَادِينَ كَمَا فِي الْآثَارِ الْأُولِ هُمْ الْأَشْعَرِيُّونَ، وَأَمْثَالُهُمْ مِنَ الْقَادِمِينَ مِنْ حَقِيقَةِ الْيَمَنِ دُونَ مَنْ سِوَاهُمْ. (شرح مشکل الآثار: ۲۷۷/۲)

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: لَمَّا قَدِمَ أَهْلُ الْيَمَنِ قَالَ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ”قَدْ أَقْبَلَ أَهْلُ الْيَمَنِ هُمْ الَّذِينَ قُلُوبًا مِنْكُمْ، وَهُمْ أَوْلَى مَنْ جَاءَ بِالْمُصَافِحَةِ“. (شرح مشکل الآثار: ۲۷۷/۲)

اقوال المحدثين:

صاحب فتح الملہم فرماتے ہیں کہ حدیث میں یمن سے مراد وہ لوگ ہیں، جو سکنی اور قبیلے کے اعتبار سے یمن کی طرف منسوب ہوں۔

وحاصله ان قوله ”یمن یشتمل من نسب الی الیمن بالسکنی وبالقبیلۃ۔ (فتح

الملہم: ۸/۲)

علامہ نووی نے اس بارے میں علامہ عبید کے حوالے سے چار اقوال نقل کرنے کے بعد ابن الصلاح کی تردید کی اور صحیح قول جو ابن الصلاح نے بیان فرمایا ہے اس کو نقل کیا ہے:

قال الشيخ ابو عمرو رحمة الله: لو جمع ابو عبید ومن سئل سبیلہ طرق الحدیث بالفاظہ کما جمعہا مسلم وغیرہ، وتاملوها الصار والی غیر ما ذکر وہ، ولما ترکوا الظاہر ولقضوا بان المراد الیمن واهل الیمن علی ما هو المفہوم من إطلاق ذلک اذ من الفاظہ:

اتاکم اهل اليمن والانصار من جملة المخاطبين بذلك نهى: اذاً غیر ہم وکذاک قولہ علیہ السلام جاء اهل اليمن دائماً جاء حنیئذ غیر الانصار ثم انه صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ ومنهم بما يقضى بكمال إيمانهم ورقب عليه الإيمان يمان فكان ذلك إشارة للإيمان إلى من إشارة اهل اليمن، لا إلى مكة والمدينة ولا مانع من اجراء الكلام على ظاهره وحمله على اهل اليمن حقيقة لان من اتصف بشيء وقوى قيامه به وناله اطلاعة عنه بنسب ذلك الشيء اليه إشعار بتيميزه بل وكمال حاله فيه وهكذا كان اهل اليمن حنیئذ في الإيمان۔ الخ۔

(شرح المسلم للنووي: ۳/۱۲۰-۳۱۹)

حافظ ابن حجرؒ ابن الصلاحؒ اور ابو عبیدہؒ دونوں کے قول کو ذکر کرنے کے بعد تطبیق دیتے

ہوئے فرمایا:

ولا مانع ان يكون المراد لقوله "الإيمان يمان" ما هو أعم مما ذكره ابو عبید وما ذكره ابن الصلاح وحاصله! أنه قوله "يمان" يشتمل من ينسب الى اليمن بالسكنى وبالقبيلة، لكنه كون المراد به من ينسب بالسكنى أظهر، بل هو مشاهد في كل عصر في احوال سكان جهة اليمن وجهة الشمال، فغالب من يوجد جهة اليمن رفاق القلوب والأبدان وغالب من يوجد جهة الشمال غلاظ القلوب والأبدان۔

(فتح الباري: ۸/۱۱۵-۱۱۴)

علامہ ابن العربی الممالکی لکھتے ہیں:

"يمان" کا مطلب مکہ، مدینہ اور وہاں کے لوگ ہیں، اس سے مراد رسول اللہ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ، مہاجر اور انصار کی اولاد ہیں۔

قولہ "الإيمان يمان" یعنی بقعة یرید مکة والمدينة وناسا المعنى بذلك رسول الله

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ والمهاجرين أولاداً لأنصار. (عارضه الأحمدي شرح ترمذي: ۱۳/۲۹۱)

قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف اشارہ کر کے جو کلام فرمایا ہے یعنی ”الایمان لہنا“ سے مراد مکہ ہے، کیوں کہ وہ تہامہ کے اندر ہے اور تہامہ یمن میں ہے اور بعض نے اس سے مکہ اور مدینہ مراد لیا ہے، وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلام اس وقت ارشاد فرمایا ہے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک میں تھے اور مکہ اور مدینہ تبوک اور یمن کے درمیان ہیں، اور بعض نے اس سے مقام تہامہ کو مراد لیا ہے، جو نجد کے مقابلہ میں ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد انصار ہیں، کیوں کہ وہ اصل میں یمن کے رہنے والے تھے۔

اخیر میں امام نوویؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ظاہرات یہی ہے کہ کلام اس کے ظاہری معنی پر ہی محمول ہوں گے، لہذا اہل یمن پر حقیقتہً محمول کیا جائے گا۔

قال القاضي: فقیل یعنی بہ مکة لانها من تھامة، وتھامة یمن، وقیل یعنی مکة والمدینة لانه قاله وهو بتبوك وهما حینئذ بینہ وبين الیمن، والمعنی علیہما مبدأ الایمان مکة أو مکة والمدینة، وقیل أراد تھامة التي هی مقابلة لنجد، وقیل أراد الانصار لانهم یمانیون۔۔۔

قال النووي والظاهر اجراء الكلام على ظهره وحمله على أهل اليمن حقيقة.

(الکوکب الوہاج والروض البہاج شرح صحیح مسلم: ۲/۲۱۱)



باب :- ۱۱۹

باب بیان مُشکلِ مَارَوِي عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي قَوْلِهِ: ”أَقْرَبُهُمْ، يَعْنِي أُمَّتَهُ لِكِتَابِ اللَّهِ أَبِي بَنِ كَعْبٍ، وَأَقْرَبُهُمْ زَيْدٌ، وَأَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ“

﴿ حضرت اُبی بن کعبؓ، حضرت زید بن حارثہؓ، اور

حضرت معاذ بن جبلؓ کے مناقب کا بیان ﴾

عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: ”أَزْحَمُ أُمَّتِي بِأُمَّتِي أَبُو بَكْرٍ، وَأَشَدُّهُمْ فِي أَمْرِ اللَّهِ عُمَرُ، وَأَصْدَقُهُمْ حَيَاءُ عَثْمَانَ، وَأَقْرَبُهُمْ لِكِتَابِ اللَّهِ أَبِي بَنِ كَعْبٍ، وَأَقْرَبُهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ، وَأَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ، أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَمِينًا أَلَا وَإِنَّ أَمِينَ هَذِهِ الْأُمَّةِ أَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ.“ (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۷۹)، ورواه النسائي في (فضائل الصحابة): (۱۳۸)، وأحمد: (۲۸۱/۳)

خلاصہ الحدیث:

جہاں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر انبیاء پر فوقیت عطا کی ہے، وہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسے اصحاب کا انتخاب کیا، جو انبیاء کے بعد روئے زمین پر سب سے بہترین کہلائے گئے، ان کو قرآن کریم نے ”رضی اللہ عنہ ورضو عنہم“ کا پروانہ سنا دیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد مرتبہ ان کی اجتماعی فضیلت کو بیان کیا ہے؛ لیکن اس کے باوجود ہر ایک میں کچھ خاص اور امتیازی صفت تھی، مثلاً حضرت ابو بکرؓ میں امت سے ہمدردی، حضرت عمرؓ میں دین کے معاملہ میں سختی، حضرت عثمانؓ میں حیا، حضرت اُبی میں قرأت قرآن کا ملکہ، الغرض ان صحابہ کرام کی یہ انفرادی خصوصیت تھی، جس کی وجہ سے دوسرے صحابہ کرام سے

ممتاز تھے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ان صحابہ کرامؓ کی خوبیوں کو نمایاں کیا ہے۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت پر، میری امت میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں، اللہ کے معاملہ میں سب سے زیادہ سختی کرنے والے عمر فاروقؓ ہیں، سب سے زیادہ باحیاء حضرت عثمانؓ ہیں، سب سے زیادہ قرآن عظیم کی اچھی تلاوت کرنے والے ابی بن کعبؓ ہیں، علم فرائض کو سب سے زیادہ جاننے والے زید بن ثابتؓ ہیں، اور حلال و حرام کو سب سے زیادہ جاننے والے معاذ بن جبلؓ ہیں، سن لو! ہر امت کے لئے ایک امین ہوتا ہے اور اس امت کا امین ابو عبیدہ ابن الجراحؓ ہیں رضی اللہ عنہ۔

اشکال:

سوال یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ روایت میں چند صحابہ کرام (حضرت ابی بن کعب، زید بن ثابت، معاذ بن جبلؓ) وغیرہ کی امتیازی خصوصیت ذکر کی گئیں ہیں، تو کیا یہ صحابہ ان مخصوص صفات میں خلفاء راشدین اور دیگر تمام صحابہ سے بھی افضل ہیں؟

فَسَأَلَ سَائِلٌ عَنِ الْمُرَادِ بِمَا ذُكِرَ بِهِ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْ أُنْبِيَ، وَزَيْدٍ، وَمُعَاذٍ فِي هَذَا الْحَدِيثِ، وَهَلْ يُوجِبُ ذَلِكَ لَهُ أَنْ يَكُونَ فِي مَعْنَاهُ الَّذِي ذُكِرَ بِهِ فَوْقَ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ وَمَنْ سِوَاهُمْ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَجْمَعِينَ؟

(شرح مشکل الآثار: ۲/۲۸۰)

جواب:

امام طحاوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی مخصوص صفات کی

وجہ سے مرتبہ میں بڑھا ہوا ہو، تو اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان صفات کے اعتبار سے عام لوگوں میں افضل ہیں، اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ صفات دوسرے لوگوں میں نہیں ہیں؛ بل کہ وہ صفات ان لوگوں میں بھی موجود ہوتی ہیں، جو درجہ میں ان کے برابر ہوں یا اس سے بھی بڑھے ہوئے ہوں۔

فَكَانَ جَوَابِنَا لَهُ فِي ذَلِكَ أَنَّ مَنْ جَلَّتْ رُتْبَتُهُ فِي مَعْنَى مِنَ الْمَعَانِي جَازَ أَنْ يُقَالَ إِنَّهُ أَفْضَلُ النَّاسِ فِي ذَلِكَ الْمَعْنَى، وَإِنْ كَانَ فِيهِمْ مَنْ هُوَ مِثْلُهُ أَوْ مَنْ هُوَ فَوْقَهُ.

(شرح مشکل الآثار: ۲۸۱/۲)

نظیر:

امام طحاوی نے حدیث سے اس کی جو نظیریں پیش کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خوارج کے متعلق فرمایا: ”وہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسا کہ تیرکمان سے اور وہ مخلوق میں سے سب سے زیادہ بد بخت ہیں“ حالانکہ مخلوق میں سب سے زیادہ بد بخت وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں؛ مگر خوارج کو ایک مخصوص صفات میں ہونے کی وجہ سے ”شرار الخلق والخلق“ کہا گیا ہے اور اس طرح بھی کہا جاتا ہے کہ اگرچہ ان سے بھی زیادہ کوئی دوسرا شقاوت میں بڑھا ہوا کیوں نہ ہو۔

عَنِ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي وَصْفِهِ الْخَوَارِجَ بِالصَّلَاةِ وَالصَّوْمِ، ثُمَّ قَالَ: ”يَمْرُقُونَ مِنَ الدِّينِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ شِرَارَ الْخَلْقِ وَالْخَلِيقَةِ“.

(شرح مشکل الآثار: ۲۸۶/۲)

وَقَدْ عَلِمْنَا أَنَّ مَنْ نَحَلَ لِلَّهِ وَلَدًا، أَوْ أَشْرَكَ بِهِ، وَقَتَلَ أَنْبِيَاءَهُ وَكَذَّبَ رُسُلَهُ شَرٌّ مِنْ هَؤُلَاءِ؛ لَمَّا عَظَّمْ مَا كَانَ مِنْهُمْ وَجَلَّ جَازَ بِذَلِكَ أَنْ يُقَالَ: هُمْ شَرُّ الْخَلْقِ وَالْخَلِيقَةِ، وَجَازَ

لِمَنْ تَفَرَّدَ مِنْهُمْ بِمَا تَفَرَّدَ بِهِ فِي عَلِيٍّ أَنْ يُقَالَ: هُوَ أَشَقَى الْبَرِيَّةِ وَإِنْ كَانَ فِيهَا مَنْ هُوَ فِي الشَّقْوَةِ
مِثْلَهُ أَوْ مَنْ هُوَ فِي الشَّقْوَةِ فَوْقَهُ. (شرح مشکل الآثار: ۲۸۷/۲)

الغرض اس طرح کے الفاظ اس شخص کے لئے استعمال کرنا درست ہے، جن کو ان صفات میں کمال حاصل ہوں، اگرچہ دوسرے کئی اشخاص ان صفات میں ان کے برابر ہوں یا ان سے بڑھے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں اور یہ وسعت لغت کی وجہ سے ہے، مثلاً کوئی شخص علم میں بلند مقام رکھتا ہے، تو ان کو ”إنه أعلم الناس“ کہہ دیا جاتا ہے، دراصل حالانکہ اس کو کہنے والا شخص تمام لوگوں سے متعارف نہ ہو۔

جَازَ إِطْلَاقُ ذَلِكَ لَهُ عَلَى مَا فِي الْحَدِيثِ؛ لِجَلَالَةِ مِقْدَارِهِ فِي الْمَعْنَى الَّذِي أُضِيفَ
إِلَيْهِ فِيهِ، وَلِعُلُوِّ رُبُوبِيَّتِهِ فِيهِ وَإِنْ كَانَ قَدْ يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ فِي أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ مَنْ هُوَ فِي ذَلِكَ الْمَعْنَى مِثْلَهُ، وَمَنْ هُوَ فَوْقَهُ فِي ذَلِكَ الْمَعْنَى؛ وَهَذَا السَّعَةِ اللَّغَةِ وَلِعِلْمِ
الْمُخَاطَبِينَ بِذَلِكَ مُرَادَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا خَاطَبَهُمْ بِهِ فِيهِ، وَلَوْلَا أَنَّ ذَلِكَ
كَذَلِكَ مَا جَازَ أَنْ يُقَالَ لِمَنْ عَظُمَتْ رُبُوبِيَّتُهُ فِي الْعِلْمِ وَجَلَّ مِقْدَارُهُ فِيهِ: إِنَّهُ أَعْلَمُ النَّاسِ إِذْ كَانَ
الَّذِي يَقُولُ ذَلِكَ لَهُ لَا يَعْرِفُ النَّاسَ جَمِيعًا، وَلَا يَقِفُ عَلَى مَقَادِيرِ عُلُومِهِمْ..

(شرح مشکل الآثار: ۲۸۸/۲-۲۸۷)

ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ:

”واقضاهم علی“ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؑ قضاء کے احکام کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، امام نوویؒ اپنے فتاویٰ میں اس جملے کے بارے میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ ”واقضاهم علیؑ“ فرمانے سے ”واقضاهم من ابی بکر و عمر“ کا معنی لازم نہیں آتا،

اگر ثابت بھی ہو جائے، تب بھی حضرت علیؓ کے ”اقضی“ ہونے سے ان کا ”اعلم من غیرہ“ ہونا لازم نہیں آتا، اگر تھوڑی دیر کے لئے فرص بھی کر لیا جائے کہ وہ ”اعلم من غیرہ“ ہیں، تو اس سے ان کا افضل ہونا لازم نہیں آتا، یعنی فضیلت میں بڑھ جانا، ثواب میں بڑھ جانے کو مستلزم نہیں ہے۔

”واقضاهم علی“ أي اعلم باحكام الشرع۔ قاله شارح والأظهر أن معناه أعلم باحكام الخصومة المحتاجة الى القضاء قال النووي في فتاوى قوله أقضاكم على لا يقتضى أنه اقضى من ابى بكر وعمر، لأنه لم يثبت كونهما من المخاطبين وان ثبت فلا يلزم من كون واحد أقضى من جماعة كونه أقضى من كل واحد يعنى لاحتمال التساوى مع بعضهم ولا يلزم من كون واحد أقضى أن يكون أعلم من غيره ولا يلزم من كونه أفضل يعنى لا يلزم من كونه أكثر فضيلة كونه أكثر ثبوتة كذا فى الازهار.

(مرقاة المفاتيح: ۱۱/۳۶۱)



باب :- ۱۲۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ نَهْيِهِ عَنِ الْحَلْفِ بِغَيْرِ اللَّهِ تَعَالَى، وَمِنْ مَا رُوِيَ عَنْهُ مِنْ حَلْفِهِ بِغَيْرِ تَعَالَى، وَمَا نَسَخَ مِنْ ضِدِّهِ مِنْهُ

﴿غیر اللہ کے نام کی قسم کھانے کا بیان﴾

عَنْ عُمَرَ قَالَ: كُنْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَسِيرٍ لَهُ، أَوْ قَالَ: فِي سَفَرٍ فَقُلْتُ: لَا وَابِي، فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ خَلْفِي: "لَا تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ" فَالْتَفَتُ فَإِذَا هُوَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (شرح مشكل الآثار: ۲۸۹/۲)، وعلقه البخاري: (۶۶۴)، ومسلم: (۱۶۳۶)، والترمذي: (۱۵۳۳)

خلاصہ الحدیث:

اسلام وہ واحد مذہب ہے جو توحید کا معلم اول ہے، اور روز اول سے ہی مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کریں، صرف اتنا ہی نہیں؛ بل کہ دل میں کسی کی اتنی تعظیم کرنے سے منع کیا ہے، جو رفتہ رفتہ اللہ کے ساتھ شرک تک پہنچا دے، اس لئے مذہب اسلام نے ایسی چیزوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیا؛ کسی کی قسم کھانا یہ دل میں اس کی تعظیم کرنے کے مترادف ہے، اس لئے باب کی پہلی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع فرمایا، البتہ ضرورت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قسم کھانے کی اجازت دی ہے۔

جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

سفر میں تھا اور میں نے کسی بات پر فرمایا ”لا ابي“ یعنی غیر اللہ کی قسم کھائی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اپنے آباء کی قسم نہ کھاؤ۔

تعارض:

حدیث الباب سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے، جبکہ دوسری بعض احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر اللہ کی قسم کھائی ہے، جیسا کہ حضرت طلحہؓ سے اعرابی کے بارے میں جو روایت ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”أَفْلَحَ، وَأَبِيهِ إِنْ صَدَقَ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَأَبِيهِ إِنْ صَدَقَ“ ففِي هَذِهِ الْأَنْارِ الَّتِي رَوَيْنَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَيْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنْ يُحْلَفَ بِغَيْرِ اللَّهِ، وَقَدْ رُوِيَ عَنْهُ أَنَّهُ أَخْرَجَ فِيهَا حَلْفَهُ بِغَيْرِ اللَّهِ تَعَالَى. (شرح مشکل الآثار: ۲۹۲/۲)

جواب:

امام طحاوی نے تعارض کا جواب یہ دیا ہے کہ باب کی پہلی حدیث جس میں غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع کیا ہے وہ نسخ ہے اور وہ روایت جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر اللہ کی قسم کھانا مروی ہے، وہ منسوخ ہے اور حضرت قتیلہ بنت صیفی کی روایت اس نسخ پر دال ہے:

فَكَانَ جَوَابَنَا لَهُ فِي ذَلِكَ أَنَّ ذَلِكَ لَا تَضَادُّ فِيهِ، وَلَكِنْ فِيهِ مَعْنَيَانِ مُخْتَلِفَانِ كَانَ أَحَدُهُمَا فِي وَقْتٍ، وَكَانَ الْآخَرُ فِي وَقْتٍ آخَرَ، وَكَانَ الْآخِرُ مِنْهُمَا نَاسِخًا لِلْأَوَّلِ مِنْهُمَا.

(شرح مشکل الآثار: ۲۹۳/۲)

دلیل نسخ:

حضرت قتیلہ بنت صیفیؓ کی روایت میں اس بات کی دلیل ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانے

والی روایت ناسخ ہے، چنانچہ اس روایت میں یہ مضمون ہے کہ ایک یہودی عالم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا اے محمد! اگر تم شرک نہ کرو، تو تم سب سے اچھی قوم ہو؛ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سبحان اللہ“ یہ کیسے؟ کہ تم قسم کھاتے ہو، تو تم کہتے ہو ”والکعبۃ“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد فرمایا، یہ اس شخص کے بارے میں ہے، جو قسم کھاتا ہے، چنانچہ تم میں سے جو قسم کھانا چاہتے ہیں، وہ ”والکعبۃ“ کی بجائے ”برب الکعبۃ“ کہے۔

عَنْ قُتَيْبَةَ بِنْتِ صَيْفِي الْجُهَنِيَّةِ قَالَتْ: أَتَى حَبْرًا مِنَ الْأَحْبَارِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ نِعَمَ الْقَوْمِ أَنْتُمْ لَوْلَا أَنْتُمْ تُشْرِكُونَ، فَقَالَ: ”سُبْحَانَ اللَّهِ“ قَالَ: إِنَّكُمْ تَقُولُونَ إِذَا حَلَفْتُمْ وَالْكَعْبَةَ قَالَ: فَأَمْهَلْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا، ثُمَّ قَالَ: ”إِنَّهُ قَدْ قَالَ لِمَنْ حَلَفَ فَلْيَحْلِفْ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ“ (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۹۵)

اقوال المحدثين:

علامہ سہارنپوریؒ بذل المجہود میں فرماتے ہیں کہ قسم والی حدیث نبی والی حدیث سے پہلے کی ہے یا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کا قصد نہیں فرمایا تھا؛ بل کہ یہ ان الفاظ میں سے ہے جو بلا قصد زبان پر آجاتے ہیں، یا اس میں لفظ رب محذوف ہے۔

فان قيل ما الجامع بين هذا وبين النهي عن الحلف بالآباء؟ أجيب بأن ذلك كان قبل النهي أو انما كلمة جارية على اللسان لا يقصد بها الحلف كما جرى على لسانهم ”عقرى حلفى وما أشبه ذلك او فيه إضمار اسم الرب كأنه قال: ورب أبيه. (بدل المجہود: ۱۰/۵۲۶)

علامہ ابن حجرؒ فتح الباری میں علامہ بیضاویؒ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ تقریر میں یہ لفظ صرف تاکید کے لئے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے قسم مراد نہیں لی جاتی ہے۔

”قال البيضاوي: هذا اللفظ من جملة ما يزداد في الكلام لمجرد التقرير والتأكيد ولا يراد به القسم.“ (فتح الباری: ۳۸۲/۱۳)

علامہ شبیر احمد عثمانی ”فتح الملہم“ میں فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں قسم تاکید کے لئے ہے، نہ کہ تعظیم کے لئے، اور جس قسم سے منع کیا گیا ہے، وہ تعظیم والی قسم ہے، نہ کہ تاکید والی۔

”ان القسم يقع في كلام العرب بوجهين: الأول للتعظيم، والثاني: لتأكيد والنهي إنما وقع عن الأول دون الثاني.“ (فتح الملہم: ۱۵۳/۸)

اور صاحب فتح الملہم رقم طراز ہیں کہ ”وأييه وأبيك“ کا لفظ کبھی کبھار تعجب کے لئے استعمال ہوتا ہے، البتہ قسم کا معنی اس وقت مراد ہوتا ہے، جبکہ اس سے قسم کا ارادہ ہو، اور اس لفظ سے قسم کا معنی مراد لینا منع ہے؛ لیکن تعجب کا معنی مراد لینا منع نہیں ہے۔

”ان كلمة ”وأييه أبيك“ ربما تستعمل للتعجب دون القسم والنهي عنه ما أريد به القسم لا ما أريد به التعجب.“ (فتح الملہم: ۱۵۵/۸)

صاحب عون المعبود لکھتے ہیں:

”أفصح وأبييه“ اس کی متعدد توجیہات لکھی گئی ہیں:

ایک یہ ہے کہ یہ روایت منسوخ ہے، یا ”أبييه“ سے پہلے لفظ ”رب“ کو مقدر مانا جائے گا، یا یہ کلمہ یمین کے قصد کے بغیر تاکید یا تقریر از بان پر جاری ہوا ہے۔

”أفصح وأبييه“ لعل هذا وقع قبل ورود النهي أو التقدير ورب أييه أو كلمة جرت على اللسان من غير أن يقصد بها اليمين.“ (عون المعبود: ۷۹/۹)



باب :- ۱۲۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيمَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللَّهِ تَعَالَى
مَا حُكْمُهُ فِي ذَلِكَ؟

﴿غیر اللہ کے نام کی قسم کھانا شرک ہے﴾

عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَيْدَةَ قَالَ: كُنْتُ جَالِسًا مَعَ ابْنِ عُمَرَ فَسَمِعَ رَجُلًا يَقُولُ: كَلًّا وَأَبِي
فَقَالَ: كَانَ عُمَرُ يَحْلِفُ بِهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "إِنَّهَا شِرْكٌ فَلَا تَحْلِفُ بِهَا". (شرح
مشکل الآثار: ۲۹۶/۲)، ورواه الترمذي: (۱۵۳۵)، وأبو داود: (۳۲۵۱)، وأحمد: (۳۳۷۲)

عَنْ عُمَرَ قَالَ: لَا وَأَبِي فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ حَلَفَ بِشَيْءٍ
دُونَ اللَّهِ فَقَدْ أَشْرَكَ". (شرح مشکل الآثار: ۲۹۷/۲)

خلاصہ الحدیث:

اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت و بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے مخلوق کو مختلف طریقوں سے اپنی
عبادت کا حکم فرمایا ہے، بندوں کا ان سے روگردانی کرنا اور ان میں اللہ کے علاوہ دوسرے کو
شریک کرنا کفر و شرک کا موجب اور انتہائی درجہ کی ناشکری ہے، اور جرم عظیم ہے، لیکن اللہ کے
نام کی قسم کھانا اس کی بڑائی کو ظاہر کرنا یہ بھی ایک طرح کی عبادت میں شامل ہے، اس لئے حدیث
کے اندر اللہ کے علاوہ کسی اور کے نام سے قسم کھانے کو شرک قرار دیا ہے۔

چنانچہ حضرت سعد ابن عبادہؓ ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ میں ابن عمرؓ کے ساتھ بیٹھا ہوا

تھا تو ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا ”کلا و اُبی“ (ہرگز نہیں میرے باپ کی قسم) چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ اس سے قسم کھاتے، تو نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ یہ ”شُرک ہے“ اس سے تم قسم نہ کھاؤ۔ دوسری ایک روایت میں ابن عمرؓ حضرت عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ ”لا و اُبی“ (نہیں میرے باپ کی قسم) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جو شخص اللہ کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم کھائے تو اس نے شرک کیا، وجہ اس کی یہ ہے کہ خالق اپنے خلق میں سے جس کے نام کی چاہے اس کی قسم کھائے؛ مگر مخلوق صرف خالق کے نام کی ہی قسم کھا سکتی ہے۔

اشکال:

مذکورہ حدیث کے اندر غیر اللہ کی قسم کھانے کو شرک قرار دیا گیا ہے، جبکہ شرک نام ہے اللہ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک کرنا، جو بالکل حرام اور موجب کفر ہے، اور قسم میں یہ بات نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ تعظیماً کسی کی قسم کھائی جاتی ہے؟

فَكَانَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّ مَنْ حَلَفَ بِشَيْءٍ دُونَ اللَّهِ فَقَدْ

أَشْرَكَ. (شرح مشکل الآثار: ۲۹۷/۲)

جواب:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ اس سے وہ شرک مراد نہیں ہے جس کی وجہ سے انسان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے؛ بل کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی کی قسم کھائے، کیونکہ جب غیر اللہ کی قسم کھائے گا، تو اس نے اسی کو مخلوف بہ بنایا، جیسا کہ اللہ کو مخلوف بہ بنایا جاتا ہے، تو اس اعتبار سے مخلوف بہ بنانے میں شرک ٹھہرانا ہوا، جو کہ بڑا جرم ہے؛ لہذا اس لحاظ سے اس کو مشرک مانا گیا، شرک کے طور پر نہیں، جس سے آدمی کافر ہو جاتا ہے اور اسلام سے خارج ہو جاتا ہے؛ جبکہ اس طرح کی بات دوسری روایات میں بھی ملتی ہے، جیسے ”طیرۃ“ کے

متعلق روایت ہے حضرت ابن مسعودؓ سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”بدشگونئی لینا شرک ہے، اس سے ہماری کیا غرض ہے؟“ لیکن اللہ نے توکل کے ذریعہ اس کو ختم کر دیا ہے۔

فَكَانَ ذَلِكَ عِنْدَنَا، وَاللَّهُ أَعْلَمُ لَمْ يُرِدْ بِهِ الشِّرْكَ الَّذِي يَخْرُجُ بِهِ مِنَ الْإِسْلَامِ، حَتَّى يَكُونَ بِهِ صَاحِبُهُ خَارِجًا مِنَ الْإِسْلَامِ، وَلَكِنَّهُ أُرِيدَ أَنْ لَا يَنْبَغِي أَنْ يُحْلَفَ بِغَيْرِ اللَّهِ تَعَالَى.... الخ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۹۷)

(۲) امام طحاویؒ نے محدثانہ جواب یہ بھی پیش کیا کہ منصور بن المعتمر کی حدیث میں ان کے اور ابن عمر کے درمیان ایک راوی مجہول ہے جس کی وجہ سے اس کی اسناد فاسد ہو جاتی ہے؛ لیکن اگر تاویل کے سلسلے میں صحیح مان بھی لیں، تو اس کی تاویل وہی ہوگی جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

فَوَقَفْنَا عَلَى أَنَّ مَنْصُورَ بْنَ الْمُعْتَمِرِ قَدْ زَادَ فِي إِسْنَادِ هَذَا الْحَدِيثِ عَلَى الْأَعْمَشِ، وَعَلَى سَعِيدِ بْنِ مَسْرُوقٍ، عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَيْدَةَ رَجُلًا مَجْهُولًا بَيْنَهُ وَبَيْنَ ابْنِ عُمَرَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ فَفَسَدَ بِذَلِكَ إِسْنَادُهُ غَيْرَ أَنَّا قَدْ ذَكَرْنَا فِي تَأْوِيلِهِ مَا إِنِّ صَحَّحَ كَانَ تَأْوِيلُهُ الَّذِي تَأْوَلْنَاهُ عَلَيْهِ مَا ذَكَرْنَا فِيهِ، وَاللَّهُ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۰۰)

اقوال المحدثین:

صاحب بذل المجہود نے کہا کہ اس نے تعظیم میں غیر اللہ کو شریک کیا ہے، گرچہ عادیہ زبان پر جاری ہو گیا ہے، مگر بغیر نیت تعظیم بھی صورتہ شرک ہے اور اگر تعظیم کی نیت کی، تو شرک جلی ہے۔

أى فقد اشرك غير الله به في التعظيم فان جرى على لسانه عادة من غير نية التعظيم، فقد أشرك صورة، ومن نوى التعظيم فقد اشرك شر كاً جلياً. (بذل المجہود: ۵۳۵/۱۰)

(۲) اسی طرح کا جواب ملا علی قاریؒ نے دیا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ بطریقہ مبالغہ زجر ہے۔

قیل: معناه من اشرك به غيره في التعظيم البليغ فكانه شرك شركاً جلياً فيكون زجراً بطريق المبالغة. (مرقاة المفاتيح: ۵۳۸/۶)

نیز ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

”فقد أشرك“ کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے غیر اللہ کی قسم اس کی تعظیم کے ساتھ کھائی، اس نے شرک جلی کا ارتکاب کیا، کیوں کہ اس طرح اس نے اس تعظیم میں مخلوب بہ کو شریک کیا، جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، ورنہ شرک خفی ہوگا۔

”من حلف بغير الله“ أي معتقد تعظيمه ذلك الغير (فقد اشرك) أي اشراكاً جلياً أو خفياً، لأنه اشرك المحلوف به مع الله تعالى في التعظيم المخصوص به قيل معناه من اشرك به غيره في التعظيم البليغ فكانه مشرك اشراكاً جلياً فيكون زجراً بطريق المبالغة. (مرقاة المفاتيح: ۵۳۸/۶)



باب :- ۱۲۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِمَّا أَمَرَ بِهِ مَنْ حَلَفَ بِاللَّاتِ
وَالْعُزَّى أَنْ يَقُولَ

﴿لات وعزى کی قسم کھانے کا بیان﴾

عَنْ سَعْدِ قَالَ: حَلَفْتُ بِاللَّاتِ وَالْعُزَّى وَكَانَ الْعَهْدُ حَدِيثًا، فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ عَلَيْهِ
السَّلَامُ فَقُلْتُ: إِنِّي حَلَفْتُ بِاللَّاتِ وَالْعُزَّى وَكَانَ الْعَهْدُ حَدِيثًا، فَقَالَ: "قُلْتَ هُجْرًا اتَّقِلْ
عَنْ يَسَارِكَ ثَلَاثًا وَقُلْ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ، وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ تَعَالَى وَلَا تَعُدْ". (شرح مشکل الآثار:

۳۰۱/۲، ورواه النسائي: ۴/۷، وابن ماجه: (۲۰۱۱)، وأحمد: ۱۸۳/۱)

خلاصہ الحدیث:

عرب میں ایک طویل زمانہ تک بتوں کی پرستش کے ساتھ ساتھ ان کے نام پر نذرونیاز
کرنا، قسمیں کھانا، اور طرح طرح کے مشرکانہ رسم و رواج اور خرافات کا ایک سلسلہ قائم رہا؛ جبکہ
آپ ﷺ کی بعثت نے ان خرافات کو مٹایا اور دین حنیف کی ترویج دی اور ان کی ان مشرکانہ
عادتوں کو آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے چھوڑنے کی ذہن سازی کی، اس لئے جب کبھی کسی صحابی
سے ایمان لانے کے بعد پرانی عادت کی وجہ سے کوئی مشرکانہ فعل سرزد ہوتا، تو آپ ﷺ اس
کی اصلاح فرمادیتے، مذکورہ حدیث میں حضرت سعدؓ سے اسی طرح کا واقعہ ذکر ہے۔

حضرت سعدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے لات اور عزى کی قسم کھائی، جبکہ ایمان لانے کا

زمانہ نیا تھا، تو میں نے نبی کریم ﷺ کے دربار میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے لات اور عزیٰ کی قسم کھا ڈالی ہے؛ جبکہ عہد ایمان نیا تھا؛ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تم چھوڑنے کے لئے بلا ارادہ کہا ہے، تو بائیں جانب تین بار تھوک دو۔ اور کہہ دو: ”لا إله إلا الله وحده لا شريك له“ اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو اور دوبارہ مت کہنا۔

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ حدیث میں غور کرنے سے پتہ چلا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جو کچھ ذکر کیا ہے، وہ زمانہ کے قریب کی وجہ سے ہے، ان لوگوں کی عادت تھی، اس کے مطابق الفاظ منہی عنہ جاری ہو گئے، یہاں تک اسلام لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں میں سہواً داخل ہو گیا، اور ضابطہ یہ ہے کہ آدمی جب قسم کھائے اس چیز پر جس کو وہ اپنے قسم کے مطابق سمجھتا ہے، پھر اس کے خلاف ہو جائے، جیسے کسی کو آتے ہوئے دیکھا، تو کہہ دے بخدا وہ محمد ہے اور وہ اسی طرح سمجھ رہا ہے، جبکہ وہ عمر تھا، تو اس کی قسم لغو قرار پائے گی، جس پر کوئی گناہ بھی نہیں، کیوں کہ یہ اس لغو میں داخل ہوگا، جس پر مؤاخذہ نہیں ہے، اور جب نفس یمین میں لغو کا یہی حکم ہے، تو اس چیز میں لغو جس کو حالف مخلوف بہ سمجھ رہا ہے، پھر وہ ایسا نہیں ہے، تو مناسب ہے کہ وہ لغو قرار پائے اور اس پر مؤاخذہ نہ ہو۔

اشکال:

اگر کوئی کہے کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے حضرت سعدؓ کو حکم فرمایا کہ وہ دوبارہ اس کو نہ کرے، مطلب یہ ہے کہ حضرت سعدؓ کو وہ عمل یمین کے معنی میں تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس سے اجتناب کرنے اور دور رہنے کا حکم فرمایا۔

فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَمْرُ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ سَعْدًا أَنْ لَا يَعُودَ إِلَى مَا كَانَ

مِنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳۰۲/۲)

جواب:

اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ ہمارے نزدیک اس کا معنی (واللہ اعلم) یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے محفوظ رکھے، یہاں تک کہ ان سے اس جیسا عمل (سہواً) نہ پایا جائے۔

قِيلَ لَهُ: مَعْنَى ذَلِكَ عِنْدَنَا، وَاللَّهُ أَعْلَمُ أَنْ يَتَحَفَّظَ مِنْ نَفْسِهِ حَتَّى لَا يَكُونَ مِنْهُ مِثْلُ ذَلِكَ مِنَ السَّهْوِ الَّذِي يَغْلِبُ عَلَيْهِ حَتَّى يَكُونَ ذَلِكَ مِنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳۰۲/۲)

اور اسی معنی کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے، جیسا کہ درج ذیل حدیث میں ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو قسم کھائے، پھر وہ اپنی قسم میں لات کا نام لے، تو چاہئے کہ وہ ”لا إله إلا الله“ کہے اور جو اپنے ساتھی سے کہے کہ آؤ میں تمہارے ساتھ سٹا کھیلوں، تو چاہئے کہ وہ صدقہ کرے، چنانچہ اس حدیث میں جو حکم ہے، اس سے وہ خاص لوگ مراد ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ”ومن حلف منكم“ کی وجہ سے یعنی تم میں سے جو لات اور عزیٰ کی عبادت کرتے تھے، لہذا یہ حکم ان کے اسلام لانے سے قبل ان کی عادت کے مطابق تھا پھر وہ اسلام کے اندر بھول گئے، یہاں تک کہ ان سے یہ واقعہ ہو گیا، جس کے فوراً بعد اللہ کی توحید اور اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اس کی اتباع کی۔

عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ، أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”مَنْ حَلَفَ مِنْكُمْ فَقَالَ فِي حَلْفِهِ بِاللَّاتِ فَلْيُقْل: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَمَنْ قَالَ لِصَاحِبِهِ: تَعَالَ أَقَامِرَكَ فَلْيَتَصَدَّقْ“ (شرح مشکل الآثار: ۳۰۲/۲)

اقوال المحدثین:

صاحب بذل المجہود نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ لات وغیرہ کی قسم کھانا سبقت لسانی ہے، اس کی تعظیم مراد نہیں، تو چاہئے کہ کلمہ توحید سے اس کا تدارک کرے، اس لئے کہ یہ صورت کفر ہے، ورنہ تعظیم کے قصد سے حقیقت میں کفر و ارتداد ہوگا، جس سے تجدید ایمان کے ذریعہ لوٹنا واجب ہے۔

معناه أن الحلف بالللات سبق على لسانه ولم يرد تعظيمه فليتدارك به بكلمة التوحيد، لانه صورة الكفر وإلا فإن كان على قصد التعظيم فهو كفر وارتداد ويجب العود منه "لتجديد الإيمان". (بذل المجہود: ۱۰/۵۳۳)

(۲) صاحب مرقاة نے بیان کیا ہے کہ یہاں دو مطلب ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ قسم ان کی زبان پر سہواً جاری ہوگئی کہ مؤمن مجتہد کے سابق عادت کی بنیاد پر، تو ایسی سورت میں کلمہ کہہ لینا چاہئے، جو ان کا کفارہ ہو جائے گا اور یہ غفلت سے توبہ کرنا ہوگا، دوسرا مطلب یہ ہے کہ تجدید ایمان کی غرض سے کلمہ "لا إله إلا الله" پڑھ لے، جو کفارہ اور معصیت سے توبہ کرنا ہوگا۔

وله معنيان: أحدهما ان يجرى على لسانه سهواً جرياً على المعتاد السابق للمؤمن المتجدد فليقل: "لا إله إلا الله" أي فليتب كفارة. لتلك الكلمات "فان الحسنات يذهبن السيئات فهذا توبة من الغفلة، وثانيها، ان بقصد تعظيم اللات والعزى فليقل: لا إله إلا الله تجديد الإيمان فهذا توبة من المعصية. (مرقاة المفاتيح: ۶/۵۲۷)

علامہ طیبی "شرح السنہ" میں لکھتے ہیں:

یہ حدیث دلیل ہے کہ غیر اسلام کے حلف پر کوئی کفارہ نہیں ہے، بل کہ اس وجہ سے گنہگار ہوگا، اس پر لازم ہے کہ وہ توبہ کرے، چوں کہ نبی کریم ﷺ نے ایسے شخص کی عقوبت اس کے دین میں مقرر فرمائی ہے اور اس کے مال میں سے کوئی شیء لازم نہیں فرمائی، اور اس کو صرف کلمہ

توحید کا حکم دیا، چوں کہ یمین کا انعقاد معقود کے ذریعہ ہوتا ہے، اور جب اس شخص نے لات و عزیٰ کی قسم کھالی، تو بلاشبہ اس شخص نے اس معاملہ میں کفار کی مشابہت اختیار کی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حکم فرمایا کہ کلمہ توحید کے ذریعہ سے اس کا تدارک کرے۔

وفی شرح السنة فيه دليل على أن لا كفارة على من حلف بغير الاسلام بل يَأْتِمُ بِهِ وَيَلْزِمُهُ التَّوْبَةَ لِأَنَّهُ وَاللَّهِ وَرَسُولُهُ جَعَلَ عَقُوبَتَهُ فِي دِينِهِ، وَلَمْ يَوْجِبْ فِي مَالِهِ شَيْئًا وَإِنَّمَا أَمْرُهُ بِكَلِمَةِ التَّوْحِيدِ، لِأَنَّ الْيَمِينَ إِنَّمَا تَكُونُ بِالْمَعْقُودِ، وَإِذَا حَلَفَ بِاللَّاتِ وَالْعِزَّى فَقَطْ مَنَاهَى الْكُفَّارَ فِي ذَلِكَ فَأَمْرُهُ أَنْ يَتَدَارَكَ بِكَلِمَةِ التَّوْحِيدِ! وَالظَّاهِرُ الْمُسْتَفَادُ مِنَ الْحَدِيثِ أَنَّ الْحَلْفَ بِالصَّنَمِ مَذْمُومٌ فَيَنْبَغِي أَنْ يَتَدَارَكَ بِأَمْرٍ مَعْلُومٍ وَلَيْسَ فِيهِ دَلَالَةٌ عَلَى غَيْرِ هَذَا. (مرقاة المفاتيح:

۵۲۷/۶ ط: المكتبة التهانوية، ديوبند)



باب :- ۱۲۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا زَوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيمَنْ حَلَفَ بِمِلَّةِ سِوَى مِلَّةِ الْإِسْلَامِ كَاذِبًا

﴿عمل حرام پر معلق کر کے قسم کھانے کا بیان﴾

حَدَّثَنِي ثَابِتُ بْنُ الضَّحَّاكِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "مَنْ حَلَفَ بِمِلَّةِ سِوَى مِلَّةِ الْإِسْلَامِ كَاذِبًا فَهُوَ كَمَا قَالَ". (شرح مشکل الآثار: ۳۰۳/۲)، ورواه البخاری: (۱۳۶۳)، ومسلم (۱۱۰)، وأبو داود: (۳۲۵۷)، والترمذی: (۱۵۳۳)

خلاصہ الحدیث:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح فرائض و واجبات اور سنن و آداب کی تعلیم و تربیت کے لئے مبعوث کیا گیا، اسی طرح معاملات، اخلاقیات، اور مامورات و منہیات کے واسطے بھی مبعوث کیا گیا، ان میں بعض منہیات ایسے بھی ہیں جن کے ارتکاب سے آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اور منہیات کی نشان دہی کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی غیر ملت اسلام کے ساتھ قسم نہ کھائے، کیوں کہ غیر اسلام کی قسم کھانے سے (یعنی اس طرح کہنے سے کہ اگر میں نے ایسا کام کیا، تو میں یہودی یا نصرانی بن جاؤں گا) آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، جس پر تعلیق کر کے وہ قسم کھاتا ہے۔

بہر حال اس حدیث کے معنی سے متعلق امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ہم کتب فقہہ میں اور فقہاء کرام کے یہاں اس حدیث کے بارے میں بہترین ضابطہ پاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جو شخص اس بات کی قسم کھائے کہ اگر میں نے فلاں فلاں کام کیا، تو میں یہودی ہو جاؤں گا، جبکہ وہ جانتا

ہے کہ وہ اس معلق کام کو زمانہ ماضی میں کر چکا ہے، تو ایسی صورت میں اس کو تعلیق کرنا کوئی فائدہ نہیں دیگا؛ بل کہ اس کا یہ تعلیق کرنا باطل ہو جائے گا اور اس کا حلف فوراً وقوع تعلیق کے بغیر واقع ہو جائے گا۔

خلاصہ:

ضابطہ یہ ہے کہ زمانہ ماضی کی اشیاء پر معلق کرنے کی صورت میں قسم فوراً واقع ہو جاتی ہے اور زمانہ مستقبل پر معلق کرنے کی صورت میں حلف فوراً واقع نہیں ہوتی؛ بل کہ تعلیق پائے جانے کی صورت میں واقع ہوتی ہے۔

کتب فقہیہ کے اندر اس ضابطہ کی مثال یہ دی جاتی ہے کہ اگر کوئی یہ کہے ”امرأتی طالق إن کان کذا“ جبکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کام کو زمانہ ماضی میں کر چکا ہے، تو اس کی بیوی فوراً طلاق والی ہو جاتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے ”انت طالق“ یا ”امرأتی طالق“ کہا ہے، بہر حال اس ضابطہ کے مانند وہ شخص ہے، جس نے یہ کہا ہو کہ وہ یہودی ہو جائیگا، اگر اس نے فلاں فلاں کام کیا ہو جبکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کام کو کر چکا ہے، تو اس صورت میں وہ شخص قسم کھاتے ہی اس شخص کی طرح فوراً مرتد ہو جائے گا، جس نے بغیر تعلیق کے قسم کھایا ہو کہ وہ یہودی ہے، اس شخص کے مرتد ہونے کا حکم مستقبل میں نہیں لگایا جائے گا، کیوں کہ محض مستقبل کی قسم کھانے سے آدمی نے اپنے اوپر یہودی ہونے کو واجب نہیں کیا ہے؛ بل کہ وہ شخص اشیاء تعلیق کے ارتکاب کے ساتھ اپنے یہودی ہونے کو اپنے اوپر لازم کیا ہے۔

مذکورہ بالا باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ حدیث کے اندر جو بیان کیا گیا ہے، یہ اس صورت میں ہے، جبکہ وہ شخص قسم کو اپنے افعال ماضی پر معلق کرے گا، تاکہ افعال مستقبل پر معلق کرنے کی صورت میں محض قسم سے مرتد ہوگا۔

اقوال المحدثین:

صاحب عون المعبود نے قسطلانی علیہ الرحمہ کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ اگر حالف کا دل ایمان پر مطمئن ہو اور غیر اسلام پر مطمئن نہ ہو، بل کہ جس غیر اسلام کو تعظیم کا وہ اعتقاد بھی نہ رکھتا ہو، اور اس کو جھوٹے طور پر تعظیم کر رہا ہو، تو وہ اس بات کی وجہ سے کافر اور مرتد نہیں ہوگا، البتہ اگر اس نے اسے حق سمجھ کر قسم کھایا ہے، تو وہ مرتد ہو جائے گا۔

”قوله كاذبًا“ أي في حلفه، ثم نقل صاحبه عون المعبود قول القسطلاني فقال: قال القسطلاني يستفاد منه ان الحالف ان كان مطمئن القلب بالإيمان فهو كاذب في تعظيم مالا يعتقد تعظيمه لم يكفر، وان قاله معتقدًا للإيمان بتلك الملة ككونها حقًا كفره.

(عون المعبود: ۱۵۹/۶)

علامہ ابن حجر علیہ الرحمہ کا فرمان ہے کہ یہ تہدید اور مبالغہ فی الوعید پر محمول ہے۔

”نقل صاحب عون المعبود قوله ابن حجر عليه الرحمة فقال: قال ابن حجر

ويحتمل ان يكون اطراه بهذا الكلام التهديد والمبالغة في الوعيد“۔ (عون المعبود: ۱۵۹/۶)

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ فعل مباح کو کفر کے ساتھ معلق کرنا یمنین ہے، لہذا اگر وہ شخص یہ حلف کسی ایسے کام کے بارے میں اٹھاتا ہے، جو وہ پہلے کر چکا ہے، تو یہ یمنین غموس ہوگی، اس میں کوئی کفارہ نہیں ہوگا، مگر توبہ ضروری ہے۔

قال ابن الهمام: وجه الحلف أنه لما جعل الشرط وهو فعل كذا علمًا على كفره

ومعتقده حرمة فقد اعتقده أي الشرط واجب الامتناع، فكانه قال حرمت على نفسه فعل

كذا كدخول الدار مثلاً، ولو قال دخول الدار على حرام كان يميناً فكان تعليق الكفر

ونحوه على فعل مباح، اذا عرفت هذا فلو قال ذلك الشيء قد فعله فهو يمين كان قال ان كنت قلت كذا فهو كافر وهو عالم أنه قد فعله فهو يمين غموس لا كفارة فيه إلا التوبة. (مرقاة المفاتيح: ٥٢٨/٢)



باب :- ۱۲۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي النَّذْرِ أَنَّهُ لَا يُؤَخَّرُ شَيْئًا

﴿ نذر کا بیان ﴾

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ: نَهَانَا رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنِ النَّذْرِ وَقَالَ: "إِنَّهُ لَا يُؤَخَّرُ شَيْئًا، وَلَكِنْ يُسْتَخَّرُ بِهٍ مِنَ الْبَحِيلِ". (شرح مشکل الآثار: ۳۰۶/۲)، ورواه البخاري: (۶۲۰۸)، ومسلم: (۱۶۳۹)، وأبو داود: (۳۲۸۷)

خلاصہ الحدیث:

شریعت کی اصطلاح میں کسی مباح کام کو اللہ کی تعظیم اور اجلال کی نیت سے اپنے اوپر واجب کر لینا نذر ہے، اور یہ شریعت میں مشروع ہے، چنانچہ قرآن اور حدیث میں ایک سے زیادہ مواقع پر نذر کو پورا کرنے کا ذکر ہے؛ لیکن اس اعتقاد سے نذر ماننا کے نذر کی وجہ سے ہمارا کام ہو جائے گا یہ اعتقاد و تاثر باطل ہے، اور اس سے شریعت میں منع کیا گیا ہے، چنانچہ اسی کی طرف حدیث الباب میں اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو نذر ماننے سے منع فرمایا ہے، اور فرمایا کہ نذر کسی چیز کو مؤخر نہیں کرتی؛ بل کہ اس کے ذریعہ بخیل شخص سے کچھ مال نکالا جاتا ہے۔

تعارض:

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی پہلی راایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نذر ماننا ممنوع ہے،

جبکہ ابن عمرؓ کی دوسری روایت کے جزئی ثانی سے معلوم ہوتا ہے کہ نذر ماننا ممنوع نہیں ہے، جب کے دوسری روایت میں ”وَأَمْرٌ بِالْوَفَاءِ بِهِ“ نذر کو پورا کرنے کا حکم فرمایا، معلوم ہوا کہ نذر ماننا ممنوع نہیں، کیونکہ اگر وہ ممنوع ہوتا، تو اس کو پورا کرنے کا حکم نہیں فرماتے۔

عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: ”نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّذْرِ وَأَمَرَ بِالْوَفَاءِ بِهِ“.

(شرح مشکل الآثار: ۳۰۷/۲)

دفع تعارض:

امام طحاویؒ اس تعارض کو اس طرح دور فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نذر ماننے سے منع کرنا، اس معنی کے اعتبار سے ہے کہ یہ نذر ماننا کسی چیز کو مؤخر نہیں کرتی اس لئے نذر ماننا معصیت ہے۔

النَّذْرُ فَاحْتَمَلَ أَنْ يَكُونَ نَهْيُهُ عَنْهُ إِذَا كَانَ لَا يُؤَخِّرُ شَيْئًا، وَلَمْ يَكُنْ نَهْيُهُ عَنْهُ؛ لِأَنَّهُ

مَعْصِيَةٌ. (شرح مشکل الآثار: ۳۰۷/۲)

دیگر محدثین کے اقوال:

محدث جلیل مولانا سہارنپوریؒ ”بذل الجہود“ میں فرماتے ہیں کہ لوگوں کی عادت ہے کہ جلب منفعت اور دفع مضرت کے لئے نذر مانتے ہیں، اور یہ بخلاء کا فعل ہے، اس لئے اس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص اخلاص کے ساتھ کسی قربت اور عبادت کی نذر مانے جس طرح حضرت عمرؓ نے مسجد حرام میں ایک رات اعتکاف کی نذر مانی تھی، تو وہ ممنوع نہیں ہے؛ بلکہ وہ جائز اور درست ہے۔

وَكَانَ عَادَةَ النَّاسِ يَنْذِرُونَ لِجَلْبِهِ الْمَنَافِعَ وَدَفْعِ الْمَضَارِّ وَذَلِكَ فِعْلُ الْبِخْلَاءِ مِنْهَا

عَنْهُ، وَأَمَّا إِذَا أَنْذَرَ بِالْإِخْلَاصِ فِي النِّيَّةِ وَعِبَادَةِ اللَّهِ تَعَالَى كَمَا نَذَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ

باعتكاف ليلة في المسجد الحرام فهو ليس بمنهي عنه. (بذل المجهود: ۱۰/۵۷۷)

ملا علی قاری قلمبند کرتے ہیں:

نذر کے متعلق جو ممانعت وارد ہوئی ہے، اس کا تعلق عین نذر سے نہیں؛ بل کہ اس کا تعلق ان فاسد عقائد سے ہے، جو نذر سے متعلق پیدا ہونے والے ہیں۔

وحاصله أن النهي عن النذر لم يتعلق بذاته وانه تعلق بما ينشأ عنه من الاعتقاد الفاسد كما سبقت الإشارة إليه. (مرقاة المفاتيح: ۶/۵۳۳)

علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

اگر نذر بغیر کسی شرط کے ہے، تو اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں، مثلاً ناذر کا قول ”لله علي أن أصلي ركعتين“ (میں دو رکعت نماز پڑھنے کی نذر مانتا ہوں) مگر نذر سے متعلق حدیث الباب میں جو نہی وارد ہوئی ہے، وہ نذر معلق کے بارے میں ہے، جیسے ناذر کا یہ قول ”إن شفى الله مريضى صمت يومين“ (اگر اللہ مجھے بیماری سے شفا کرے تو میں دو دن روزہ رکھوں گا)

اس کی دلیل حدیث الباب کا آخری فقرہ ہے ”انه لا يرد شيئاً وانما يستخرج به من الشحيح“ مطلب یہ ہے کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، اس کو ٹال نہیں سکتا، لہذا نذر معلق میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

قولہ: (ينها عن النذر) اعلم أن النذر ان كان مطلقاً من غير شرط كقول الناذر: لله علي أن أصلي ركعتين فلا خلاف في جوازه بغير كراهة، وانما النهي في حدیث الباب متعلق بالنذر المعلق مثل أن يقول: ان شفى الله مريضى صمت يومين، والدليل عليه الفقرة الثانية من الحديث، وهي ”انه لا يرد شيئاً وانما يستخرج به من الشحيح“، والمراد أنه لا يرد القدر، فلا فائدة في تعليق النذر. (فتح الملهم: ۸/۱۳۳)



باب :- ۱۲۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ:
 ”سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ“

﴿ قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ“ کے مفہوم کا بیان ﴾

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سَعْدٍ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ“ . (شرح مشكل الآثار: ۳۱۱/۲)، ورواه البخاري في ”الأدب المفرد“: (۳۲۹)، وأحمد: ۷۸/۱، وابن ماجه: (۳۹۴۲))

خلاصہ الحدیث:

اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے انسان کو بہترین انداز میں پیدا کیا، پھر اسے مال، اولاد اور طرح طرح کی نعمتیں عطاء کیں، ساتھ ہی ساتھ تمام انسانوں کو عموماً اور اہل اسلام کو خصوصاً کرامت و شرافت سے نوازا، اور ان کی حفاظت کے لئے قوانین مرتب فرمائے، پھر فرق مراتب کے ساتھ ان کو پاسداری کو لازم قرار دیا، چنانچہ اس میں بعض کا تعلق اگر عبادت و ریاضت سے ہے، تو بعض کا تعلق جان، مال و عزت و آبرو اور ایمان و عقائد کی حفاظت سے ہے جیسا کہ فقہ اسلامی میں ان تمام قوانین کو ایسے مرتب انداز میں بیان کئے گئے ہیں کہ جن کو دیکھ کر کوئی منصف مزاج انسان اسلام کی کمالیت کے ساتھ اس بات کا اقرار کئے بغیر رہ نہیں سکتا کہ دنیا کو صحیح سمت پر چلانے کی صلاحیت اگر کسی مذہب میں ہے، تو وہ صرف اور صرف اسلام میں ہے۔

بہر حال اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ حدیث ”سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ“ ہے، جس کا تعلق حفاظتِ عزت و آبرو اور حفاظتِ جان سے ہے، اس کو امام طحاوی نے اس باب میں پیش کیا ہے اور اس کے مفہوم و مراد کو واضح فرمایا۔

حدیث الباب میں دو چیزیں ہیں: (۱) ”سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ“ (۲) ”قِتَالُهُ كُفْرٌ“ جزء اول کے معنی واضح اور ظاہر ہونے کی وجہ سے اس میں زیادہ کلام نہیں فرمایا؛ بل کہ صرف فسوق کے مفہوم کو بیان کرنے پر اکتفاء کیا؛ امر محمود سے امر مذموم کی طرف جانا یعنی اچھی چیز کو چھوڑ کر بُری چیز کو اختیار کرنا جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ﴾ (الکہف: 50) سو وہ اپنے رب کے حکم سے نکل گئے، اسی طرح حالتِ احرام میں جن جانوروں کو قتل کرنا مباح ہے، ان کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا: ”خَمْسٌ فَوَاسِقٌ يُقْتَلْنَ فِي الْحَرَمِ وَالْإِحْرَامِ“ کیونکہ یہ جانور لوگوں کے لئے تکلیف دہ حرکتیں کرتے ہیں۔

وَالْفُسُوقُ الْمَرَادُ فِيهِ هُوَ الْخُرُوجُ عَنِ الْأَمْرِ الْمَحْمُودِ إِلَى الْأَمْرِ الْمَذْمُومِ، وَمِثْلُهُ قَوْلُهُ تَعَالَى فِي إِبْلِيسَ: ﴿فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ﴾ (الکہف: 50) أَيْ فَخَرَجَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ، وَمِنْهُ قَوْلُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْفَأْرَةِ، وَفِيمَا ذَكَرَهُ مَعَهَا مِمَّا أَبَاحَ قِتْلَهُ فِي الْحَرَمِ وَالْإِحْرَامِ: ”خَمْسٌ فَوَاسِقٌ يُقْتَلْنَ فِي الْحَرَمِ وَالْإِحْرَامِ“ فَكَانَ ذَلِكَ الْفُسُوقُ الَّذِي كَانَ مِنْهُنَّ هُوَ خُرُوجُهُنَّ إِلَى الْأَذَى الَّذِي يُؤْذِنُ بِهِ النَّاسَ. (شرح مشکل الآثار: ۳۱۴/۲)

(۲) ”قِتَالُهُ كُفْرٌ“ اس جزء ثانی کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ کفر باللہ پر محمول نہیں ہے، جس کی وجہ سے آدمی مرتد ہو جائے؛ بل کہ قتال کر کے مؤمن کے ایمان کو چھپانے اور اس کے ہلاک کرنے پر محمول ہے، کیونکہ کفر کے معنی ایسے انداز پر چھپانا جو ہلاکت کا تقاضہ کرے۔

اس کی تائید میں امام طحاوی نے پہلے آیت قرآنی پر عقلی دلیل پیش کی، ساتھ ہی ساتھ متعدد احادیث سے شواہد و نظائر پیش فرمائے ہیں۔

آیت مبارکہ سے استدلال: وَمِنهُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ﴾

(الحديد: 20)

اس آیت میں تمام مفسرین کے نزدیک ”الکفار“ سے الزراع مراد ہے (کاشتکار مراد ہے) کیوں کہ یہ لوگ بھی بیج وغیرہ کوزمین میں چھپاتے ہیں۔

عقلی دلیل: فرماتے ہیں: ”قِتَالُهُ كُفْرٌ“ کفر باللہ مراد نہ ہونے پر دلیل عقلی یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو قتل کرے، تب بھی کافر نہیں ہوتے، تو قتال (مفاعلت سے) سے جو قتل سے اولیٰ ہے اس سے کیسے کافر ہوں گے؟

وَكَانَ قَوْلُهُ ”وَقِتَالُهُ كُفْرٌ“ لَيْسَ عَلَى الْكُفْرِ بِاللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ حَتَّى يَكُونَ بِهِ مُرْتَدًّا، وَلَكِنَّهُ عَلَى تَعْطِيَّتِهِ بِهِ إِيَاةٌ وَاسْتِهْلَاكِ بِهِ إِيَاةٌ؛ لِأَنَّ الْكُفْرَ هُوَ التَّعْطِيَّةُ لِلشَّيْءِ، التَّعْطِيَّةُ الَّتِي تَسْتَهْلِكُهُ وَمِنَهُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ﴾ (الحديد: 20) وَلَا اخْتِلَافَ بَيْنَ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالتَّأْوِيلِ أَنَّ الْكُفَّارَ الَّذِينَ أُرِيدُوا هَاهُنَا هُمُ الزَّرَّاعُ؛ لِأَنَّهُمْ يُغْطُونَ مَا يَزْرَعُونَ فِي الْأَرْضِ التَّعْطِيَّةَ الَّتِي يَسْتَهْلِكُونَهُ بِهِ، وَمِمَّا يَدُلُّ عَلَى أَنَّ ذَلِكَ الْكُفْرَ الْمَذْكُورَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ لَمْ يُرَدِّ بِهِ الْكُفْرَ بِاللَّهِ تَعَالَى، بَلْ قَدْ وَجَدْنَا هُ يَمْتَلُ أَحَاةً فَلَا يَكُونُ بِقِتَالِهِ إِيَاةً كَافِرًا بِاللَّهِ تَعَالَى، وَإِذَا لَمْ يَكُنْ بِقِتَالِهِ إِيَاةً كَافِرًا بِاللَّهِ تَعَالَى كَانَ بِقِتَالِهِ إِيَاةً أُخْرَى أَنْ لَا يَكُونُ بِهِ كَافِرًا. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۱۴-۳۱۵)

شواہد:

”وَقِتَالُهُ كُفْرٌ“ میں کفر باللہ مراد ہونے پر متعدد شواہد پیش کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ

ہے:

(۱) ایک مرتبہ صلاۃ کسوف کے وقت آپ ﷺ کے سامنے جنت و جہنم پیش کیا گیا تھا، تو

اس میں آپ ﷺ نے اہل جہنم میں سے اکثر و بیشتر عورتوں کو دیکھا، وجہ پوچھنے پر فرمایا: ”بَكْفُرِهِنَّ“ ان کے کفر کی وجہ سے جہنم میں جائیں گی، پھر پوچھا گیا کہ کیا عورتیں اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؛ تو اس میں شوہر کی طرف سے پیش کردہ احسانات کو چھپانے کی وجہ سے ان کے اس فعل کو آپ ﷺ نے کفر قرار دیا، جو کہ کفر باللہ سے الگ ہے۔

فَجَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِعْلَهُنَّ هَذَا كُفْرًا، لِتَعْطِيَتِهِنَّ بِهِ الْإِحْسَانَ الَّذِي قَدْ تَقَدَّمَ إِلَيْهِنَّ. (شرح مشکل الآثار: ۳۱۵/۲)

(۲) ایک مرتبہ اوس و خزرج کے درمیان زمانہ جاہلیت کی عداوت کے تذکرہ کی وجہ سے اختلاف ہوا، اور معاملہ نے شدت اختیار کر لی، یہاں تک کہ ایک دوسرے کے خلاف تلوار سونت لی، آپ ﷺ کو خبر پہنچی تو آپ ﷺ فوراً وہاں پہنچے، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ بُنْتَلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ﴾ (آل عمران: 101) چنانچہ صحابہ کرام کا یہ آپسی قتال جس کو آیت میں کفر سے تعبیر کیا گیا، یہ کفر باللہ کی وجہ سے نہیں تھی بل کہ ان میں موجود ایمانی الفت و اخوت کو چھپانے کی وجہ سے تھی، اس کے باوجود جب یہ قتال پیش آیا، تو اس کو کفر کہہ دیا گیا۔

فَلَمْ يَكُنْ بِمَا كَانَ مِنْهُمْ مِنَ الْقِتَالِ مِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَىٰ عِنْدَهُ هَذِهِ الْآيَةِ الَّتِي ذَكَرَ فِيهَا مَا كَانَ مِنْهُمْ بِالْكَفْرِ عَلَى الْكُفْرِ بِاللَّهِ تَعَالَىٰ، وَلَكِنْ كَانَ عَلَىٰ تَعْطِيَتِهِمْ مَا كَانُوا عَلَيْهِ قَبْلَ ذَلِكَ مِنَ الْأَلْفَةِ وَالْأُخُوَّةِ، حَتَّىٰ إِذَا كَانَ مِنْهُمْ مَا كَانَ مِنْهُمْ مِنْ ذَلِكَ فَسُمِّيَ كُفْرًا لِأَيْرَادِهِ بِالْكَفْرِ بِاللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَلَكِنَّ الْكُفْرَ الَّذِي ذَكَرْنَاهُ سِوَاهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳۱۷/۲)

(۳) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (المائدة: 44) کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ کفر کفر باللہ یوم آخرت، کتاب اللہ، اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کی طرح نہیں ہے۔

قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ: مَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَهُوَ كَافِرٌ؟ قَالَ: "هُوَ بِهِ كُفْرَةٌ وَلَيْسَ كَمَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَكُتِبَ عَلَيْهِ وَرُسُلِهِ". (شرح مشكل الآثار: ۲/۳۱۸)

اسی طرح اور بھی مثالیں پیش فرمائی، جن میں کفر سے کفر باللہ مراد نہیں ہے۔

اقوال المحدثین:

(۱) مشہور محقق علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ یہاں قتال پر کفر کا اطلاق فرمایا؛ کیونکہ اگر فسوق کا اطلاق کفر پر کرتے، تو گالی گلوچ اور قتال دونوں برابر ہو جاتے؛ جبکہ قتال زیادہ اشد ہے، اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے تغلیظاً کفر کا اطلاق کیا گیا اور محدثین کا قول "هو محمول على الأشد" کا یہی مطلب ہے؛ پھر فرمایا: حدیث میں دراصل قرآن کی پیروی کرتے ہوئے ایسا کہا گیا ہے کہ قرآن میں قتل کی جزا "خلود فی النار" بیان کیا گیا ہے، اگرچہ خلود کے حقیقی معنی مراد نہیں ہے، اور خلود تو کفر کا بدلہ ہے، اس اعتبار سے قتال پر کفر کا اطلاق کیا گیا، اگرچہ فقہاء کرام دنیا میں کفر کا حکم نہیں لگاتے، مگر حدیث میں ایسی تعبیر اختیار کی گئی، تاکہ عمل میں زیادہ احتیاط ہو جائے۔

"وقتاله كفر مقابلة الفسوق-----والجواب--- أنه أطلق الكفر على الفسوق تغليظاً، ولو قال: قتاله فسوق يساوي حال السباب مع ان القتال أشد من السباب فلاظهار هذه الشدة أطلق عليه الكفر وهذا الذي يعنون بقولهم "محمول على الشدة" والأصل ان الحديث اتبع القرآن في ذلك فإن الله تعالى أخبر عن جزاء القتل بالخلود بأي معنى كان۔ والخلود جزاء الكفر فاتبعه الحديث وقال: وقتال المسلم كفر، وان لم يحكم به الفقهاء في الدنيا إلا أن الحديث يختار من التعبيرات ما هو أوعلى للعمل فيشدد فيه لا محالة".

(فيض الباري: ۱/۲۵۷)

(۲) تحفۃ الباری میں حضرت علامہ ابو یحییٰ زکریا فرماتے ہیں یہاں مسلمان کے ساتھ حلال سمجھ کر قتال کرنا مراد ہے، یا تو کفر لغوی مراد ہے، یعنی چھپانا کیونکہ ان کے ساتھ قتال کر کے جو چیز اس پر لازم تھی یعنی مسلمان کی مدد کرنا اور اس سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنا اس کو چھپایا، یا تو تحذیر میں مبالغہ کے لئے کفر سے تعبیر کیا ہے، اس لئے کہ یہ سباب سے اشد ہے، اگرچہ دونوں فسق میں شریک ہیں، مگر اشد فی الفسق کو کفر سے اور جو اس سے کم درجہ کا ہے اس کو فسوق سے تعبیر فرمایا۔

”وقتاله کفر“ لا معنی الخروج عن الملة أو معناه لکنه قاتل المسلم أو قتله مستعلا لذلك أو المراد الکفر اللغوی هو الستر لأنه بقتاله ستر ماله علیه من حق الاعانة وکف الأذى أو عبر به المبالغة فی التحذیر عن ذلك لأنه أغلظ من السب وان اشترکافی الفسق ولهذا عبر فيه بالکفر وفي السباب بالفسوق. (تحفة الباری: ۶۹/۱)

(۳) علامہ شبیر احمد عثمانی ”فتح الملہم“ میں فرماتے ہیں کہ اس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہے، چونکہ یہ سباب سے اشد اور مفضی الی الموت ہے اس لئے شریعت کے مسلمہ اصول پر اعتماد کرتے ہوئے تحذیر میں مبالغہ کے لئے کفر سے تعبیر کر دیا گیا، یا تو کفر سے مشابہت کی وجہ سے قتال کو کفر کہہ دیا گیا، کیونکہ مؤمن سے قتال کرنا یہ تو کافروں کی عادت ہے، نہ کہ مؤمن کی شان اور یہ بھی کہا گیا کہ یہاں کفر کے لغوی معنی چھپانا مراد ہے، کیونکہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق بنتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرے اور اس سے دفاع کرے، جب اس نے قتال کیا تو گویا اس حق کو وہ چھپاتا ہے۔

لان ظاهره غیر مراد لکن لما کان القتال أشد من السباب، لأنه مفض الی ازهاق الروح غیر عنه بلفظ أشد من لفظ الفسق وهو الکفر ولم یرد حقيقة الکفر الی الخروج عن الملة بل أطلق علیه الکفر مبالغة فی التحذیر معتمداً علی ما تفرّد من القواعد أن مثل ذلك لا ینخرج عن اللہ مثل حدیث الشفاعة ومثل قوله تعالیٰ:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ (سورة النساء: ۱۱۶)

أو أطلق عليه الكفر لشبهة به ، لأنه قتال المؤمن من شان الكافر وقيل المراد هنا الكفر اللغوي هو التغطية : لأن حق المسلم على المسلم ان يعينه وينصر ويكف عنه أذاه فلما قتله كان أنه غطى على هذا الحق. (فتح الملهم: ۳۴/۲)

(۴) یہی بات شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ ذکر فرماتے ہیں ان کی بھی عبارت یہی ہے۔

(فتح الباری: ۱۵۵/۱)

(۵) علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی جماعت سے قتال کرنا اہل السنۃ والجماعت کے نزدیک ایسا کفر نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے کہ آدمی خارج از ملت ہو جائے ، ہاں اگر حلال سمجھ کر ایسا کیا ، تو پھر خارج ہو جائے گا ، جب اس اصول کی بنیاد پر یہ بات ثابت ہوئی کہ حدیث ظاہر پر محمول نہیں ہے ، تو اب اس کی تاویل میں متعدد اقوال سامنے آئے : (۱) حلال سمجھ کر قتال کرنے پر محمول ہے (۲) کفران نعمت و اخوت الاسلام پر محمول ہے نہ کہ کفر جحود ، (۳) اس بڑی حرکت کی وجہ سے آئندہ کفر تک پہنچ سکتا ہے ، (۴) یہ کفار کے فعل کے مشابہ ہے ، نہ کہ اہل ایمان کے۔

وأما قتاله بغير حق فلا يكفر به منه أهل الحق كفرًا يخرج به عن الملة كما قدمنا في مواضع كثيرة إلا إذا استحلَّ فاذا تقرر هذا فقل في تأويل الحديث أقوال: أحدها: أنه في المستحل والثاني: ان المراد كفر الاحسان والنعمة وأخوة الإسلام لا كفر جحود، والثالث: أنه يؤل إلى الكفر بشؤمه، والرابع: أنه كفعل الكفار.

(شرح المسلم لنووي بهامش المسلم: ۵۸/۱)

(۶) قریب قریب یہی بات ملا علی قاریؒ نے بھی فرمائی ہے ، ان کی عبارت یہ ہے:

وقتاله أي محاربتة لأجل السلام "كفر" كذا قاله شارح لكن بعده لا تخفى لأن هذا من معلوم الدين بالضرورة فلا يحتاج إلى بيانه بل المعنى مجادلته ومحاربتة بالباطل كفر بمعنى كفران للنعمة والاحسان في أخوة الاسلام وأنه ربما يؤل الى الكفر أو انه فعل الكفرة أو واده به التخليط التهديد والتشديد في الوعيد. (مرقاة المفاتيح: ١٣٦/٩)



باب :- ۱۲۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيمَنْ قَالَ لِأَخِيهِ: يَا كَافِرُ

﴿مُسْلِمَانِ كَوَافِرٍ كَهَيْئَةِ كَابِيَانِ﴾

عَنْ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ نَبِيِّ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: ”إِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِأَخِيهِ: يَا كَافِرُ وَجَبَ الْكُفْرُ عَلَى أَحَدِهِمَا“ . (شرح مشكل الآثار: ۳۲۰/۲)، ورواه البخاري (۶۱۰۴)، ومسلم: (۶۰)، والترمذي: (۳۳۷)

خلاصہ الحدیث:

اسلام میں مزاح و مذاق کی گنجائش ہی نہیں، بل کہ بعض مواقع پر مستحسن ہے، لیکن اس کے کچھ حدود و قیود ہیں، جن کا لحاظ نہایت ضروری ہے، ورنہ بعض مزاحیہ جملے خوشی و مسرت کے سامان کے بجائے لڑائی و جھگڑوں کے متقاضی ہو جاتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں مزاح کے کئی واقعات ملتے ہیں؛ لیکن ان سے کسی کی دل آزاری کرنے کا ارادہ نہیں کیا، مذکورہ باب کی روایت میں اسی کی طرف نشاندہی کی گئی ہے۔

اس روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی نے دوسرے کسی شخص کو ”یا کافر“ کہا تو دونوں میں سے کسی ایک شخص پر کفر ثابت ہوگا۔

وضاحت:

حضرت امام طحاوی فرماتے ہیں کہ اس باب کی روایات کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان

دوسرے کو ”یا کافر“ کہے، تو سامنے والا حقیقی کافر ہی ہے، تب تو کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن اگر سامنے والا مؤمن ہے، تو کہنے والا خود کافر ہو جائے گا، کیونکہ اس نے ایک ایمان والے شخص کو کافر کہا اور اللہ پر ایمان لانے والے کو کافر کہنا کفر ہے، جس کی تائید آیت کریمہ سے ہوتی ہے:

﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ، وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (البائتہ: ۵)

اقوال المحدثین :-

(۱) حضرت شیخ زکریا نے ”أوجز المسالك“ میں نقل کیا ہے کہ علامہ باجی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کو کافر کہا گیا، اگر وہ کافر ہے، تو ایسا ہی ہے؛ لیکن اگر وہ کافر نہیں ہے، تو قائل پر کافر ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

معناه ان كان المقول له كافراً فهو كما قال وان لم يكن المقول له كافراً أخيف على الكافران يصير كافراً۔۔۔۔۔ (أوجز المسالك: ۵ / ۳۰ ط: دار الكتب العلمية)

(۲) علامہ قسطلانی فرماتے ہیں کہ بعض نے اس کو زجر و توبیخ پر محمول کیا ہے۔

قال القسطلاني حمله بعضهم على الزجر والتوبيخ. (بذل المجهود:۔۔۔۔۔)

(۳) قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہ ان خوارج پر محمول ہے، جو مؤمنین کو کافر کہتے تھے۔

قال القاضي عياض: محمول على خوارج المكفرين للمؤمنين.

(أوجز المسالك: ۶ / ۴۵۴) قدیم۔

(۴) امام غزالی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کافر قرار دے، درانحالیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ مسلمان ہے، پس اگر یہ گمان ہو کہ وہ کافر ہے، بدعت یا کسی اور سبب سے، تو خطا کرنے

والا، کافر نہیں ہوگا۔

وهذا معناه أن يكفره وهو يعلم أنه مسلم فان خاف أنه كافر ببدعة أو غيرها كان

مخطئًا لا كافرًا. (اتحاف السادة: ۷/۳۹۰)

علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

ایک شخص (جو خود مسلمان ہے) کسی دوسرے شخص کو کافر کہا اور وہ واقعہ کافر ہے، تو اس صورت میں وہی شخص قائل کے قول کا مستحق ہوگا؛ لیکن اگر وہ کافر نہیں ہے، تو اس قول کا گناہ خود قائل کی طرف لوٹے گا۔

والحاصل أن القول له، إن كان كافرًا كفرًا شرعيًا فقد صدق القائل، وذهب

المقول له، وإن لم يكن رجعت للقائل ذلك القول واثمه كذا اقتصر على التاويل في

”رجع“ وهو من أعدل الأجوبة. (فتح الملهم: ۲/۲۹۷)

ملا علی قاری رقمطراز ہیں:

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص (جو خود مسلمان ہے) کسی دوسرے مسلمان کو کافر کہا، تو

اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ کہنے والے نے سچ کہا ہے، تو اس صورت میں کلمہ کفر کا

مستحق وہی شخص ہوگا، جس کو کافر کہا گیا ہے اور وہ حقیقت میں کافر ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کہنے والے نے جھوٹ کہا ہو، یعنی جس شخص کو اس نے کافر کہا ہے

وہ حقیقت میں مسلمان ہے اور اس کی طرف کفر کی نسبت سراسر جھوٹ ہے، اس صورت میں کہا

جائیگا کہ کہنے والا خود کافر ہو گیا، کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے ایمان کو کفر سمجھا اور دین

اسلام کو باطل جانا۔

المفهوم من قال أحدهما أما القائل إن اعتقد كفر المسلم بذنوب صدر منه أو الآخر إن صدق القائل، كذا ذكره بعض الشراح من علمائنا.

وقال الطيبي: لأنه إذا قال القائل لصاحبه "يا كافر" مثلاً، فإن صدق رجع إليه كلمة الكفر الصادر منه، مقتضاها وان كذب واعتقد بطلان دين الاسلام رجعت إليه هذه الكلمة. (مرقاة المفاتيح: ۵۵/۹)



باب :- ۱۲۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا زَوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ نَهْيِهِ عَنِ قَتْلِ النَّمْلَةِ،
وَالنَّحْلَةِ وَالْهَدْهُدِ وَالضَّرْدِ

﴿نملہ، ہدہ اور صرد کو قتل کرنے کا بیان﴾

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ، قَالَ: ”أَرْبَعٌ مِنَ الدَّوَابِّ لَا يُقْتَلْنَ:
النَّمْلَةُ، وَالنَّحْلَةُ، وَالْهَدْهُدُ، وَالضَّرْدُ“ (شرح مشکل الآثار: ۳۲۶/۲)، ورواه أبو داود: (۵۶۳۷)، وابن
ماجہ: (۳۲۲۳)، وأحمد: (۳۳۲/۱)

خلاصہ الحدیث:

یہ حقیقت ہے کہ انسان کی تخلیق آخرت بنانے کے لئے ہوئی ہے ”الدنیا مزرعة
الآخرة“ لیکن دنیا کی تمام چیزیں حتیٰ کہ حیوانات بھی انسان کے فائدے کے لئے پیدا کئے
گئے ہیں، اس لئے جو جانور سباع میں سے نہیں ہے، انسان کے حق میں مفید ہے، ان کو قتل کرنے
سے منع کیا گیا ہے، ان ہی میں سے یہ چار جانور ہیں، جن کو مارنے سے منع کیا گیا ہے، حدیث
الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کی طرف نشاندہی کی ہے، وہ چار جانور میں چیونٹی، شہد
کی مکھی، ہدہ، اور صرد ہے۔

سوال:

اب سوال یہ ہے کہ خصوصاً ان ہی چار جانوروں کو مارنے سے کیوں روکا گیا ہے؟ اور اس

کی کیا وجہ ہے؟

جواب:

امام طحاوی نے ان چانوروں کی طرف سے علاحدہ، علاحدہ سبب کو ذکر کیا ہے، وہ درج ذیل ہے:

(۱) (ہدہ): اس کو مارنے سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ اس فعل سے عبث لازم آتا ہے، کیونکہ وہ نہ ماکول اللحم میں سے ہے، اور نہ وہ موذی جانوروں میں سے، تاہم لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں؛ لہذا معلوم ہوا کہ ہدہ کا قتل فعل عبث ہے، اسی وجہ سے کسی جاندار کو ناحق مارنے پر وعید آئی ہے، چنانچہ روایت میں ہے:

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ قَتَلَ عُضْفُورَةً، فَمَا فَوْقَهَا بِغَيْرِ حَقِّهَا سَأَلَهُ اللَّهُ عِزًّا وَجَلًّا عَنْ قَتْلِهَا"، قِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا حَقُّهَا؟ قَالَ: "يَذُبُّهَا فَيَأْكُلُهَا، وَلَا يَقْطَعُ رَأْسَهَا فَيُرْمِي بِهَا". (شرح مشکل الآثار: ۳۲۹/۲)

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "عُضْفُورٌ قَطٌّ" قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: كَأَنَّهُ يَعْنِي مَا قُتِلَ عُضْفُورٌ قَطٌّ عَبَثًا قَالَ أَبُو بَكْرٍ: فَمَا فَوْقَهُ أَوْ فَمَا دُونَهُ إِلَّا عَجَّ إِلَى اللَّهِ عِزًّا وَجَلًّا يَوْمَ الْقِيَامَةِ: يَا رَبِّ فُلَانٌ قَتَلَنِي، فَلَا هُوَ انْتَفَعَ بِي، وَلَا هُوَ تَرَ كَنِي أَعِيشُ فِي حُشَارَاتِهَا، فَكَانَ قَاتِلَ الْهُدْهُدِ إِخْلَافِي هَذَا الْمَعْنَى، وَاللَّهُ أَعْلَمُ. (شرح مشکل الآثار: ۳۲۹/۲)

(۲) (صرد): اسی طرح لٹورا کو مارنے میں بھی فعل عبث لازم آتا ہے، کیونکہ بہت سے لٹوروں کو مار کر بھی فائدہ اٹھایا نہیں جاسکتا ہے، اور اس کا قتل بھی وعیدوں میں داخل ہوگا، جو بیان کی گئی۔

(۳) (الخلعة): (شہد کی مکھی) اس کو دو وجہوں سے ہدہ اور لٹورے کے مقابلہ میں مارنا

زیادہ گناہ ہے (۱) ایک وجہ یہ ہے کہ اس کو مارنے سے شہد جیسی منفعت کو فوت کرنا لازم آتا ہے
(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کو مارنے کے بعد اس سے انتفاع کا دروازہ بند ہو جائے گا، اس لئے
اس کو مارنا جرم، عبث اور گناہ ہے، صاحب بذل ذکر کرتے ہیں:

”والنحلة لما فيه من المنفعة وهو العسل والشمع“. (بذل المجهود: ۱۳/۶۵۲)

(۴) (الغملة) : (چیونٹی) اس کو مارنے سے نہ کوئی منفعت حاصل ہوتی ہے اور نہ کوئی
تکلیف کو دور کرنا لازم آتا ہے، اس لئے اس کو مارنا بھی فعل عبث ہے۔

تعارض:

باب کے شروع والی چند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چیونٹی کو مارنا منع ہے؛ جب کہ
حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ چیونٹی کو مارنا جائز ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ”نَزَلَ نَبِيٌّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ تَحْتَ
شَجَرَةٍ فَلَدَغَتْهُ نَمْلَةٌ فَأَمَرَ بِجَهَازِهِ فَأَخْرَجَ مِنْ تَحْتِهَا، ثُمَّ أَمَرَ بِهَا فَأُحْرِقَتْ بِالنَّارِ فَأَوْحَى اللَّهُ
إِلَيْهِ فَهَلَا أَخَذَتْ نَمْلَةً وَاحِدَةً؟“ (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۳۲)

دفع تعارض:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ جس روایت میں چیونٹی کو مارنے کا حکم ہے، اس کا تعلق اس
چیونٹی کے ساتھ ہے، جو موزی جانوروں کے قبیل سے ہے، اور جن روایات میں نہیں وارد ہوئی
ہے اس کا تعلق ان چیونٹی کے ساتھ ہے، جو موزی اور سباع کے قبیل سے نہیں ہیں۔

وَفِي ذَلِكَ مَا قَدْ دَلَّ عَلَىٰ إِبَاحَةِ قَتْلِ مَا آذَى مِنَ النَّمْلِ وَفِيمَا قَبْلَهُ النَّهْيُ عَنِ قَتْلِ مَا لَمْ
يُؤْذِ مِنْهَا. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۳۲)

اقوال المحدثين:

(۱) ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہاں جس چیونٹی کو مارنے سے منع کیا گیا ہے وہ ایک خاص قسم کی چیونٹی مراد ہے، جو لمبے پیروالی ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ کم ضرر پہنچاتی ہے۔

قال القاري: عن نوع خاص منها وهو الكبار ذوات الأرجل الطوال. (مرقاة

المفاتيح: ۷/۴۳۳)

(۲) علامہ دمیری فرماتے ہیں کہ چیونٹی کو قتل کرنے میں مذہب شافعی یہ ہے کہ حدیث میں جس چیونٹی کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، وہ بڑی چیونٹی ہے، جس سے حضرت سلیمانؑ نے گفتگو کی تھی؛ لیکن چھوٹی چیونٹی جس کو ”الذر“ کہتے ہیں اس کو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (حیوة

الحيوان: ۲/۶۷۲)

(۳) قال المناوي في فيض القدير: قال الخطابي: أراد النمل السلیمان ﷺ للكبار ذوات الأرجل الطوال فإنما قليلة الأذى۔۔۔۔۔ (فيض القدير: ۶/۲۳۶)

(۴) قال العلامة السندی: وظاهر الحديث يفيد أن الاحراق كان جائزاً في شريعة ذلك النبي، فلذلك ما عاتب الله تعالى عليه بالاحراق وإنما عاتب بالزيادة على الواحدة التي قرصت وهو غير جائز في شريعتنا فلا يجوز احراق التي قرصت ايضاً وأما قتل المودى فجائز؛ (حاشية ابن ماجه: ۳/۵۷۹، ۵۷۸)

(۵) قال النووي هذا الحديث محمول على أنه كان ذلك في شرع ذلك النبي جواز يقتل النمل وجواز التعذيب بالنار فإنه يقع عليه العنب في أصل القتل، ولا في الاحراق بل في الزيادة على النملة الواحدة وأما في شرعنا فلا يجوز احراق الحيوان بالنار إلا في القصاص بشرطه وكذا لا يجوز عندنا قتل النمل لحديث به، عباس رضي الله عنهما في السنن ان النبي ﷺ نهى عن قتل النملة والنحلة۔۔۔۔۔ (ذخيرة العقبى: ۳۳/۲۷۰)



باب :- ۱۲۸

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ:

”يُسْتَجَابُ لِأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَعْجَلْ فَيَقُولُ: دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِي“

﴿دعا کی قبولیت کے آداب کا بیان﴾

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ”يُسْتَجَابُ لِأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَعْجَلْ

فَيَقُولُ: دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِي“ . (شرح مشکل الآثار: ۳۳۳/۲)، ورواه البخاري: (۶۳۳۰)، ومسلم:

(۲۷۳۵)، وأبو داود: (۱۲۸۳)

خلاصۃ الحدیث:

بلاشبہ دعاء مومن کا ہتھیار ہے (جس کو اللہ سے مانگنا آ گیا، اس کو سب کچھ آ گیا) جس کے ذریعہ انسان اللہ کے سامنے اپنی ضرورت پیش کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ مومن کی ہر دعاء قبول کرتا ہے، بشرطیکہ اس میں عجلت نہ کرے، احادیث میں دعاء ہی کو عبادت کہا گیا، جیسے حدیث میں وارد ہوا ہے ”الدعا هو العبادة“ اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ بندہ کی ہر دعاء قبول ہوتی ہے، جب تک جلدی نہ کرے، جلدی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یوں نہ کہے ”قد دعوت فلم يستجبه لي“ یعنی میں نے دعاء کی؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں کی۔

اشکال:

بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ بندہ ”قد دعوت فلم يستجبه لي“ نہیں کہتا، پھر بھی اس کی

دعاء قبول نہیں ہوتی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:

جواب یہ ہے کہ حدیث تو اپنی جگہ صحیح ہے؛ لیکن دوسری حدیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے بندہ کی دعاء بہر حال قبول ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت میں ہے:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "دَعْوَةُ الْعَبْدِ الْمُسْلِمِ لَا تَرُدُّ إِلَّا بِأَحَدِي ثَلَاثٍ، مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيعَةٍ رَحِمَ، وَإِمَّا أَنْ يُضْرَفَ عَنْهُ مِنَ الشُّؤْمِ بِقَدْرِ مَا دَعَا". (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۳۴)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کی ہر دعاء قبول ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ گناہ اور قطع تعلق کے لئے دعاء نہ کیا ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کی ہر دعاء قبول ہوتی ہے، نیز دیگر احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قبولیت دعاء کی تین صورتیں ہیں: (۱) جس چیز کی دعاء کی جاتی ہے، تو بعینہ وہ مل جاتی ہے۔ (۲) کبھی کوئی آنے والی مصیبت اس سے ٹال دی جاتی ہے۔ (۳) کبھی اس کا بدلہ قیامت میں ملے گا، لہذا واضح ہو گیا کہ یہاں استجابت دعاء سے کیا مراد ہے۔

اقوال المحدثین:-

(۱) ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ دعائیں خوب الحاح و زاری کرے، پھر اس کی دعاء قبول کرتے ہیں، یا یہ کہ اسنے جس چیز کی دعاء کی ہے اس کا حاصل نہ ہونا اس کے لئے بہتر ہو، اس لئے اس کی دعاء قبول نہیں ہوتی۔

أَوْ يُوَخَّرُ دَعَاةً لِيَلْحَ وَيَبَالِغَ فِي الدَّعَاءِ فَإِنَّ اللَّهَ يَجِبُ الْمَلْحِينَ فِي الدَّعَاءِ وَلَعَلَّ عَدَمَ

قبول دعائے بالمطلوب المخصوص خیر له من تحصیله واللہ یعلم وأنتم لاتعلمون.
(مرقاۃ المفاتیح: ۱۱۷/۵)

(۲) بذل المجہود میں حافظ ابن حجرؒ کے جواب کے بعد محدث کبیر خلیل احمد سہارنپوریؒ نے ابن الجوزی کے حوالے سے جواب دیا ان کی عبارت یہ ہے:

والجواب عنه أن الحافظ نقل عن الكرمانی أنه دل الحدیث علی ان مطلق قوله
تعالیٰ ”أجیب دعوة الداع إذا دعان“ مقید بما دل علیه الحدیث-

قلت: ويمكن ان یجاب بان المراد من الاجابة الموعودة هو الأعم من تحصیل
المطلوب بعینه أو ما یقوم مقامه ویزید علیہ والی ذلك اشار ابن الجوزی بقوله: اعلم أن
دعاء المؤمن لا یرد غیره أنه قد یكون الأولى والاحادیث أیضاً تدل علی أن دعوة المؤمن لا
تردو أنها إمان تعجل له الاجابة، وإمان تدفع عنه السوء مثله وإمان تاخر له فی الآخرة
مما سأل. (بذل المجہود: ۲۰۸/۶، ۲۰۷)

حافظ ابن حجرؒ ”فتح الباری“ میں لکھتے ہیں:

ہر آدمی کی دعا قبول ہوتی ہے، البتہ قبولیت کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں، کبھی اپنی مطلوبہ
چیز بعینہ حاصل ہو جاتی ہے، کبھی اس کے بدلہ میں کوئی اور چیز حاصل ہو جاتی ہے، اس کے متعلق
متعدد احادیث وارد ہوئی، ہیں جن کو امام ترمذیؒ اور امام حاکمؒ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے
مرفوعاً تخریج کی ہیں۔ ”ما علی الارض مسلم یدعو بدعوة الا اتاه اللہ ایاها أو صرف عنه من
السوء مثلها“.

الغرض حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کی دعائیں تین صورتوں میں سے کسی ایک
صورت میں ضرور قبول ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحم پر مشتمل نہ ہو، ایک صورت یہ کہ اس

نے جس چیز کا مطالبہ کیا ہے، وہ یا تو فی الفور عطا کر دی جاتی ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے لئے آخرت میں ثواب کے طور پر ذخیرہ کر دیا جاتا ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ اس سے اس کے مثل کوئی مصیبت دور کر دی جاتی ہے۔

امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

والجواب عن ذلك أن كل داع يستجاب له، لكن تتنوع الاجابة، فتارة يقع بعين ما دعا به تارة بعوضه، وقد ورد في ذلك حديث صحيح أخرجه الترمذي والحاكم من حديث عبادة بن الصامت رفعه ما على الامر من مسلم يدعو بدعوة الا آتاه الله اياها ان صرف عنه من السوء مثلها. (فتح الباری: ۲/۳۷۳)



باب :- ۱۲۹

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي تَأَخُّرِ جَبْرِيلَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي
الْوَقْتِ الَّذِي كَانَ وَعَدَهُ أَنْ يَأْتِيَهُ فِيهِ فِي مَنْزِلِهِ بِسَبَبِ الْجَزْوِ الَّذِي كَانَ فِي بَيْتِهِ، وَلَمْ
يَعْلَمْ بِهِ

﴿ نزول وحی کے زمانہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
تاخیر سے آنے کا بیان ﴾

عَنْ مَيْمُونَةَ قَالَتْ: خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأْتِرَ أَفْقُلْتُ: يَا
رَسُولَ اللَّهِ مَا لِي أَرَاكَ فَأْتِرًا؟ فَقَالَ: "إِنَّ جَبْرِيلَ وَعَدَنِي فَمَا أَخْلَفَنِي قَطُّ" فَظَلَّ يَوْمَهُ وَلَيْلَتَهُ
وَفِي الْبَيْتِ جَرُّوْ كَلْبٍ نَحْتِ سَرِيرٍ لَهُمْ فَأَخْرَجَهُ، ثُمَّ أَخَذَ مَاءً بِيَدِهِ فَنَضَّحَ مَكَانَهُ فَأَتَاهُ جَبْرِيلُ
عَلَيْهِ السَّلَامُ، فَقَالَ: "مَا مَنَعَكَ؟" فَقَالَ: "إِنَّا لَا نَدْخُلُ بَيْتَافِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ" فَأَمَرَ بِقَتْلِ
الْكِلَابِ فَإِنْ كَانَ لِيَكَلِّمَ فِي الْكَلْبِ الصَّغِيرِ فَمَا يَأْذَنُ فِيهِ". (شرح مشكل الآثار: ۲/۳۳۸)، ورواه
الطبراني: ۳۳/۱۰۲۸، وابن حبان: (۵۸۵۶))

خلاصہ الحدیث:

اللہ تعالیٰ حضرت جبرئیل کے ذریعہ آپ ﷺ پر بتدریج تیس (۲۳) سال تک وحی
نازل فرماتے رہے، اس طرح سے نبوت و شریعت پائے تکمیل تک پہنچی، اس درمیان حضرت
جبرئیل کا آپ ﷺ کے پاس آنے جانے کا ایک معمول بن گیا تھا، جس میں ایک دفعہ کے بعد

دوسری دفعہ آنے کا کبھی وعدہ بھی فرماتے تھے، اور کبھی حکم خداوندی کے مطابق بر بنائے مصلحت تاخیر کی صورت بھی پیش آجاتی تھی، جیسا کہ حدیث مذکور میں اسی کا ایک قصہ مذکور ہے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب نبوت ملنے کے بعد حضرت جبریلؑ نے کثرت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کا وعدہ کیا تھا، حسب وعدہ حضرت جبریلؑ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے؛ لیکن درمیان میں کئی دن نہیں آئے، نہ آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ میں کتا تھا، پھر جب اسے نکال دیا گیا، تب آنے لگے، جیسا کہ حضرت میمونہؓ کی حدیث میں مذکور ہے۔

اشکال:

باب کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبریلؑ نے متعین وقت سے آنے کا وعدہ مطلقاً کیا تھا، یعنی کسی عذر کو مستثنیٰ نہیں کیا تھا، پھر انہوں نے کتے کی وجہ سے وعدہ کو پورا کیوں نہیں کیا؟ (وعدہ میں کتے کے عذر کو مستثنیٰ کر کے وعدہ کے خلاف کیوں کیا؟)۔۔۔

فَفِيمَا رَوَيْنَا أَنَّ جِبْرِيلَ وَعَدَّ رَسُولَ اللَّهِ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ أَنْ يَأْتِيَهُ إِلَى مَنْزِلِهِ فِي سَاعَةٍ بَعَيْنَهَا بِلَا اسْتِثْنَاءٍ كَانَ فِي وَعْدِهِ إِتْيَاهُ بِذَلِكَ، ثُمَّ تَأَخَّرَ عَنْ إِتْيَانِهِ إِتْيَاهُ فِيهَا إِلَى مَنْزِلِهِ . (شرح

مشکل الآثار: ۲/۳۲۱)

جواب:

وعدہ پورا کرنا واجب ہے؛ لیکن جب وعدہ کی بجا آوری معصیت الہی یا قطع رحمی کا موجب ہو، تو اس کو پورا کرنا واجب نہیں، اگرچہ بعض مرتبہ بعض چیزیں وعدہ میں مذکور نہیں ہوتیں، لیکن وہ ضمناً اس میں داخل ہو جاتی ہیں، مثلاً وعدہ کا شریعت کے مطابق ہونا، تو یہاں پر حدیث مذکور میں وعدہ تو ہوا ہے، لیکن شرعاً فرشتوں کو ایسے گھروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے

جس میں کتاب یا تصویر ہو، اس لئے اس عارض شرعی کی وجہ سے وعدہ کو پورا کرنا موقوف ہو گیا۔

إِذْ كَانَ فِيهِ مَا يَمْنَعُ مِنْ دُخُولِهِ إِتَاءَهُ وَهُوَ الْكَلْبُ الَّذِي كَانَ فِيهِ؛ لِأَنَّ فِي الشَّرِيعَةِ أَنَّهُ لَا يَدْخُلُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ، وَكَانَ ذَلِكَ بِالشَّرِيعَةِ مُسْتَثْنَى مِنْ وَعْدِهِ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ اسْتِثْنَاؤُهُ مِنْهُ بِلِسَانِهِ. (شرح مشکل الآثار: ۳۲۱/۲)

آگے امام طحاویؒ مذکورہ جواب کی تائید کے لئے چند نظیریں ذکر کی ہیں۔

(۱) ایک شخص نے اپنے کسی ساتھی سے ایک متعین وقت میں اس کے گھر جانے کا وعدہ کیا جب اس کے گھر گیا، تو وہاں شراب پی جا رہی تھی، اس وقت وہ شخص واپس آ گیا اور اس کے گھر کے اندر نہیں گیا، تو اس صورت میں وہ شخص وعدہ خلافی کرنے والا شمار نہیں ہوگا؛ کیونکہ یہاں مانع شرعی پایا گیا۔

فَمِثْلُ ذَلِكَ: الرَّجُلُ يَعِدُ الرَّجُلَ بِالْجُلُوسِ عِنْدَهُ فِي مَنْزِلِهِ لَمَّا يَسْأَلُهُ الْجُلُوسَ عِنْدَهُ فِيهِ فِي وَقْتٍ يَدْخُرُهُ فَيَكُونُ فِي مَنْزِلِهِ فِي ذَلِكَ الْوَقْتِ مَا تَمْنَعُهُ الشَّرِيعَةُ مِنْ دُخُولِ ذَلِكَ الْمَنْزِلِ وَهُوَ فِيهِ مِنْ خَمْرٍ يُشْرَبُ فِيهِ أَوْ مِمَّا سِوَاهَا مِنَ الْمَعَاصِي الَّتِي تَمْنَعُهُ الشَّرِيعَةُ مِنْ حُضُورِهَا فَيَتَخَلَّفُ مِنْ دُخُولِ مَنْزِلِهِ لِذَلِكَ فَلَا يَدْخُلُ بِتَخَلُّفِهِ ذَلِكَ فِي حُكْمٍ مِنْ وَعْدٍ وَعَدًّا فَأَخْلَفَهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳۲۱/۲)

(۲) ایک شخص نے اپنی بیوی سے ایک متعین وقت میں وطی کرنے کا وعدہ کیا؛ لیکن اس متعین وقت میں وہ عورت حائضہ ہو گئی، تو اس صورت میں وطی نہ کرنے کی وجہ سے وعدہ خلافی کرنے والا شمار نہیں ہوگا۔

وَمِثْلُ ذَلِكَ أَيْضًا أَنْ يَعِدَ زَوْجَتَهُ بِوَطْئِهِ إِتْيَاهَا فِي وَقْتٍ يَدْخُرُهُ لَهَا فَيَدْرِكُهَا الْحَيْضُ فِي

وَقْتِهَا ذَلِكَ فَلَا يَكُونُ بَتْرَ كَيْهِ وَطَأْهَا فِي حُكْمٍ مِّنْ وَعْدٍ وَعَدَاثُمَّ أَخْلَفَهُ.

(شرح مشکل الآثار: ۳۴۲/۲)

(۳) ایک شخص نے کسی سے وعدہ کیا کہ زید جس دن آئے گا، اس کے دوسرے دن میں روزہ رکھوں گا اور جب زید آیا، تو آئندہ دن ”یوم نحر“ تھا، اس دن میں یہ شخص ”یوم نحر“ کی حرمت کی وجہ سے روزہ نہیں رکھے گا اور اس صورت میں وہ وعدہ خلافی کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔

وَمِثْلُ ذَلِكَ الرَّجُلُ يَجْعَلُ عَلَى نَفْسِهِ صَوْمَ غَدِ اللَّيْلَةِ الَّتِي يَتَقَدَّمُ فِيهَا فَلَانٌ فَيَقْدَمُ فَلَانٌ فِي لَيْلَةٍ يَكُونُ غَدَهَا النَّحْرُ فَيَتْرُكُ صَوْمَهُ لِحُرْمَةِ صَوْمِهِ فَلَيْسَ بَتْرَ كَيْهِ ذَلِكَ مَذْمُومًا بَلْ هُوَ مَحْمُودٌ فِيهِ، وَغَيْرُ دَاخِلٍ فِي مَنْ وَعَدَ وَعَدَا فَأَخْلَفَهُ إِذَا كَانَ الَّذِي مَنَعَهُ مِنَ الْوَفَاءِ لِمَا قَالَ الشَّرِيعَةُ. (شرح مشکل الآثار: ۳۴۲/۲)

(۴) ایک شخص نے کسی سے کہا کہ میں فلاں جگہ آپ کا انتظار کر رہا ہوں، ابھی وہ انتظار کر ہی رہا تھا کہ نماز کا وقت آ گیا، تو وہ نماز کے لئے چلا گیا، اس صورت میں بھی وہ وعدہ خلافی کرنے والا شمار نہیں ہوگا۔

وَمِثْلُ ذَلِكَ الرَّجُلُ يَعِدُ الرَّجُلَ أَنْ يَجْلِسَ لَهُ فِي مَكَانِهِ مُنْتَظِرًا لَهُ حَتَّى يَأْتِيَهُ فَتَحْضُرَ الصَّلَاةُ فَيَقُومُ لَهَا وَيَدْعُ أَنْتِظَارَهُ فَلَيْسَ هُوَ بِذَلِكَ مُخْلَفٌ وَعَدِهِ إِذْ كَانَ قِيَامُهُ إِلَيْهَا قِيَامًا إِلَى مَا دَعَاهُ اللَّهُ إِلَيْهِ قَبْلَ وَعْدِهِ الرَّجُلَ الَّذِي وَعَدَهُ بِأَنْتِظَارِهِ إِيَّاهُ فِي مَكَانِهِ ذَلِكَ، وَكَانَ ذَلِكَ مُسْتَشْنَى بِالشَّرِيعَةِ، وَإِنْ لَمْ يَسْتَشْنَى مِنْ وَعْدِهِ بِلِسَانِهِ، وَقَدْ رُوِيَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ مِثْلُ ذَلِكَ أَيْضًا. (شرح مشکل الآثار: ۳۴۲/۲)

اقوال المحدثین:

علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ یہ وعدہ خلافی نہیں ہے، بل کہ ان کا یہ وعدہ ایک ایسے

امر کے ساتھ مقید تھا جو نہیں پایا گیا، اس لئے ان کے اس عمل کو عدہ خلافی پر محمول نہیں کریں گے۔

”المراد ان هذا ليس إخلافاً منه للوعد بل لا بد ان يكون وعدة مقيداً بأمر قد فقد وإلا فلا يتصور منه خلاف في الوعد“۔ (فتح الملهم: ۱۰/۱۳۳)

صاحب لمعات التتقیح لکھتے ہیں:-

”ما أخلفني“ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے میرے ساتھ وعدہ خلافی کبھی نہیں کی، اس لئے اس بار کی وعدہ خلافی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو افسوس ہوا، یا اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ بغیر کسی عذر اور علت کے میرے ساتھ وعدہ خلافی نہیں کرتے تھے، لہذا یہاں کوئی مانع پائے جانے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں ہے۔

وقوله: (ما أخلفني) معناه لم يخلفني قط فهو تحسر على إخلافه الآن أو لا يخلفني من غير عذر وعلّة فلا جرم يكون هنا ما منعه. (لمعات التتقیح: ۷/۳۵۵)

اور شرح صحیح مسلم ”الكوكب الوهاج والروض البهاج“ میں ہے:

حضرت اُبیؓ نے فرمایا: یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ عبارت وعدہ پورا کرنے کے وجوب پر دلالت کرتا ہے؛ کیونکہ جس بات کا وعدہ کیا گیا ہے اس کو پورا کرنے کا وجوب اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ کوئی مانع نہ ہو، اس وقت وعدہ کا پورا کرنا واجب ہوگا۔

(ما يخلف الله) تعالیٰ (وعده) أي ما يترك وفاء ما وعدة بعبادة (ولا) يخلف (رسله) من الانس والملائكة وفاء وعدهم لئن وعدة فكيف أخلفني جبريل وعدة، قال الأبي لا يقال يدل هذا على وجوب الوفاء بالوعد لأن الوجوب على القول به مشروط بانتفاء المانع. (الكوكب الوهاج: ۲۱/۴۳۰)



باب :- ۱۳۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الْكِبَائِرِ الَّتِي وَعَدَ اللَّهُ تَعَالَى مُجْتَنِبِيهَا مِنْ عِبَادِهِ بِتَكْفِيرِ سَيِّئَاتِهِمْ سِوَاهَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: ﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كِبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلَكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا﴾ (النساء: 31).

﴿کبیرہ گناہوں کا بیان﴾

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَيُّ الذُّبِّ أَكْبَرُ؟ قَالَ: "أَنْ تَجْعَلَ لِخَالِقِكَ نِدًّا وَقَدْ خَلَقَكَ" قُلْتُ: ثُمَّ أَيُّ؟ قَالَ: "أَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةً أَنْ يَأْكُلَ مَعَكَ" قُلْتُ: ثُمَّ أَيُّ؟ قَالَ: "أَنْ تُزَانِيَ حَلِيلَةَ جَارِكَ" قَالَ: ثُمَّ نَزَلَ الْقُرْآنُ بِتَصْدِيقِ قَوْلِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ﴾ (الفرقان: 68) إِلَى آخِرِ الْآيَةِ. (شرح مشکل الآثار: ۳۴۳/۲)؛ ورواه البخاري: (۳۷۶۱)؛ و(۶۷۱۱)؛ والترمذي: (۳۱۸۲)؛ والنسائي: (۹۰۷۷).

خلاصہ الحدیث:

جس طرح قرآن مجید الفاظ و معانی کے اعتبار سے ایک معجز کتاب ہے، اسی طرح نظم کلام، ترتیب و مناسبت کے اعتبار سے بھی، اسی لئے قرآن مجید کا ایک خاص انداز بیان ہے، جہاں ایک جگہ پر امت کو کسی عذاب سے ڈراتا ہے، تو وہیں اس کے فوراً بعد جنت اور اس کی نعمت کی بشارت سناتا ہے، تاکہ انسان کا ایمان خوف اور رجاء کے درمیان قائم رہے، چنانچہ اس آیت سے پہلے چند آیات میں بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا ہے، ان کے بعد ترغیبی آیات کو ذکر کیا ہے، یعنی اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے، تو اللہ تعالیٰ تمہارے چھوٹے گناہوں

کو معاف فرمادیں گے اور تم کو عزت اور راحت کے اس مقام پر داخل کر دیں گے جس کو جنت کہتے ہیں۔

ان آیات میں جن کبائر سے بچنے کا ذکر ہے، اس بارے میں روایات مختلف ہیں، چنانچہ سب سے پہلے ابن مسعود رضی اللہ کی روایت کا ذکر ہے، جس میں تین بڑے گناہوں کا ذکر ہے۔

(۱) شرک باللہ (۲) اپنے بچے کو قتل کرنا اس ڈر سے کہ وہ آپ کے ساتھ کھائیں گے (۳) پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کرنا؛ اگرچہ اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ کبائر میں اشد شرک باللہ ہے، پھر دوسرا اور تیسرا، جبکہ اعرابی والی دوسری روایت سے ترتیب کے ساتھ چند دوسرے گناہوں کا ذکر ملتا ہے۔

یعنی سب سے پہلے شرک باللہ، پھر والدین کی نافرمانی، پھر یمین غموس۔ (جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا)

حدیث الباب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ہے دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی ہے۔

تعارض:

دونوں روایات میں سب سے پہلے شرک باللہ کا ذکر ہے، لیکن دوسرے نمبر پر عقوق الوالدین، تیسرے نمبر پر پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کرنا، الغرض دونوں احادیث میں مختلف چیزوں کا ذکر ہے، یعنی پہلی حدیث میں قتل اولاد کا ذکر ہے، تو دوسری حدیث میں عقوق الوالدین کا، اسی طرح تیسرے نمبر پر اختلاف بھی ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَا الْكَبَائِرُ؟ قَالَ: "الْإِشْرَاكُ بِاللَّهِ" قَالَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: "ثُمَّ عُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ" قَالَ: ثُمَّ مَاذَا؟

قَالَ: "ثُمَّ الْيَمِينُ الْغَمُوسُ". (شرح مشکل الآثار: ۳۲۵/۲)

جمع و تطبیق:

اس تعارض کا دفاع یہ ہے کہ جس طرح قتلِ ولد دوسرے نمبر کا گناہ کبیرہ ہے، اسی طرح عقوق والدین بھی دوسرے درجہ کا ہے، لہذا دونوں کا درجہ برابر ہونے کی وجہ سے ایک حدیث میں قتلِ ولد کا ذکر ہے اور دوسری میں عقوق والدین کا، اسی طرح تیسرے نمبر پر پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا اور یمینِ غموس گناہ میں برابر ہے، اس لئے دونوں احادیث میں الگ الگ ذکر کیا۔

فَاحْتَمَلَ أَنْ يَكُونَ ذَلِكَ عَلَى أَنْ قَتَلَ الْوَلَدَ، وَعُقُوقَ الْوَالِدَيْنِ مِنْهَا فِي دَرَجَةٍ وَاحِدَةٍ، وَيَمِينِ الْغَمُوسِ مِنْهَا وَمُزَانَةَ الرَّجُلِ حَلِيلَةَ جَارِهِ فِي دَرَجَةٍ، تَتَلَوَهَا حَتَّى لَا يُخَالِفَ وَاحِدٌ مِنْ حَدِيثِي ابْنِ مَسْعُودٍ، وَعَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو الْحَدِيثَ الْآخَرَ، وَ----- (شرح مشکل الآثار: ۳۲۶/۲)

(۲) شرک کے بعد چونکہ دوسرے نمبر پر قتلِ ولد اور عقوق والدین ایک ہی درجہ کے ہیں، اسی طرح تیسرے نمبر پر پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا اور یمینِ غموس ایک ہی درجہ کے ہیں، اس لئے حضرت ابن مسعودؓ کے سوال کرنے پر ان درجات کے گناہوں میں سے ایک ذکر کیا اور ایک اعرابی کے ذکر کرنے پر دوسرے کا ذکر کیا؛ لہذا کوئی تعارض نہیں رہا۔

وَيَكُونُ جَوَابُهُ الْأَوَّلُ مِنْ مُسْأَلَةِ الْمَدْكُورِينَ فِيهِمَا كَمَا أَجَابَهُ بِهِ فِي الْحَدِيثِ الْمَدْكُورِ سُؤَالَهُ إِيَّاهُ عَمَّا سَأَلَهُ عَنْهُ، غَيْرَ أَنَّا نَأْمَلْنَا بَعْدَ ذَلِكَ هَذَيْنِ الْحَدِيثَيْنِ فَوَجَدْنَا فِي تَأْوِيلِهِمَا مَا هُوَ أَوْلَى بِهِمَا مِنْ هَذَا التَّأْوِيلِ الَّذِي ذَكَرْنَا، وَوَجَدْنَا جَائِزًا أَنْ يَكُونَ قَتْلُ الرَّجُلِ وَوَلَدُهُ خَشِيَةً أَنْ يَأْكُلَ مَعَهُ، وَعُقُوقُهُ لَوَالِدَيْهِ فِي دَرَجَةٍ وَاحِدَةٍ تَالِيَةً لِلشَّرْكِ بِاللَّهِ تَعَالَى فَأَجَابَ ابْنُ مَسْعُودٍ بِأَحَدِهِمَا، وَأَجَابَ سَائِلُهُ فِي حَدِيثِ ابْنِ عَمْرٍو بِالْآخَرِ مِنْهُمَا،

----- (شرح مشکل الآثار: ۳۴۶/۲)

مثال:

امام طحاویؒ نے اس کی ایک مثال پیش کی ہے، مثلاً کسی سے کہا جائے کہ لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر کون ہے؟ پس وہ کہے فلاں، پھر کہا جائے کہ پھر کون؟ تو وہ کہے کہ فلاں! اب دوسرا بھی اس کے درجہ کا ہے؛ لیکن اس کا نام یہ نہیں لے رہا ہے، پھر بھی یہ کلام صحیح ہوگا، اس طرح بظاہر ان معارض روایات میں بھی ہوگا۔

وَمِثْلُ هَذَا مِنَ الْكَلَامِ الصَّحِيحِ أَنْ يُقَالَ لِلرَّجُلِ: مَنْ أَشْجَعُ النَّاسِ؟ فَيَقُولُ: فُلَانٌ، ثُمَّ يُقَالُ لَهُ: ثُمَّ مَنْ؟ فَيَقُولُ: ثُمَّ فُلَانٌ لِرَجُلٍ آخَرَ، هُوَ كَذَلِكَ وَهُنَاكَ آخَرٌ مِثْلُهُ قَدْ سَكَتَ عَنِ اسْمِهِ فَلَمْ يَذْكُرْهُ، فَيَكُونُ ذَلِكَ كَلَامًا صَحِيحًا فَمِثْلُ ذَلِكَ جَوَابُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِابْنِ مَسْعُودٍ وَجَوَابُهُ فِي حَدِيثِ ابْنِ عَمْرٍو وَفِي ذَلِكَ مَا قَدْ دَلَّ أَنْ لَا تَضَادَّ فِي وَاحِدٍ مِنْهُمَا لِآخَرَ، ثُمَّ كَانَ مَنْ فِي الْمَنْزِلَةِ الثَّلَاثَةِ فِي حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ، وَابْنِ عَمْرٍو كَمَنْ هُوَ فِي الْمَنْزِلَةِ الثَّانِيَةِ فِي حَدِيثِهِمَا جَمِيعًا عَلَى مَا ذَكَرْنَا فِيهِمَا. (شرح مشکل الآثار: ۳۴۶-۳۴۷/۲)

تعارض:

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی روایت میں اشراک باللہ کے بعد عقوق الوالدین اور قول زور کا ذکر آیا ہے، نیز حضرت عبداللہ بن اُنیس کی روایت میں یمین غموس کا، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں سات گناہ کبیرہ کا، اور حضرت ابو یوب انصاریؓ کی روایت میں اشراک باللہ کے بعد ”قتل النفس التي حرمه الله و فرار يوم الزحف“ دو گناہوں کا، اور عمیرہ بن قنادہ کی روایت میں کو کبیرہ گناہوں کا، نیز حضرت عبداللہ بن عمر بن عاصم کی روایت میں آدمی کا اپنے والدین کو

گالی دینا اس کو گناہ کبیرہ بتایا، الغرض ان تمام روایات میں گناہ کبیرہ کا ذکر ہے، مگر باب کی روایت میں تعارض اس طرح ہے کہ باب کی شروع روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے کبیرہ کے متعلق سوال کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اشراک باللہ کے بعد دو گناہ کبیرہ کا ذکر فرمایا، جب کہ بعد والی چند روایات میں اشراک باللہ کے بعد ان کے علاوہ دیگر مختلف کبیرہ گناہوں کا ذکر فرمایا، اس طرح روایات میں تعارض ہے۔

دفع تعارض:

اکثر روایات میں سب سے پہلے شرک کا ذکر فرمایا ہے، تو معلوم ہوا وہ کبیرہ گناہوں میں پہلے درجہ کا ہے، اور پھر اس کے بعد ہر روایت میں الگ الگ کبیرہ گناہوں کا ذکر فرمایا، تو یہ تمام کے تمام کبیرہ گناہ ہی ہیں، مگر شرک کے بعد کے درجہ کے ہیں، لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے موقع کی مناسبت سے الگ الگ اوقات میں الگ الگ گناہوں کا ذکر فرمایا۔

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابن عباسؓ سے ایسی چیز منقول ہے، جس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی رائے سے نہیں کہی ہے، بلکہ کبار کی اس سے بھی زیادہ تعداد ہیں، جو اوپر گزر چکی ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے:-

وَقَدْ وَجَدْنَا عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ، وَابْنِ عَبَّاسٍ فِيهَا مِمَّا نَعْلَمُ أَنَّهُمَا لَمْ يَقُولَاهُ رَأْيًا وَلَا اسْتِنبَاطًا وَلَا اسْتِخْرَاجًا، لِأَنَّ مِثْلَهُ لَا يُقَالُ بِذَلِكَ وَأَنَّهُمَا لَمْ يَقُولَاهُ إِلَّا تَوْقِيفًا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۵۴)

اقوال المحدثین:

”الکوکب الوہاج“ میں قاضی عیاضؒ کے قول کو نقل کرتے ہوئے اس باب کے تحت

فرمایا کہ:

اس باب میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جواب میں اختلاف ہونے کی اصل وجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مختلف احوال کی رعایت و لحاظ کرنا ہے، جہاں جس چیز کو بیان کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے، حسب موقع آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کو بیان فرمادیتے ہیں، یا تو اس کے کثرت ارتکاب ہونے کی وجہ سے، یا تو اس کے واقع ہونے کے اندیشے سے، امام طحاوی علیہ الرحمہ ان روایات کے درمیان اس طرح تطبیق دی ہے کہ جن روایات میں شرک کے بعد دوسرے درجہ میں جن سے الگ الگ چیزوں کو بیان کیا گیا ہے، ان سب کو ملایا جائیگا اور گناہ میں ایک ہی درجہ قرار دیے جائیں، اس طرح سے آپس میں تطبیق ہو جاتی ہے، اور تیسرے درجے میں ایسا ہی کہا جائیگا، بعض حضرات نے یہ کہا کہ (قتل اور زنا) یہ دونوں گناہ ہیں، عقوق والدین اور یمین غموس سے مقدم ہیں، لہذا جس طریق میں عقوق والدین کو دوسرے درجے میں بیان کیا گیا ہے، وہ راوی کے عدم حفظ کی وجہ سے ہے، مصنف علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ جن لوگوں سے میں نے ملاقات کی ہے، ان میں سے بعض حضرات کا میلان بھی اس قول کی طرف ہے، لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ راوی کا کسی ایسی چیز کو بیان کرنا، جس کو دوسرے رواۃ بیان نہیں کرتے ہیں اور روایت بیانی میں غلطی کرنا یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی اجازت دے دی جائے، تو شریعت میں بہت سے فتنے فسادات پیدا ہو جائیں گے۔

قال القاضي عياض معنى الكبر أشد عقوبة ولا خفاء بان الشرك أكبرها واختلف الطرق فيما يلي الشرك، ففي هذا الطريق العقوق وفي متقدم القتل وفي الآتى أكبر الكبائر شهادة الزور، ولا يدل ما جعل تاليه في طريق أنه لا أكبر منه بعد الشكر لمعارضة ما في الآخر

ووجه الجمع بينهما أنه ان اختلف جوابه في ذلك لأن جوابه كان بحسب ما الحاجة الي بيانه حينئذ أمس، أما الكثرة ارتكابه أو خوف مواقعة لما تقدم في تسمية

أفضل الأعمال، وجمع الطحاوي بان قال: يضم ما جعل ثاني الشرك في طريق إلى ما جعل ثانيًا في الأخرى ويجعلان في درجة واحد من الإثم وكذلك فيما جعل ثالثاً.

و جمع بعضهم بان قال: القتل والزنا مقدمان على العقوق والغموس، فالطريق الذي جعل العقوق فيها ثانياً إنما هو بعدم حفظ الراوي وإليه مالٍ بعض عن من لقيناه وليس بسديد لان تحميل الراوي مالم يرو وتغليظه فيما روى باب لو فتح دخل على الشريعة منه خطب. (الكوكب الوهاج: ۳۵/۳)

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہ دونوں صحابہ ایسے کبار پر مطلع ہوئے ہیں، جو ان کبار سے زیادہ ہیں، جو اس باب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، اور دوسری بات یہ کہ اس صورت میں بعض وہ کبار ہیں، جن کا ذکر اوپر گزرا، یہ بعض کے ساتھ لاحق ہیں، نیز یہ بھی احتمال ہے کہ ان کے علاوہ کبار نہ ہوں، اور یہ بھی احتمال ہے کہ کبار تو ہوں، لیکن اللہ نے بندوں کو ان پر مطلع نہ کیا ہوتا، کہ وہ ان میں واقع ہونے سے بچتے رہیں۔

فَهَذَا أَيْضًا مِمَّا نَعْلَمُ أَنَّهُ قَدْ وَقَفَا عَلَيْهِ مِمَّا قَدَّرَ آدِفِي عَدَدِ الْكِبَائِرِ الَّتِي قَدَّرَ كَثْرَتَهَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذَا الْبَابِ مِمَّا فِي سُورَةِ التَّسَاءِ إِلَى: ﴿إِنَّ تَجْتَنِبُوا كِبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ﴾ (النساء: 31) (شرح مشكل الآثار: ۳۵۵/۲)

اشکال:-

اوپر جو دوسرا احتمال گزرا، اس پر کوئی یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ جو گناہ بندوں کے سامنے بیان نہیں کئے گئے، اس سے وہ کیسے بچ سکتے ہیں؟

فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: وَكَيْفَ يَجُوزُ أَنْ يُمْنَعُوا مِنْ شَيْءٍ لَا يَتَّبِعُونَ لَهُمْ مَا هُوَ حَتَّى يَجْتَنِبُوهُ. (شرح مشكل الآثار: ۳۵۶/۲)

جواب:

امام طحاوی اس کا جواب دے رہے ہیں کہ یہ ہمارے نزدیک ایسا ہی ہے، جیسا کہ ہماری

اس کتاب میں پہلے گزرا یعنی ”الحلال بین والحرام بین وبينهما مشتبهات“ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مشتبهات کو ذکر نہیں کیا؛ لیکن اگر اللہ بیان کرنا چاہتا تو بیان کر دیتا؛ لیکن اس لئے نہیں بیان کیا، تاکہ لوگ عام مشتبهات سے بچ جائیں۔

امام طحاوی فرماتے ہیں: اسی کے مانند دوسری مثال وہ حدیث ہے، جو شب قدر کے بارے میں وارد ہے، لیکن آپ نے اس رات کی تعیین نہیں کی، اور حدیث ابو ذر میں ارشاد فرمایا ”ولو شاء الله ان يطلعكم عليها لأطلعكم عليها“ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ یہاں پر بھی تعیین کو چھوڑ دیا تاکہ لوگ پورے عشرہ میں عبادت کریں اور کوئی رات موافق آجائے، اس طرح یہاں پر بھی بعض کبار کو شمار نہیں کرایا، تاکہ وہ تمام کبار کے ترک کرنے کا سبب بن جائے، واللہ اعلم۔

قِيلَ لَهُ: هَذَا عِنْدَنَا، وَاللَّهِ أَعْلَمُ كَمَثَلِ مَا قَدَّرَ وَوَيْتَاهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا تَقَدَّمَ مِنَّا فِي كِتَابِنَا هَذَا مِنْ قَوْلِهِ: ”الْحَلَالُ بَيْنَ، وَالْحَرَامُ بَيْنَ، وَبَيْنَ ذَلِكَ أُمُورٌ مُشْتَبِهَاتٌ الْوَاقِعُ فِيهَا كَالرَّاتِحِ إِلَى جَانِبِ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ“، فَلَمْ يُبَيِّنْهَا اللَّهُ لَهُمْ عَلَى لِسَانِ رَسُولِهِ وَلَوْ شَاءَ لَأَبَانَهَا لَهُمْ، وَلَكِنَّهُ قَدْ يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ تَرَكَ ذَلِكَ؛ لِيَجْتَنِبُوا الشُّبُهَاتِ كُلَّهَا، وَمِثْلُ ذَلِكَ مَا قَدَّرَ رُوِيَ عَنْهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ أَنَّهَا فِي رَمَضَانَ، ثُمَّ سَأَلُوا فِي أَيِّهَا مِنْهُ؟ فَأَعْلَمَهُمْ أَنَّهَا فِي الْعَشْرِ الْأَوَّخِرِ مِنْهُ وَلَمْ يُخْبِرْهُمْ أَيَّ لَيْلَةٍ هِيَ مِنْ لَيْلِيهِ، وَقَالَ لَهُمْ فِي حَدِيثِ أَبِي ذَرٍّ عَنْهُ فِي ذَلِكَ: ”لَوْ شَاءَ أَنْ يُطَّلِعَكُمْ عَلَيْهَا لَأَطَّلِعَكُمْ عَلَيْهَا“ وَسَنَدُ كَرِّ ذَلِكَ فِي بَابِهِ فِيمَا بَعْدَ مِنْ كِتَابِنَا هَذَا إِنْ شَاءَ اللَّهُ، وَكَانَ تَرَكَ إِعْلَامَهُمْ أَيَّ لَيْلَةٍ هِيَ مِنْ لَيْلِي الْعَشْرِ الْأَوَّخِرِ؛ لِيَعْمَلُوا فِيهَا كُلَّهَا عَمَلِ طَالِبِيهَا رَجَاءَ مُوَافَقَتِهَا، فَمِثْلُ ذَلِكَ إِنْ كَانَتْ كِبَائِرٌ مِنَ السَّيِّئَاتِ سِوَى مَا ذَكَرْنَا فِي هَذَا الْبَابِ فِي الْآثَارِ قَدْ يُحْتَمَلُ أَنْ يَكُونَ تَرَكَ تَبْيَانَهَا؛ لِيَكُونَ ذَلِكَ سَبَبًا لِتَرْكِهِمُ السَّيِّئَاتِ كُلَّهَا؛ لِأَنَّهَا مِنْهَا، وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۵۶)



باب :- ۱۳۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ لِابْنِ عُمَرَ، وَلَا ضَحَابِهِ لَمَّا رَجَعُوا إِلَيْهِ بَعْدَ فِرَارِهِمْ مِنَ الزَّحْفِ، وَقَوْلِهِمْ لَهُ: نَحْنُ الْفَرَازُونَ قَالَ: "بَلْ أَنْتُمْ الْعَكَازُونَ"

﴿"فَرَازُونَ" اور "عَكَازُونَ" کے مفہوم کا بیان﴾

عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: كُنْتُ فِي سَرِيَّةٍ مِنْ سَرَايَا رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَازَ النَّاسُ جِيْضَةً، وَكُنْتُ فِي مَنْ جَازَ فَقُلْنَا: كَيْفَ نَصْنَعُ وَقَدْ فَرَزْنَا مِنَ الزَّحْفِ وَبُؤْنَا بِالْغَضَبِ؟ فَقُلْنَا: لَوْ دَخَلْنَا الْمَدِينَةَ فَبِتْنَا بِهَا، فَقُلْنَا: لَوْ عَرَضْنَا أَنْفُسَنَا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنْ كَانَتْ لَنَا تَوْبَةٌ وَإِلَّا ذَهَبْنَا فَأَتَيْنَاهُ قَبْلَ صَلَاةِ الْغَدَاةِ فَخَرَجَ، فَقَالَ: "مَنْ الْقَوْمُ؟" قُلْنَا: نَحْنُ الْفَرَازُونَ، قَالَ: "بَلْ أَنْتُمْ الْعَكَازُونَ أَنَا فِتْنُكُمْ" أَوْ "أَنَا فِتْنَةُ الْمُسْلِمِينَ" فَأَتَيْنَاهُ حَتَّى قَبَلْنَا يَدَهُ. (شرح مشكل الآثار: ۳۵۷/۲، ورواه الترمذي: ۱۷۱۶)، وابن ماجه: (۳۷۰۳)، وأحمد: (۷۰۶۲))

خلاصہ الحدیث:

بدعہدی اور بے وفائی نہ صرف منافقوں کی علامت ہے بل کہ یہ گناہ کبیرہ ہے، اسی وجہ سے میدان جہاد سے بھاگنے کو شریعت نے گناہ کبیرہ قرار دیا، اور صحابہ کرام پر بھی ہمیشہ یہ فکر سوار رہتا تھا کہ میدان جہاد میں کہیں ہم سے یہ گناہ سرزد نہ ہو جائے، اسی احتیاط کا ایک قصہ حدیث مذکور میں آیا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک سریہ روانہ کیا، جس میں میں بھی تھا، چنانچہ جب دشمن سے مقابلہ ہوا، تو لوگوں کے پیر اکھڑ گئے اور وہ بھاگ نکلے اور میں بھی بھاگنے والوں میں سے تھا، پھر ہم نے ایک دوسرے سے کہا کہ ہم جنگ سے بھاگے ہیں، تو اب ہم کیا کریں، ہم غضب الہی کے مستحق ہو جائیں گے، تو ہم نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ ہم مدینہ میں داخل ہو جائیں، اور رات مدینہ میں گزار دیں اور صبح اٹھ کر آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو جائیں گے، اگر ہمارا قصور معاف ہو جاتا ہے، تو فیہا ورنہ ہم چلے جائیں گے، چنانچہ ہم صبح کی نماز سے قبل حجرے کے دروازہ پر آ کر بیٹھ گئے، جب آپ ﷺ حجرے سے باہر تشریف لائے، تو فرمایا کہ آپ لوگ کون ہیں؟ تو صحابہ فرماتے ہیں، ہم نے ٹوٹے ہوئے دلوں سے کہا کہ ہم بھگوڑے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں بلکہ تم لوگ دوبارہ پلٹ کر حملہ کرنے والے ہو اور میں تمہارا مرکز ہوں، یا یہ فرمایا کہ مسلمانوں کا مرکز ہوں، صحابہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ محرز کلام سن کر ہماری جان میں جان آگئی اور آپ ﷺ پر جانثار ہو گئے، چنانچہ ہم لوگ آپ ﷺ کے اور قریب ہو گئے، یہاں تک کہ آپ کے ہاتھوں کا بوسہ دیا۔

اعتراض:

معارض کا اعتراض یہ ہے کہ حدیث میں وارد شدہ ”عَكَارُونَ“ کا معنی عرب کے یہاں ”فَرَارُونَ“ ہے یعنی دوبارہ حملہ کرنا ”کما فی القاموس الوحید“ لہذا ”فَرَارُونَ“ یعنی بھاگنے والوں کے لئے یہ لفظ کیسے استعمال کر سکتے ہیں؟

فَقَالَ قَائِلٌ: الْعَكَارُونَ عِنْدَ الْعَرَبِ هُمْ الْكَرَّارُونَ فَكَيْفَ جَازَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنْ

يُقَالَ هَذَا الْقَوْلُ لِلْفَرَّارُونَ؟ (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۵۹)

جواب:

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں ”العکازون“ سے مراد یہ ہے کہ جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ ان کے لئے مرکز ہیں تو آپ ان کو جن چیزوں کا حکم دیں گے، اس کی طرف لوٹ جائیں گے، اور پلٹ جائیں گے، لہذا یہ ان کی طرف سے دوبارہ لوٹنا اور عود کرنا ہوگا، جس پر وہ پہلے تھے، یعنی دشمنوں کے قتال کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا، لہذا ان کو ”العکازون“ کہنا درست ہے۔

فَكَانَ جَوَابَنَا لَهُ فِي ذَلِكَ أَنَّ الْمُرَادَ بِذَلِكَ أَنَّهُمْ لَمَّا كَثُرُوا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فَتَنَهُمْ؛ لِيَرَّجِعُوا إِلَى مَا يَأْمُرُهُمْ بِهِ، وَلِيَنْصَرِفُوا فِيمَا يَنْصُرُهُمْ فِيهِ كَانَ ذَلِكَ كَثْرًا مِنْهُمْ إِلَيْهِ، وَعَوْدًا مِنْهُمْ إِلَى مَا كَانُوا عَلَيْهِ مِنْ بَدْلِ أَنْفُسِهِمْ لِقِتَالِ عَدُوِّهِمْ فَاسْتَحَقُّوا بِذَلِكَ أَنْ يَكُونُوا عَكَازِينَ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِحَقِيقَةِ ذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۳۵۹/۲)

اعتراض ثانی:

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ”تولی یوم الزحف“ گناہ کبیرہ ہے، تو گویا صحابہ کرام ”تولی من الزحف“ کی وجہ سے مرتکب کبیرہ ہوئے۔

وَفِي هَذَا الْحَدِيثِ مِمَّا يَجِبُ أَنْ يُوقَفَ عَلَيْهِ مِمَّا يُلْحَقُ بِالْكَبَائِرِ، وَهُوَ أَنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ ذَهَبَ إِلَى أَنَّ قَوْلَهُ تَعَالَى: ﴿وَمَنْ يُؤَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبرُهُ﴾ (الأنفال: 16). (شرح مشکل الآثار: ۳۵۹/۲)

جواب:

اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ آیت مبارکہ میں ﴿وَمَنْ يُؤَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبرُهُ﴾ (الأنفال: 16) یہ خاص طور پر اہل بدر کے بارے میں ہے، ان کے علاوہ کے بارے میں یہ حکم نہیں ہے، اس لئے کہ آیت مبارکہ میں ”يَوْمَئِذٍ“ ہے اور مسلمانوں کی اس وقت کوئی دوسری جماعت نہیں تھی،

صرف یہی جماعت تھی، جو بدر میں حاضر تھی، چنانچہ روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ آیت کریمہ ﴿وَمَنْ يُؤَلِّمْ يَوْمَئِذٍ دُبرَهُ﴾ (الأنفال: 16) ”بدر کے دن نازل ہوئی ہے۔“

إِنَّمَا ذَلِكَ فِي أَهْلِ بَدْرٍ خَاصَّةً دُونَ مَنْ سِوَاهُمْ، لِأَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لِلْمُسْلِمِينَ فِئَةٌ يَوْمَئِذٍ إِلَّا وَهِيَ حَاضِرَةٌ بِبَدْرٍ.

كَمَا حَدَّثَنَا عُبَيْدُ بْنُ رِجَالٍ، حَدَّثَنَا بَكْرُ بْنُ خَلْفٍ، حَدَّثَنَا بَشْرُ بْنُ الْمَفْضَلِ، عَنْ دَاوُدَ بْنِ أَبِي هِنْدٍ، عَنْ أَبِي نَضْرَةَ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ: ”نَزَلَتْ يَوْمَ بَدْرٍ ﴿وَمَنْ يُؤَلِّمْ يَوْمَئِذٍ دُبرَهُ﴾ (الأنفال: 16)“ . (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۵۹)

لیکن آگے امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ ”فرار من الزحف“ کا حکم یہ صرف بدر کے ساتھ خاص نہیں ہے؛ بلکہ غیر بدر میں کو بھی شامل ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا جنگ میں شامل نہ ہونا یہ غزوہ خندق کے موقع پر ہوا ہے، اور اس سے آپ ﷺ نے ان کو واپس کر دیا اور لڑائی میں شامل نہیں فرمایا اور یہ بات بالکل عیاں ہے کہ غزوہ خندق یہ بدر کے بعد پیش آیا ہے؛ لیکن پھر بھی حضرت ابن عمرؓ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم خدا کے غضب کو لیکر لوٹ رہے ہیں، لہذا یہ اس پر صریح دلیل ہے، کہ جنگ سے بھاگنے کا حکم یہ قیامت تک باقی رہے گا، اور کبیرہ گناہ میں شامل ہوگا، البتہ دو صورتیں مستثنیٰ ہیں: ایک ”محترفاً لِقِتَالٍ“ یعنی میدان جنگ سے اس لئے لوٹے تاکہ لڑائی کے لئے پینتر ابدلے یا ”متحيزاً الى فئته“ یعنی میدان جنگ سے مسلمان فوجی اس لئے لوٹے کہ مرکزی فوج سے تعاون حاصل کرے، تو ان دو صورتوں میں ”فرار عن الزحف“ جائز ہے، اور یہ فرار فرار نہ ہوگا، اس لئے آپ ﷺ ان کو فرما رہے ہیں کہ تمہارا یہ بھاگنا ”فرار عن الزحف“ نہیں ہے بلکہ ”متحيزاً الى فئته“ ہے اور میں تمہارے لئے

بمنزله مرکزی فوج کے ہوں؛ لہذا اب تم دوبارہ مقابلہ کے لئے آئے ہو، بھاگ کر نہیں آئے ہو۔ (واللہ اعلم)۔

اقوال المحدثین:

مولانا یحییٰ صاحب کاندھلویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ رشید احمد گنگوہیؒ سے سنا کہ انہوں نے فرمایا کہ جب کہ حضرت ابن عمرؓ مع ان کے رفقاء میدان جنگ سے بھاگنے کے بعد شرمندہ ہوئے، تو ان کا گناہ معاف ہو گیا، اس بناء پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ”العکازون“ بول کر تسلی دی اور مستحق وعید سے ان کو نکالا۔ (بذل المجہود: ۲۳۵/۹)

و کتب مولانا محمد یحییٰ من تقریر شیخہ قولہ فقال: لا بل انتم العکازون“ لا یخلوا الفرار یومئذ أن یكون جائز لهم اولا، و علی الاول فظاہر انہم لم یكونوا ممن فررارا استحق الوعید علیہ، و علی الثانی فتوجیہ اخر اجہم عنہم انہم کماندموا و علموا اعظم ما افترقوا فیہ مسقط عنہم ذنبہم، فلم یبق علیہم شیء، و علی الوجہین فصیح تسلیہ النبی والہ وسلم ایامہم و ادخالہم فی الاستثنائین المذكورین فی قولہ ثانی، ”ومن یولہم یومئذ دبرہ“۔ (بذل المجہود: ۲۳۵/۹)



باب :- ۱۳۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ: "إِذَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنِ الْعَبْدِ أَنْتَنِي عَلَيْهِ سَبْعَةٌ أَضْعَافٍ مِنَ الْخَيْرِ لَمْ يَعْمَلْهَا" وَمَا رَوَى عَنْهُ فِي السَّخَطِ مِثْلَ ذَلِكَ

﴿ فضائل اعمال کا بیان ﴾

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ، عَنِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: "إِذَا رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْعَبْدِ أَنْتَنِي عَلَيْهِ سَبْعَةٌ أَضْعَافٍ مِنَ الْخَيْرِ لَمْ يَعْمَلْهَا" وَقَالَ فِي السَّخَطِ مِثْلَهُ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۶۱)، وأحمد: (۷۶/۲)، والبيهقي في "الزهد": (۸۱۶))

خلاصہ الحدیث:

اللہ تعالیٰ خالق کائنات، قادر مطلق اور مختار کل ہیں، کائنات میں جس طرح چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں، وہ انسان اور جنات کو اپنی معرفت و اطاعت کے لئے پیدا کیا، اور کائنات کو ان کی خدمت میں لگا دیا، یہ اس کا فضل ہے، اب انسان کو اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کی صورت میں نوازنا اور عدم ادائیگی کی صورت میں سزا دینا، یہ اس کی قدرت اور اختیار میں ہے، لہذا وہ اگر کسی پر راضی ہو کر انعامات سے نوازتا ہے، تو یہ اس کا رحم و کرم اور احسان ہے، اور کسی پر ناراض ہو کر سزا دیتا ہے، تو یہ انصاف و عدل ہے، کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔

تاہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ وہ بندہ کو گناہ اور نافرمانی کے بغیر سزا نہیں دے گا، اور یہ بھی اعلان ہے بُرائی کا بدلہ اس کے مثل ہے، جو آیت "جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا"

سے ظاہر ہے، البتہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے راضی ہوتے ہیں، تو اس کا بدلہ خیر میں سات گنا اضافہ کر دیتے ہیں، اور جب کسی بندہ پر ناراض ہوتے ہیں، تو اس کے گناہ میں سات گنا اضافہ کر دیتے، تو یہ سات گنا کا اضافہ (دوسری صورت) نصوص کے خلاف ہے، اور متعارض ہے، اس لئے یہاں چند روایات کی روشنی میں اس کا حل پیش کیا گیا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے راضی ہو جائے، تو اس کو سات گنا خیر میں اضافہ کر دیتے ہیں، جس کو اس نے نہیں کیا اور ناراضگی کے بارے میں اس کے مانند فرمایا۔ جیسا کہ اس حدیث کو صاحب الفتح الربانی نے ذکر کیا ہے:

عن ابی سعید الخدری انه سمع رسول اللہ ﷺ يقول ان الله إذا رضى الله عن العبد اثنى عليه.

اشکال:

ضابطہ کے مطابق اجر و بدلہ اسی کو ملتا ہے، جس نے کام کیا ہو؛ حالانکہ حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ خیر کے کام میں اللہ تعالیٰ سات گنا اضافہ فرمائیں گے جس کو بندہ نے ابھی کیا نہیں ہے؟

فَتَأْمَلْنَا مَعْنَى هَذَا الْحَدِيثِ فَوَجَدْنَا مَا فِيهِ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ تَنَاءِ اللَّهِ عَلَى عَبْدِهِ إِذَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَبْعَةَ أَضْعَافٍ مِنَ الْخَيْرِ لَمْ يَعْمَلْهَا. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۶۲)

جواب:

کیوں کہ یہاں اس بات کا احتمال ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی سے اس کے اعمال صالحہ کی

بناء پر خوش ہوتے ہیں، تو اس کو سات گنا اجر عطاء کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ وہ بندہ آئندہ بھی نیک کام کریگا، اگرچہ یہ بات بھی ہے کہ وہ آئندہ زمانہ میں وہ کام کرنے والا ہے پھر بھی اس بندہ پر اللہ تعالیٰ سات گنا اجر عطاء نہ کرے، تو اللہ پر لازم نہیں ہے بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے اختیار میں سے یہ ہے، کیونکہ ابھی تک اس بندہ نے کام نہیں کیا ہے، لیکن اللہ اپنے فضل و کرم سے اس نیک کام پر جتنا چاہیں اجر عطاء کرے،

قَدْ يُحْتَمَلُ أَنْ يَكُونَ الْعَبْدُ إِذَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ بِأَعْمَالِهِ الصَّالِحَةِ يُثْنِي عَلَيْهِ سَبْعَةَ أَضْعَافٍ مِنَ الْخَيْرِ لَمْ يَعْمَلْهَا مِمَّا قَدْ عَلِمَ تَعَالَى أَنَّهُ سَيَعْمَلُهَا فِي الْمُسْتَأْنَفِ وَإِنْ كَانَ قَدْ يَعْمَلُ فِي الْمُسْتَأْنَفِ مِنَ الْخَيْرِ أَضْعَافَهَا. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۶۲)

اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے سے ناراض ہوتے ہیں، تو اس کو بھی سات گنا برائی کا بدلہ دیتے ہیں، جس برائی کو ابھی تک کیا نہیں، اس لئے کہ یہاں بھی احتمال ہے کہ وہ آئندہ اسی برائی کو کرے گا، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ اس برائی کے نہ کرنے تک اس کو کچھ بھی بدلہ نہ دے، تو اللہ تعالیٰ ایسا کر سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو یہ بھی حق ہے کہ اس کو اس برائی کا بدلہ پہلے سے عطا کر دے، جس کو وہ آئندہ کرنے والا تھا، جیسا کہ نیک کام کرنے کی صورت میں سات گنا اجر عطاء کر سکتے ہیں۔

وَأَمَّا مَنْ سَخِطَ عَلَيْهِ فَقَدْ يَجُوزُ أَيْضًا أَنْ يَكُونَ يُثْنِي عَلَيْهِ بِسَبْعَةِ أَضْعَافٍ مِنَ الشَّرِّ لَمْ يَعْمَلْهَا مِمَّا هُوَ عَامِلُهَا فِي الْمُسْتَأْنَفِ، وَلَعَلَّهُ أَنْ يَعْمَلَ فِي الْمُسْتَأْنَفِ مِنَ الشَّرِّ أَضْعَافَهَا، وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى أَنْ لَا يُثْنِي عَلَيْهِ بِذَلِكَ، لَفَعَلَ إِذْ كَانَ لَمْ يَعْمَلْهُ إِلَى ذَلِكَ الْوَقْتِ فَأَثْنَى عَلَيْهِ بِمَا شَاءَ مِمَّا سَيَعْمَلُهُ وَتَرَكَ أَنْ لَا يُثْنِي عَلَيْهِ بِمَا سِوَى ذَلِكَ، مِمَّا هُوَ كَمِثْلِ مَا أَثْنَى عَلَيْهِ بِهِ جَلَّ وَجَلَّ، وَاللَّهُ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۶۲)

اقوال المحدثين:

شارح مناوی نے فرمایا: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مستقبل میں خیر کے کاموں کی توفیق مقدر فرمادیتے ہیں اور اس کے صدور سے پہلے عمل خیر کی تعریف فرماتے ہیں:

”قال شارح المناوي يعني انه يقدر به التوفيق لفعل الخير في المستقبل ويثني عليه به قبل صدور منه بالفعل. (الفتح الرباني: ۱۹/۱۵۱)

(قلت) ويقال عكس ذلك في قوله وإذا سخط على العبد الخ۔ وفيه أن الثناء يستعمل في الخير والشر، يقال أثنى على فلان خيراً أو أثنى عليه فلان شراً. (الفتح الرباني: ۱۹/۱۵۱)

اشکال:

حدیث الباب کا مفہوم آیت ”فلا یجزی الا مثلها“ کے خلاف ہے، یعنی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی سے ناراض ہوتے ہیں، تو اس کی برائی کا بدلہ سات گنا کر سکتے ہیں، جب کہ آیت قرآنیہ کا تقاضہ یہ ہے کہ برائی کا بدلہ اسی کے مثل دیتے ہیں، اس اعتبار سے یہاں اشکال وارد ہوا ہے۔

جواب:

حقیقت یہی ہے کہ سیئات (گناہوں) کی تضعیف ممنوع ہے، اس سلسلہ میں آیت ”فلا یجزی الا مثلها“ صریح ہے کہ سیئات کی تضعیف نہیں ہو سکتی، لیکن یہاں حدیث الباب میں سیئات کی تضعیف اس اعتبار سے مراد نہیں ہے، کیونکہ یہ ممکن نہیں، لیکن اس میں زمانہ اور مکان کے اعتبار سے ہو سکتی ہے، کیوں کہ جرم جنایت کی شناخت ہر جگہ اور ہر شخص کے ساتھ یکساں نہیں ہوتی، بلکہ زمان اور مکان کے اعتبار سے اس میں اضافہ ہوتا ہے۔

لہذا یہاں حدیث الباب میں تضعیف سیئات سے یہیں شکل مراد ہے یعنی مکان اور زمان

اور اشخاص کے اعتبار سے جرم کی قباحت بڑھ جاتی ہے، نہ کہ حقیقتاً گناہ بڑھ جاتا ہے۔

ان مضاعفة السيئات ممنوعة قطعاً لان الله تعالى يقول ”ومن جاء بالسيئة فلا يجزى إلا مثلها“ وهو نص صريح في أن السيئات لا تضاعف ولكن السيئة في حرم مكة مثلاً. تعظيم، لان السيئة تعظم بحسب الزمان والمكان۔۔۔ فالسيئات لا تضاعف ولكن تعظيم، وتكون اكبر في زمان من زمان وفي محل من محل.

(العذب المنير في التعبير: ۶۰۹/۷)

صاحب السیر رقم طراز ہیں کہ رزق اور ثنا کی تقسیم جس طرح انسان کے باطنی اعمال اور اس کے منازل پر مبنی ہے اسی طرح گناہ کی تقسیم بھی ہوتی ہے،

”والحاصل أن الرزق تفاوت في القسمة فكذا الثناء له تفاوت في القسمة، فقسمة الرزق على التدبير وقسمة الثناء على منازل العبد من ربهم في الباطن.

(التفسير شرح الجامع الصغير: ۲۴۲/۱)



باب :- ۱۳۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ:
 ”لَوْ جُعِلَ الْقُرْآنُ فِي إِهَابٍ ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ لَمَا احْتَرَقَ“

﴿قرآن مجید کی حفاظت اور معجزہ کا بیان﴾

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”لَوْ جُعِلَ الْقُرْآنُ فِي إِهَابٍ ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ لَمَا احْتَرَقَ“. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۶۳)، ورواه أحمد: ۱۵۱/۴، والدارمي: ۳۳۰/۲، وأبو يعلى: (۱۷۳۵)

خلاصہ الحدیث:

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، یہ آسمانی کتابوں میں سب سے زیادہ شہرہ آفاق کتاب ہے، اور یہ لازوال کتاب ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے ذمہ لی ہے، ”إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ. (الحجر: ۹)“ اسی طرح اس باب کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی امتیازی شان کو نمایاں کیا ہے، جو دیگر کسی کتاب کو حاصل نہیں یعنی اگر قرآن کو کسی چمڑے میں رکھ کر آگ میں ڈالا جائے، تو وہ نہیں جلیگا۔

اشکال:

حدیث پاک کے ظاہر پر اشکال ہوتا ہے کہ اگر قرآن مجید کسی چمڑے میں رکھ کر آگ پر ڈالا جائے تو، آگ اسے کیوں نہیں جلائے گی؟ جبکہ آگ کی فطرت جلانا ہے، اس میں کوئی چیز

مانع نہیں بن سکتی ہے۔

دفع اشکال:

امام طحاوی نے اس اشکال کا دفاع کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ علماء کی اس کے حل کے سلسلہ میں دورائے ہیں:

(۱) چمڑے سے مراد آدمی اور آگ سے مراد جہنم کی آگ ہے، مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اپنے اندر قرآن مجید کو محفوظ کر لے یعنی حافظ قرآن ہو جائے (تو جہنم کی آگ اس کو) قرآن کی برکت سے) نہیں جلا سکتی، گرچہ اس کو اس میں ڈالا بھی جائے۔

السَّلَامُ أُمَّتُهُ بِقَوْلِهِ هَذَا أَنْ مَنْ كَانَ مَعَهُ الْقُرْآنُ مَنَعَهُ أَنْ تَعْمَلَ فِيهِ النَّارُ وَلَوْ أَلْقِيَ فِيهَا.

(شرح مشکل الآثار: ۳۶۳/۲)

(۲) چمڑے سے مراد جس پر قرآن مجید لکھا گیا ہو، جب اس چمڑے کو آگ میں ڈالا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے قرآن مجید کو اس آگ سے پاک اور منزہ فرمائیں گے، اور وہ چمڑا اس حال میں جلے گا کہ قرآن اس سے خالی ہوگا۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ پاک نے نار نمود سے حفاظت کی، اور آگ کو گل گزار بنا دیا:

وَكَانَ مُرَادُهُ بِالْإِهَابِ الْإِنْسَانَ الَّذِي يَكُونُ مَعَهُ الْقُرْآنُ، وَأَنَّهُ تَعَالَى يَقِيهِ بِهِ مِنَ النَّارِ كَمِثْلِ مَا وَقَى إِبْرَاهِيمَ خَلِيلَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِمَكَانِهِ مِنْهُ مِنْ عَمَلِ النَّارِ فِيهِ، وَمِنْ قَوْلِهِ لَهَا: ﴿كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ﴾ (الأنبياء: 69)۔ (شرح مشکل الآثار: ۳۶۳/۲)

اور ایک مفہوم یہ ہے کہ حدیث میں جس کھال کا ذکر ہے، اس کو قرآن سے اللہ تعالیٰ علاحدہ کریں گے، اور آگ صرف کھال کو جلانے گی، نہ کہ قرآن کو۔

وَالْقَوْلُ الْآخِرُ مِنْهُمَا أَنَّ الْإِهَابَ الْمَذْكُورَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ هُوَ الْإِهَابُ الَّذِي يُكْتَبُ فِيهِ الْقُرْآنُ، فَيَكُونُ اللَّهُ تَعَالَى، لِتَنْزِيهِهِ الْقُرْآنَ عَنِ النَّارِ يَمْنَعُهَا مِنْهُ فَيَنْزِعُهَا مِنَ الْإِهَابِ حَتَّى يَكُونَ ذَلِكَ الْإِهَابُ خَالِيًا مِنَ الْقُرْآنِ، ثُمَّ تُحْرِقُ النَّارُ الْإِهَابَ وَلَا قُرْآنَ فِيهِ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۶۳)

اقوال المحدثین:

جواب (۱) اس روایت کے ایک راوی ”ابو عبدالرحمن“ ہیں انہوں نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ جس نے قرآن کو جمع کیا، پھر جہنم کی آگ میں داخل ہوا، تو وہ خنزیر سے بدتر ہے، بایں معنی کے وہ خود تو اس میں جلے گا؛ لیکن قرآن اس کو کچھ فائدہ نہیں دیگا۔

قال ابو عبدالرحمن فسرہ ان مع جمع القرآن ثم دخل النار فهو شر من خنزیر۔

(مسند أبي يعلى الموصولي: ۱۴۳۲-۳۰۸/۲)

جواب: (۲) بعض علماء نے اس کا حل یہ بتایا کہ یہ قرآن مجید کا معجزہ تھا، نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں جیسا کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں خدائی آیات کا رہا ہے۔

قيل كان ذلك معجزة للقرآن من زمن النبي ﷺ كما تكون الآيات في عصر الانبياء. (الطبيي: ۱۶۶۲/۵)

جواب: (۳) علامہ طیبی نے اس کو علی سبیل الفرض مان کر حل پیش کیا ہے، یعنی یہاں حقیقت قرآن مجید کو چمڑے میں رکھ کر کے آگ میں ڈالنا اور آگ کا اس کو نہ جلانا مراد نہیں ہے؛ بل کہ

یہاں قرآن مجید کی عظمت شان کو واضح کرنا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی شان سے متعلق آیات کریمہ میں تمثیل ہے، ”قل لو كان البحر مداداً— الآیة“۔ (سورہ کہف)

وقال الطيبي: لعل الجنس أقرب وأحوى وضرب المثل بالإهاب للتحقير أحوى، لأن التمثيل وارد للمبالغة والفرض والتقدير كما في قوله تعالى ”قل لو كان البحر مداداً— الآیة“۔ (مرقاة المفاتيح: ۳۶۰/۳، طیبی: ۱۶۶۲/۵)



باب :- ۱۳۴

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رَوَاهُ أَبُو هُرَيْرَةَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ قَالَ: "وَلَدُ الزَّانِيَةِ الثَّلَاثَةُ"

﴿قَوْلِ رَسُولِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "وَلَدُ الزَّانِيَةِ الثَّلَاثَةُ" كَمَفْهُومِ كَابِيَانِ﴾

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "وَلَدُ الزَّانِيَةِ ثَلَاثَةٌ".

(شرح مشکل الآثار: ۲/۳۶۵، ورواه أبو داود: (۳۹۶۲)، والحاكم: ۲/۲۱۵، والبيهقي: ۱۰/۵۷۱))

خلاصہ الحدیث:

حقوق کی دو قسمیں ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد، زنا، شراب نوشی، اور سرقہ یہ وہ جرائم ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، جب یہ جرائم عند القضاء ثابت ہو جائے، تو پھر معافی، صلح یا مدعی کی طرف سے مجرم کو بری کر دینے کا کوئی اعتبار نہیں، الغرض زنا بہت ہی سنگین جرم ہے، جس کی سزا حد ہے، زانی اور مزنیہ دونوں محصن ہیں، تو دونوں پر رجم ہوگا، ورنہ دونوں پر جلد یعنی (سو) (۱۰۰) کوڑے لگائے جائیں گے) جس طرح دونوں کا یہ عمل ایک بڑا جرم ہے، اسی طرح دونوں کے ناجائز تعلق سے پیدا ہونے والا بچہ بھی ولد الزنا اور خبیث ہوگا، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث الباب میں یہ فرمایا ہے کہ "وَلَدُ الزَّانِيَةِ ثَلَاثَةٌ" سے یعنی وہ تینوں میں سب سے بدترین ہے، تینوں سے مراد زانی، زانیہ، اور تیسرا خود ولد الزنا ہے، لیکن ولد الزنا کا تو زنا میں کوئی دخل نہیں، اس لئے یہ کہا جائے گا کہ آپ کا یہ ارشاد کہ وہ سب سے بدتر ہے یعنی باعتبار اصل اور نسب کے یہ غیر ثابت النسب ہے، اور وہ دونوں اگرچہ عاصی اور نافرمان ہیں؛

لیکن ثابت النسب ہیں۔

اشکال:

سوال یہ ہے کہ حدیث الباب اور دوسری احادیث اس بات پر دال ہیں کہ تمام اولاد زنا بدتر اور خبیث ہیں، جبکہ ولد الزنا اس سے معصوم ہے، اس عمل میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، تو پھر اولاد زنا کو زانی اور زانیہ کی طرح ”شُرُّ الثَّلَاثَةِ“ تیسرا کیوں قرار دیا ہے؟

فَسَأَلَ سَائِلٌ، فَقَالَ: كَيْفَ يَكُونُ أَوْلَادُ الزَّانِي الَّذِينَ لَا أَفْعَالَ لَهُمْ فِي الزَّانِينَ مِمَّنْ هُمْ مِنْهُ مِمَّنْ كَانَ مِنْهُ الزَّانِي وَأَعْظَمَ ذَلِكَ؟ (شرح مشكل الآثار: ۳۶۶/۲)

جواب:

اس کا ایک جواب اور توجیہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ فرمان کسی مخصوص ولد الزنا کے بارے میں ہے، نہ کہ مطلقاً، چنانچہ امام طحاوی نے اس طرح اس کی صراحت کی ہے:

فَكَانَ جَوَابًا لَهُ أَنْ أَبَاهُ زَيْرَةَ نُقِلَ عَنْهُ هَذَا الْحَدِيثُ لِمَا ذَكَرْنَا، وَقَدْ رَوَى عَنْ عَائِشَةَ إِنَّكَارَ هَذَا ذَلِكَ عَلَيْهِ، وَإِحْبَارُهَا أَنَّ النَّبِيَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِنَّمَا كَانَ قَصْدًا بِذَلِكَ الْقَوْلِ إِلَى إِنْسَانٍ بَعَيْنِهِ لِمَعْنَى كَانَ فِيهِ يُبَيِّنُ بِهِ عَنْ سَائِرِ أَوْلَادِ الزَّانَاةِ (شرح مشكل الآثار: ۳۶۶/۲)

ثُمَّ رَجَعْنَا إِلَى حَدِيثِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ عَائِشَةَ لَمْ يَكُنِ الْحَدِيثُ عَلَى هَذَا إِنَّمَا كَانَ رَجُلٌ يُؤْذِي رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”أَمَا إِنَّهُ مَعَ مَا بِهِ وَلَدَ زَنَى“ وَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”هُوَ شُرُّ الثَّلَاثَةِ“.

(شرح مشكل الآثار: ۳۶۷/۲)

اور یہ بات مستدرک حاکم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کو یہ بات پہنچی کہ ابو

ہریرہؒ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں، ”وَلَدَ الزَّيْنَى شَرُّ الثَّلَاثَةِ“ تو اس پر انہوں نے فرمایا کہ ایک شخص جو کہ منافقین میں سے تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچایا کرتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے اس کی شکایت فرمائی، تو اس پر کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ! صرف یہی نہیں کہ بلکہ ولد الزنا بھی ہے، تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”هُوَ شَرُّ الثَّلَاثَةِ“ پھر اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے اپنی تائید میں یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى﴾ یعنی ولد الزنا پر جو ”هُوَ شَرُّ الثَّلَاثَةِ“ ہونے کا حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا ہے، وہ ولد الزنا ہونے کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ اس کے نفاق اور ایذا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔ (بحوالہ الدر المنصوب: ۱۳۵/۶)

نیز امام طحاویؒ نے اس باب کے آخر میں بھی یہ واضح کیا ہے کہ والد الزنا سے ایک خاص شخص مراد ہے، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت و تکلیف پہنچائی، اس بنا پر وہ کافر ہو گیا اور اپنی ماں زانیہ اور زانی والد کی وجہ سے اس پر شر کے لفظ کو منطبق کیا ہے اور اسے ”وَلَدَ الزَّيْنَى شَرُّ الثَّلَاثَةِ“ سے تعبیر کیا۔

وَبَانَ لَنَا بِحَدِيثِ عَائِشَةَ أَنَّ قَوْلَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِي ذَكَرَهُ عَنْهُ أَبُو هُرَيْرَةَ: ”وَلَدَ الزَّيْنَى شَرُّ الثَّلَاثَةِ“ إِنَّمَا كَانَ لِإِنْسَانٍ بَعِيْنِهِ كَانَ مِنْهُ مِنَ الْأَذَى لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا كَانَ مِنْهُ مِمَّا صَارَ بِهِ كَافِرًا شَرًّا مِنْ أُمَّهِ، وَمِنْ الزَّانِي بِهَا الَّذِي كَانَ حَمَلَهَا بِهِ مِنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳۶۹/۲)

اقوال المحدثین:

(۱) سنن البيهقي میں زید بن معاویہ بن صالحؒ کے طریق سے مرسل مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ”وَلَدَ الزَّيْنَى شَرُّ الثَّلَاثَةِ“ اس وقت ارشاد فرمایا، جب کہ اس لڑکے کے والدین مسلمان ہوں، اور وہ اسلام نہ لایا ہو؛ لہذا اس صورت میں ”ولد الزنا“ کا اپنے والدین سے بدتر ہونا ثابت ہوگا۔

وفي سنن البيهقي من طريق زيد بن معاوية بن صالح قال: حدثني السفر بن بشير الأسدی ان رسول الله ﷺ إنما قال: "وَلَدُ الزَّيْنَى شَرُّ الثَّلَاثَةِ" أن ابويه أسلما ولم سلم هو فقال رسول الله ﷺ هو شر الثلاثة قال البيهقي وهو مرسل". (عون المعبود: ۱۰۹/۷)

(۲) مسند احمد میں ابراہیم بن عبید بن زماعہ کے طریق سے حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا آپ ﷺ نے "وَلَدُ الزَّيْنَى شَرُّ الثَّلَاثَةِ" اس وقت ارشاد فرمایا جبکہ وہ اپنے والدین کی طرح عمل کرے۔

وفي مسند احمد من طريق ابراهيم بن عبيد بن زماعة عن عائشة قالت: قال رسول الله ﷺ "وَلَدُ الزَّيْنَى شَرُّ الثَّلَاثَةِ" وفي معجم الطبراني من حديث ابن عباس مرفوعاً مثله. (عون المعبود: ۱۰۹/۷)

(۳) صاحب بذل المجہود اور صاحب عون المعبود لکھتے ہیں کہ "وَلَدُ الزَّيْنَى شَرُّ الثَّلَاثَةِ" اصل عنصر نسب اور پیدائش کے اعتبار سے ہے، کیونکہ ولد الزنا زانی اور زانیہ کے پانی (نطفہ) سے پیدا ہوا، جو خبیث پانی ہے، برخلاف اس کے والدین کے، وہ خبیث پانی سے پیدا نہیں ہوئے۔

قال بعض اهل العلم: إنه شر الثلاثة: اصلاً وعنصراً ونسباً ومولوداً: وذلك أنه خلق من ماء الذانی والزانیة وهو ماء خبیث بخلاف والديه.

(عون المعبود: ۱۰۷/۷، بذل المجہود: ۶۹۷/۱۱)

(۴) نیز علامہ گنگوہیؒ کے حوالے سے صاحب بذل المجہود نے یہ بھی نقل کیا کہ ولد الزنا سے مراد وہ شخص ہے، جو کثرت سے زنا کرتا ہے، گویا کہ وہ کثرت سے زنا کرنے کی وجہ سے زنا کا لڑکا ہو گیا اور زنا، اس کی ماں اور باپ ہو گیا۔

و کتب مولانا یحییٰ مرحوم من تقریر شیخا و ان کان المواد بولد الزنیة الذی بکثر
من الزنا فصار کانه ولد الزنا و الزنا أبوه و أمه ففیه إشارة إلى شدة ملا بسته انه بالزنا.

(بذل المجهود: ۱۱/۲۹۷)

(۵) ابن ارسلان فرماتے ہیں: بعض محدثین اس بات کی طرف گئے ہیں کہ حدیث ایک ایسے
متعین شخص کے بارے میں وارد ہوئی ہے جو شر کے صفت کے ساتھ موسوم ہے۔

قال ابن ارسلان: ذهب بعضهم إلى أنه هذا إنما جاء في رجل بعينه كان موسوماً

بالشر. (بذل المجهود: ۱۱/۲۹۷)



باب :- ۱۳۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ قَالَ: "لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَلَدُ زَنِيَّةٍ"

﴿ولدا الزنا کے جنت میں داخل نہ ہونے کا بیان﴾

عَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ: نَزَلَتْ عَلَى عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ سَعْدٍ، فَاحْتَبَسَ ذَاتَ لَيْلَةٍ، ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ: أَعْشَيْتُمْ ضَيْفَكُمْ؟ قَالُوا: انْتَظِرْنَا، قَالَ: شَغَلَنِي أَبُو هُرَيْرَةَ نَكَلْتُ مَتَّبِعُهَا أُمَّهُ إِنَّ كَانَ مَا يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ حَقًّا، قُلْتُ: وَمَا حَدَّثَكَ؟ قَالَ: حَدَّثَنِي عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: "لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَلَدُ زَنِيَّةٍ". (شرح مشكل الآثار: ۲/۳۷۰)، ورواه البخاري في "التاريخ": ۱۳۲/۵، والنسائي في "الكبرى": ۱۰/۱۲۰))

خلاصہ الحدیث:

یقیناً ایمان کا بدلہ جنت ہے، اور کفر کا بدلہ جہنم، لیکن کفر کے اوصاف و اعمال دخول اولیت فی الجنۃ سے مانع تو ہو سکتے ہیں، مگر خلود فی النار کے سبب نہیں ہو سکتے، لہذا اہل ایمان کا اصل ٹھکانہ جنت ہے، اگرچہ بعض اعمال سیئہ کی وجہ سے کچھ وقت کے لئے جہنم میں جانا پڑے۔

بہر حال یہاں پر یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ کلام عرب میں جس طرح ابوت و بنوت کے اعتبار سے کنیت کا استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح دیگر ملازمات و تعلقات کے اعتبار سے بھی کنیت کا نام استعمال ہوتا ہے، اب ان باتوں کو سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن وحدیث میں جہاں کہیں بھی اہل ایمان کے متعلق دخول جنت کی ممانعت یا خلود نار کی وعیدیں

آئیں ہیں، وہاں دخول جنت کی ممانعت سے دخول اولیٰ کی ممانعت ہے، اور دخول نار کی وعید میں دخول علیٰ سبیل التائبید والخلوٰ دمراد نہیں ہے؛ بل کہ کچھ مدت کے لئے بُرے اعمال کی سزا کے طور پر دخول مراد ہے، پھر اس کے بعد وہ جنت میں داخل ہوگا، کیونکہ متعدد آیات واحادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جن کے دلوں میں ذرہ برابر ایمان ہوگا وہ ایک دن جنت میں ضرور داخل ہوگا، ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے حدیث مذکور میں غور کیا جائے، تو مطلب سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

رہی بات ”ولد زینہ“ کی تو اس کی وضاحت کے لئے امام طحاویؒ نے تفصیل سے کلام کیا ہے، جس کا مدار اسی قاعدے پر ہے کہ کنیت جس طرح ابوت ونبوت اور ملابسات کی بناء پر ہوتی ہے، اسی طرح لفظ ”ولد“ کو بھی ملابسات وتعلقات کی وجہ سے کنیت کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے، چنانچہ حدیث مذکور بھی اسی قبیل سے ہے۔ اور اس حدیث پاک میں یہ کہا گیا کہ ”ولد الزنا“ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

اعتراض:

بلاشبہ زنا ایک سنگین جرم ہے اور اس کی سزا بھی سخت ہے، مگر یہاں پر اعتراض یہ ہے کہ سزا تو اسی کو ملنی چاہئے، جو مجرم ہو، اور یہاں پر زانی اور مزنیہ مجرم ہیں اور زنا سے پیدا شدہ بچہ معصوم ہے، اس کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، تو پھر اس کو دخول جنت سے محرومی کی وعید کیوں سنائی گئی؟

جواب:

امام طحاویؒ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حدیث ”ولد زینہ“ سے زنا کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ مراد نہیں ہے، بلکہ وہ آدمی مراد ہے، جو خود زنا کے عادی ہو، لہذا

اب کوئی اعتراض نہیں۔

اور کلام عرب میں ایسا کثرت سے استعمال ہوتا ہے کہ جو شخص کسی چیز میں بہت زیادہ مشغول ہو، تو اس کو اسی چیز کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

مثلاً ایک آدمی تمام امور کو چھوڑ کر صرف طلب دنیا میں مشغول ہو گیا، تو اس کو ابن الدنیا اور بنی الدنیا کہا جاتا ہے اور جو زیادہ چالاک و ہوشیار ہو اس کو ابن اُحذار کہا جاتا ہے، اور جو زیادہ کلام کرنے کے عادی ہو، اس کو ابن الأتوال کہا جاتا ہے، اسی طرح طویل مسافت کو قطع کرنے والے پر ابن السبیل و ابناء السبیل کا اطلاق ہوتا ہے؛ نیز کلام اللہ میں بھی آیت زکاۃ کے اندر مسافر کو ابن السبیل سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی طرح بدر ابن جزار نے نابغہ سے ایک شعر کہا تھا جس میں انہوں نے ہوشیار اور چالاک آدمی کے لئے ابن اُحذار کا اطلاق کیا اس کا شعر ہے۔

أَبْلَغُ زِيَادًا وَخَيْرُ الْقَوْلِ أَصْدَقُهُ... فَلَوْ كَيْسَ أَوْ كَانَ ابْنُ أَحْذَارِ

تو یہاں پر ابن اُحذار ہوشیار آدمی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح شہر میں بہت دن سے رہنے والے کو ابن المدینہ کہا جاتا ہے، جیسا کہ اخطل کے شعر میں مذکور ہے ”رَبَّتْ وَرَبَّافِي حَجْرِهَا ابْنُ مَدِينَةٍ... يَظَلُّ عَلَى مَسْخَاتِهَا يَتَوَكَّلُ“ اس شعر میں ”ابن مدینہ“ سے مراد وہاں پر رہنے والے ہیں۔

فَكَانَ مَا فِي هَذَا الْحَدِيثِ عِنْدَنَا، وَاللَّهُ أَعْلَمُ أَرِيدَ بِهِ مَنْ تَحَقَّقَ بِالزَّنَى حَتَّى صَارَ غَالِبًا عَلَيْهِ، فَاسْتَحَقَّ بِذَلِكَ أَنْ يَكُونَ مَنُشُوبًا إِلَيْهِ، فَيُقَالُ: هُوَ ابْنُ لَهُ كَمَا يُنْسَبُ الْمُتَحَقِّقُونَ بِالذُّنُوبِ إِلَيْهَا، فَيُقَالُ لَهُمْ بَنُو الدُّنْيَا، لِعِلْمِهِمْ لَهَا وَتَحَقُّقِهِمْ بِهَا وَتَرَكِهِمْ مَا سِوَاهَا. (شرح مشکل

الآثار: ۲/۲۷۷۳)

تو اسی طرح حدیث مذکور میں ”ولد الزنا“ اس شخص کو کہا گیا ہے جو زنا کے عادی ہو اور زنا

اس پر غالب ہو، لہذا وہ اس بُری حرکت کی وجہ سے دخول جنت سے محروم ہوگا، بشرطیکہ موت سے پہلے اس نے توبہ نہ کی ہو، لہذا زنا سے پیدا شدہ بچہ یہاں پر مراد نہیں، اگرچہ حدیث میں اس کو ”ولد الزنیۃ“ سے تعبیر کیا گیا ہے، مگر دوسری حدیث میں ابن الزنا سے بھی تعبیر کیا گیا ہے،

فَمَثَلُ ذَلِكَ ابْنُ زَنْيَةٍ، قِيلَ لِمَنْ قَدْ تَحَقَّقَ بِالزَّانِي حَتَّى صَارَ بِتَحَقُّقِهِ بِهِ مَنْشُوبًا إِلَيْهِ، وَصَارَ الزَّانِي غَالِبًا عَلَيْهِ: أَنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ بِهَذِهِ الْمَكَانِ الَّتِي فِيهِ وَلَمْ يُرِدْ بِهِ مَنْ كَانَ لَيْسَ مِنْ ذَوِي الزَّانِي الَّذِي هُوَ مَوْلُودٌ مِنَ الزَّانِي وَهَذَا أَشْبَهَ بِمَعْنَى هَذَا الْحَدِيثِ لِلْمَعَانِي الَّتِي ذَكَرْنَاهَا فِي مِثْلِهِ فِي الْبَابِ الَّذِي قَبْلَ هَذَا الْبَابِ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۷۳)

اقوال المحدثين:

(۱) اس حدیث کے بارے میں ابن حبان نے اپنی صحیح میں امام ابو حاتم کے حوالے سے ایک جواب نقل کیا ہے، جس میں انہوں نے ”ولد الزنیۃ“ کو حقیقی ”ولد الزنا“ ہی مراد لیا ہے، اور فرمایا کہ: ولد الزنا اپنے والدین کے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں نہیں جائے گا، بلکہ ”ولد الزنا“ علی الاغلب گناہ کے ارتکاب پر جسارت کرتا ہے، تو آپ ﷺ نے اس حدیث سے یہ بیان کرنا چاہا کہ ولد الزنا جنت میں داخل نہیں ہوگا، جس میں ایسے غیر زنیہ داخل ہوتے ہیں جو گناہوں کے ارتکاب پر اپنے جسارت و ہمت کو آگے نہیں بڑھاتے ہیں، یا جو زیادہ گناہ کرنے پر جسارت نہیں کرتے، لہذا آپ ﷺ نے اس حدیث کو علی سبیل الاغلب فرمایا۔

قال أبو حاتم معنى نفى المصطفى ﷺ عن ولد زينة دخول الجنة وولد الزينة ليس عليه من أوزار آبائهم وأمهاتهم شيع؟ إن ولد الزينة على الأغلب يكون أجر على ارتكاب المزجورات فازاد ﷺ أن ولد الزينة لا يدخل الجنة جنة يدخلها غير ذى الزنية ممن لم يكتر جسارته على ارتكاب المزجورات. (صحیح ابن حبان: ۵/۱۶۲، ۶/۳۳۷)

(۲) شارح سنن النسائی، صاحب ”زخیرة العقبی“ نے ”ولد الزینة“ سے وہی معنی مراد لئے ہیں، جو امام طحاوی نے لیا ہے، چنانچہ اس کی عبارت یہ ہے:

قوله: لا یدخل الجنة أي لا یتحلل لهم الذنوب التي ارتكبوها ان استحلوها فهو علی ظاهره، أو المراد لا یدخلون الجنة دخولا أولیاً بل بعد تقدم العذاب لهم إن لم یتحلوها“۔ (زخیره العقبی: ۲۱۷/۷)

(۳) قال القاري نقلا عن الطيبي وفيه تغليظ وتشديده على ولد الزنية تعريضا بالزنا لثلا يورطه في السفاح، فيكون سببا للشقاوة نسمة برئية“۔ (مرقاة المفاتيح: ۲۱۸/۷)

(۴) قال شيخ الاسلام ابن التيمية رحمته الله: ولد الزنا أن آمن وعمل صالحا دخل الجنة والا جوزى بعمله كما يجاز غيره والجزاء على الأعمال لا على النسب، إنما يذم ولد الزنا لأنه مظنة ان يعمل عملا خبيثا كما يقع كثيرا كما تحمل الأنساب الفاضلة لأنه مظنة عمل الخير، فاما إذا ظهر العمل فالجزاء عليه واكبر الخلق عند الله اتقاهم“۔

(الفتاوى الكبرى: ۸۳/۵)



باب :- ۱۳۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ ظُهُورِ أَوْلَادِ الْحِثِّ فِي آخِرِ الزَّمَانِ

﴿علامات قیامت کا بیان﴾

عَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا تَزَالُ هَذِهِ الْأُمَّةُ عَلَى شَرِيْعَةٍ مَا لَمْ يَظْهَرْ فِيهِمْ ثَلَاثٌ: مَا لَمْ يُقْبَضْ مِنْهُمْ الْعِلْمُ، وَيَكْثُرَ فِيهِمْ وَلَدُ الْحِثِّ، وَيَظْهَرْ فِيهِمْ السَّقَاوُونَ" قَالُوا: وَمَا السَّقَاوُونَ؟ قَالَ: "نَشْءٌ يَكُونُونَ آخِرَ الزَّمَانِ، تَحِيَّتُهُمْ بَيْنَهُمْ إِذَا تَلَقَّوْا التَّلَاغُثُ". (شرح مشکل الآثار: ۳۷۶/۲)، ورواه أحمد: ۳۳۹/۳، والطبرانی في "الكبير" ۳۳۹/۲۰

خلاصہ الحدیث:

یہ دنیا دار فانی ہے، یہاں کی ہر چیز عارضی ہے، نیز یہاں جو آیا ہے، اسے یہاں سے جانا ہے، اسی لئے دنیا کی تمام چیزیں فنا ہونے والی ہیں، یہاں کسی کو بقا اور ثبات حاصل نہیں، ہاں آخرت کو صرف بقا اور قرار حاصل ہے، اور آخرت کے قیام سے پہلے قیامت کا وقوع ایک مسلمہ حقیقت ہے، جس کا انکار کسی مومن کے لئے درست نہیں، لیکن قیامت کب آئے گی؟ گھڑی اور ساعت متعین ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں ہے، البتہ اس کی علامات و نشانیاں متعین ہیں، جو قیامت سے پہلے پیش آئیں گی، جن کا ذکر قرآن مجید کی سورہ حج، سورہ زلزال وغیرہ میں ہے، اسی طرح احادیث نبوی میں بھی قیامت کے وقت پیش آنے والے حالات و واقعات کی پیشین گوئی کی گئی ہیں۔

چنانچہ اس باب کی پہلی حدیث میں قیامت کی علامات کے بارے میں پیشین گوئی کی گئی ہیں کہ امت محمدیہ اسلامی طریقہ پر اس وقت تک قائم رہے گی، جب تک اس میں تین چیزیں ظاہر نہیں ہوگی،: (۱) علماء اٹھالینے کی وجہ سے علم اٹھالیا جائے گا۔ (۲) ان میں گناہ یعنی زنا کی اولاد کی کثرت ہو جائے گی، (۳) ان میں سقارون کی کثرت ہو جائے گی، جب صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ سقارون کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ ایسے لوگوں کا وجود ہوگا کہ وہ آپس میں ملیں گے، تو ایک دوسرے پر طعن کریں گے۔

اشکال:

حدیث الباب میں لفظ ”السَّقَاوُونَ“ کا معنی یہ ذکر کیا گیا کہ قیامت کے وقوع سے پہلے لوگ ایک دوسرے پر لعن و طعن کریں گے، جبکہ امام طحاویؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ بعض اہل علم نے ”السقر“ کا معنی چیل کے منہ کی بدبو مراد لیا ہے، جو گوشت وغیرہ کھانے کی وجہ سے اس کا منہ یعنی چونچ بدبو دار ہو جاتی ہے، اور آپ ﷺ نے ان لوگوں کو ان کے منہ کی برائی کی وجہ سے سقر کی طرف منسوب کیا ہے۔ (شرح مشکل الآثار: ۲۶۲، ۳)

نیز پہلی حدیث میں ”ولد الحنث“ مذکور ہے، اس سے بظاہر یہ معنی نکلتا ہے کہ گناہ اور زنا کا وبال ”ولد الحنث“ پر عائد کیا گیا ہے، جبکہ یہ اصول اور آیت قرآنیہ ”﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى﴾“ کے خلاف ہے کہ گناہ کا وبال اسی پر ہونا چاہئے جس نے ارتکاب کیا ہے نہ کہ دوسرے پر۔

جواب:

امام طحاویؒ اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح اس سے پہلے باب کی حدیث میں ”وَلَدُ الزَّانِي سِتْرُ الثَّلَاثَةِ“ شر اور زنا کی نسبت زانی اور زانیہ کی اولاد کی طرف تغلیباً ہے، اسی

طرح ”ولد الحنث“ کی کثرت کو علامات قیامت میں شمار کیا ہے۔

”حنث“ کا معنی گناہ کے ہیں، لیکن جب کوئی شخص کسی چیز کو دلچسپی کے ساتھ کرتا ہے کہ وہ چیز اس پر غالب ہو جاتی ہے، تو اس کو اسی کی اولاد ہونے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، چنانچہ ایسے ہی حدیث الباب میں ”حنث“ کی طرف منسوب کر کے ”ولد الحنث“ کہہ دیا گیا ہے، جیسے مال سے دلچسپی رکھنے والوں کو ابن الدنیا، زیادہ سفر کرنے والے کو ”ابن السبیل“ کہا جاتا ہے۔

وَفِيهِ ذِكْرُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِيَّاهُمْ وَلَدَ الْحِنْثِ فَمُرَادُهُ فِيهِ عِنْدَنَا وَاللَّهُ أَعْلَمُ
نَسَبُهُ إِيَّاهُمْ إِلَى الْحِنْثِ، وَأَنَّهُمْ أَوْلَادُهُ لِلْمَعْنَى الَّذِي ذَكَرْنَا فِي الْبَابِ الَّذِي قَبْلَ هَذَا مِنْ
جَوَازِ الْقَوْلِ لِلْمُتَحَقِّقِ بِالشَّيْءِ الَّذِي يَغْلِبُ عَلَيْهِ أَنَّهُ وَلَدٌ لِذَلِكَ الشَّيْءِ، كَمَا يَجُوزُ أَنْ يُقَالَ: هُوَ
ابْنٌ لَهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳۷۶/۲)

اقوال المحدثين:

صاحب فتح الرباني لکھتے ہیں کہ گناہ کی نسبت ”ولد الحنث“ کی طرف اس کے والدین کے فساد کی وجہ سے کی گئی ہے، اور تغلیبا باعتبار ما یقول کے اس کو بھی اس گناہ میں شامل کر دیا گیا ہے، لیکن یہ اس کی بعض اولاد کے صالح ہونے کے منافی نہیں۔

خرج مخرج الغالب لفساد أصله، كما تقدم وهذا لا ينافي أن القليل من الولاد الزنا
يكون صالحا. (الفتح الرباني: ۱۰۳/۱۶-۱۰۲)



باب :- ۱۳۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلا مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ فِي عِتَاقِ وَلَدِ الزَّرْنِيِّ:
”إِنَّهُ لَا خَيْرَ فِيهِ“

﴿ولدا الزنا کی آزادی کی فضیلت کا بیان﴾

عَنْ مَيْمُونَةَ ابْنَةِ سَعْدٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ عِتَاقِ وَلَدِ الزَّرْنِيِّ،
فَقَالَ: ”لَا خَيْرَ فِيهِ نَعْلَانِ يُعَانُ بِهِمَا أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ عِتَاقِ وَلَدِ الزَّرْنِيِّ“ . (شرح مشکل الآثار:
۳۷۷/۲، ورواه ابن ماجه: (۲۵۳۱)، وأحمد: (۲۶۳۷۶)

خلاصہ الحدیث:

شریعت میں آزادی ایک ایسی قوت حکمیہ ہے، جس کے ذریعہ انسان کو اپنے اوپر اور دوسروں کے مال میں تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، اور سرپرست بننے اور شہادت (گواہی) دینے کا اہل بن جاتا ہے، حتیٰ کہ دوسروں پر تصرف کرنے اور دوسروں کو اپنے مال میں تصرف سے روکنے کا حق حاصل ہوتا ہے، اور وہ آزاد خود مختار انسانوں کی صف میں کھڑا ہوتا ہے، اس لئے عام طور پر رسول اللہ ﷺ غلام اور باندی کو نہ صرف آزاد کرنے کا حکم دیا ہے؛ بل کہ اسے باعث ثواب بھی قرار دیا ہے، اسی وجہ سے بعض کفار کی ادائیگی اس کی آزادی پر موقوف کیا ہے، الغرض غلاموں اور باندی کو آزاد کرنا یہ نہ صرف مستحسن عمل ہے، بلکہ جہنم کی آگ سے خلاصی کا زینہ بھی ہے، جیسا کہ اس سے پہلے شرح مشکل الآثار دوسری جلد باب ۱۰۷ کی پہلی حدیث میں اس کا ذکر آچکا ہے۔

حَدَّثَنِي فَاطِمَةُ ابْنَةُ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ قَالَتْ: قَالَ أَبِي عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ أَعْتَقَ رَقَبَةً مُسْلِمَةً، أَوْ مُؤْمِنَةً وَفَى اللَّهُ تَعَالَى بِكُلِّ عَضْوٍ مِنْهَا عَضْوًا مِنْهُ مِنَ النَّارِ". (شرح مشکل الآثار: ۱۹۲/۲)

حضرت فاطمہ فرماتی ہیں کہ میرے والد حضرت علیؑ نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص مسلمان غلام یا مومنہ باندی کو آزاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں جہنم سے خلاصی عطا کرتے ہیں۔

تعارض:

اس باب کی پہلی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ولد الزنا کی آزادی کے سلسلہ میں یہ فرمان ”لا خیر فیہ“ (اس میں کوئی خیر و بھلائی نہیں) یا یہ فرمان ”انہ شر الثلاثة“ (یہ تین میں بدتر ہے) تو یہ دونوں حدیث فاطمہ بنت علیؑ کی حدیث کے خلاف ہے۔

جمع و تطبیق:-

گرچہ دونوں حدیث میں تعارض ہے؛ لیکن حقیقت میں کوئی تعارض نہیں، کیوں کہ قول رسول ﷺ ”لا خیر فیہ“ علی الاطلاق نہیں ہے؛ بلکہ اس کا تعلق ایک خاص غلام سے ہے، جس نے رسول اللہ ﷺ کو اذیت و تکلیف پہنچائی، نیز وہ ولد الزنا بھی تھا۔

إِنَّمَا كَانَ رَجُلٌ يُؤْذِي رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَمَّا إِنَّهُ مَعَ مَا بِهِ وَلَدَ زَنَى" وَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "هُوَ شَرُّ الثَّلَاثَةِ". (شرح مشکل الآثار: ۳۶۷/۲)

اقوال المحدثین:

چنانچہ محدث کبیر مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اپنی کتاب ”بذل المجہود“ میں ابن ارسلان کے حوالہ سے رقم طراز ہیں کہ ابن ارسلان نے فرمایا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ فرمان کسی مخصوص والد الزنا کے بارے میں ہے، نہ کہ مطلقاً، اور بعض نے یہ کہا ہے کہ ”وَلَدُ الزَّانِي شَرُّ الثَّلَاثَةِ“ اس اعتبار سے ہے کہ برائی تو اس کے والدین یعنی زانی اور زانیہ سے صادر ہوا ہے، لہذا ان دونوں پر حد جاری کی جائے گی، اور یہ حد ان دونوں کے گناہ کا کفارہ ہے۔

قال: ابن ارسلان: ذهب بعضهم إلى أن هذا إنما جاء في رجل بعينه كان موسوما

بالشر. (بذل المجہود: ۱۱/۶۹۷)

مولانا یحییٰ کاندھلویؒ نے حضرت گنگوہیؒ کی تقریر سے یہ لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ ولد الزنا سے مراد وہ شخص ہو، جس سے بکثرت زنا صادر ہوتا ہو، اس لئے وہ ولد الزنا ہو۔

وکتب مولانا محمد یحییٰ من تقریر شیخہ۔۔۔ وان كان المراد بولد الزنية الذي

يكثر من الزنا فصار كانه ولد الزنا. (بذل المجہود: ۱۱/۶۹۷)



باب :- ۱۳۸

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا فِي كِتَابِ اللَّهِ تَعَالَى مِمَّا ذَكَرَ الرَّحْمَةُ بِالرِّيحِ وَبِالرِّيَّاحِ مِمَّا قَدَّرُوهُ
عَنْ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِمَّا يَدُلُّ عَلَى الْأُولَى فِي ذَلِكَ مِنْ تَيِّنِكَ الْقِرَاءَتَيْنِ

﴿ ”رَح“ اور ”رِيَّاح“ کے معنی میں فرق کا بیان ﴾

حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ حَدَّثَنَا أَبُو عُبَيْدٍ قَالَ: "الْقِرَاءَةُ الَّتِي تَتَّبَعُهَا فِي الرِّيحِ وَالرِّيَّاحِ
أَنَّ مَا كَانَ مِنْهَا مِنَ الرَّحْمَةِ فَإِنَّهُ جَمَاعٌ، وَمَا كَانَ مِنْهَا مِنَ الْعَذَابِ. (شرح مشکل الآثار:

۳۷۹/۲، ورواه ابو يعلى: (۲۳۵۶))

خلاصہ الحدیث:

دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں، ہوا، پانی، اور آگ، اور ہوا کے لئے قرآن مجید اور احادیث میں ”رَح“ اور ”رِيَّاح“ دونوں جمع اور واحد کی قرأت میں استعمال ہوئے ہیں، ”رَح“ واحد ہے، اور ”رِيَّاح“ جمع، عام طور پر قرآن پاک میں رحمت کے لئے رِيَّاح اور عذاب کے لئے ”رَح“ واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے، جس کو ابو یعلیٰ نے اپنی کتاب مسند ابی یعلیٰ میں ذکر کیا ہے:

ان النبي عليه السلام - كما اذا هاجت الريح قال اللهم اجعلها رياحاً ولا تجعلها

ريحاً. (رواه ابو يعلى: ۲۳۵۶)

اے اللہ اس کو رِيَّاح بنا (جو رحمت لیکر آتا ہے اور رَح نہ بنا) جو عذاب لے کر آتا ہے۔

یہی رجحان اور نظریہ امام ابو عبید کا بھی ہے اور انہوں نے اپنے قول اور نظریہ کا استدلال حدیث الباب سے کیا ہے اور سورہ حجر میں ”ریاح“ کا لفظ آیا ہے۔

﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ﴾ (الحجر: 22)

اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے ہیں جو کہ بادل کو پانی سے بھر دیتی ہے، اور سورہ یونس میں ”ریح“ واحد استعمال کیا گیا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرَينَ بِهِمْ بَرِيحٍ طَيِّبَةٍ، وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ﴾ (یونس: 22)

وہ ایسا ہے کہ تم کو خشکی اور دریا میں لئے پھرتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور وہ کشتیاں لوگوں کے موافق ہوا کے ذریعہ سے لیکر چلتی ہیں، اور وہ لوگ ان سے خوش ہوتے ہیں۔

لیکن امام طحاوی نے ابو یعلیٰ کے قول کی سخت تردید کی ہے کہ ”ریاح اور ریح“ کے معنی میں یہ فرق کرنا اس کی کوئی اصل نہیں، پھر امام طحاوی فرماتے ہیں کہ دونوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے، کیوں کہ ”ریح“ کا لفظ جہاں رحمت لے کر آتا ہے، وہیں وہ عذاب لے کر بھی، جیسا کہ سورہ یونس میں ذکر ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس میں لفظ ”ریح“ رحمت الہی کے معنی میں ہے تو وہیں آخری جزء میں ”لاریح“ عذاب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرَينَ بِهِمْ بَرِيحٍ طَيِّبَةٍ، وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ﴾ (یونس: 22) وَكَانَتِ الرِّيحُ الطَّيِّبَةُ مِنَ اللّٰهِ رَحْمَةً، وَالرِّيحُ الْعَاصِفُ مِنْهُ عَزَّ وَجَلَّ عَذَابًا فَفِي ذَلِكَ مَا قَدْ دَلَّ عَلَى انْتِفَاءِ مَا رَوَاهُ أَبُو عُبَيْدٍ مِمَّا ذَكَرْنَاهُ عَنْهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳۷۹/۲)

اس کے علاوہ کئی احادیث میں دونوں الفاظ ”ریح اور ریح“ کے معنی میں مستعمل ہیں ”ریح جس طرح عذاب لانے والی ہوتی ہے، اسی طرح رحمت لانے والی بھی، لہذا ابو عبیدہ کا دونوں کے مابین فرق کرنا بے پناہ ہوگا، اور حدیث کے پیش نظر درست نہیں۔

وَالْأَصْلُ الَّذِي اعْتَبَرْنَا بِهِ هَذِهِ الْقِرَاءَةُ حَدِيثُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّهُ كَانَ إِذَا هَاجَتِ الرِّيحُ قَالَ: ”اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا رِيحًا، وَلَا تَجْعَلْهَا رِيحًا“ فَكَانَ مَا حَاكَاهُ أَبُو عُبَيْدٍ مِنْ هَذَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا لَا أَصْلَ لَهُ. (شرح مشکل الآثار: ۳۷۹/۲)

کیوں کے ابن عباسؓ کی حدیث میں ایک راوی ”حسین بن قیس“ راوی ہیں جو متروک الحدیث ہیں۔

لا یصح، رواہ ابو یعلیٰ، ۲۳۵۶، وغیرہ من حدیث ابن عباس وفی سندہ ”حسین بن قیس الرحبی“ وهو متروک. (علی هامش شرح مشکل الآثار: ۳۷۹/۲)

اور دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جب بھی ہوا چلتی، تو آپ ﷺ یہ دعا کرتے ”اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا أَمَرْتُ بِهِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا أَمَرْتُ بِهِ“

یعنی آپ ﷺ خیر والی ہوا کے لئے اللہ سے سوال کرتے اور شر والی ہوا سے پناہ چاہتے، اسی لئے امام طحاوی نے لکھا ہے کہ ریح باعث خیر ہے اور باعث عذاب بھی، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

فَهَذَا مَا وَجَدْنَا فِيهِ عَنْ أَنَسٍ وَفِي جَمِيعِ مَا رَوَيْنَا أَنَّ الرِّيحَ قَدْ تَأْتِي بِالرَّحْمَةِ، وَقَدْ تَأْتِي بِالْعَذَابِ، وَأَنَّهَا لَا تَفْرَقُ بَيْنَهُمَا إِلَّا فِي الرَّحْمَةِ، وَالْعَذَابِ، وَأَنَّهَا رِيحٌ وَاحِدَةٌ لَا رِيحٌ. (شرح

مشکل الآثار: ۳۷۹/۲)

اسی طرح صاحب ”لمعات التنقیح“ نے ”رتح اور ریاح“ میں فرق کیا ہے۔

”رتح“ واحد کا صیغہ ہے، لغت میں عذاب کے معنی میں مشہور ہے، اور ”ریاح“ جمع کا صیغہ ہے، رحمت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، حضرت ابن عباسؓ کی دعاء ”اللہم اجعلها ریاحاً ولا تجعلها ریحاً“ سے یہی معنی مترشح ہوتا ہے، لیکن امام طحاویؒ نے اس توجیہ کی تردید کی ہے۔

فاعلم أنه قد اشتهر أن الريح بلفظ الواحد يستعمل في العذاب والرياح بلفظ الجمع في الرحمة كما وقع في كتاب الله وحمل الدعاء الذي جاء عن ابن عباس عن قوله ”اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا رِيحًا، وَلَا تَجْعَلْهَا رِيحًا“ وانكر ذلك أبو جعفر الطحاوي.

(لمعات التنقیح: ۶۲۸/۳)

اقوال المحدثین:

ملا علی قاریؒ نے ”شرح الطیبی“ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب رتح اور ریاح کو مطلقاً دیکھتے ہیں، تو زیادہ تر ”رتح“ کا اطلاق عذاب پر ہوتا ہے اور ”ریاح“ کا اطلاق رحمت پر۔

قال الطیبی:----- إذا حکم علی الريح والرياح مطلقین کان اطلاق الريح

غالباً فی العذاب والرياح فی الرحمة----- (مرقاۃ المفاتیح: ۳۴۴/۳)

اسی طرح علامہ خطابیؒ کے حوالہ سے صاحب ”مجمع بحار الانوار“ نے لکھا ہے:

”رتح“ کا اطلاق عام طور پر عذاب کے لئے ہوتا ہے، اور ”ریاح“ کا استعمال رحمت

کے لئے۔

الرياح إذا كثرت جبلت السحاب وكثرت المطر وزكت الزروع والثمار وإذا
توحدت تكون عقيمة، والعرب تقول: لا تقلح السحاب الا من رياح، ومعناه انه موافق
للتنزيل إن استعمال للريح مطلقا في العذاب والرياح مطلقا في الرحمة فلا يرد... فإن
الريح مقيدة بالطيب... (مجمع بحار الأنوار: ٢/٣٩٢)



باب :- ۱۳۹

باب بیانِ مُشکلِ ما رَوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ قَالَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَيْتَ إِنْ وَجَدْتُ مَعَ امْرَأَتِي رَجُلًا أُمَّهَلُهُ حَتَّى آتِي بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ؟ قَالَ: "نَعَمْ"

﴿ عزت و آبرو کی حفاظت اور زنا کے ثبوت کی شرطوں کا بیان ﴾

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ، قَالَ لِرَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَرَأَيْتَ إِنْ وَجَدْتُ مَعَ امْرَأَتِي رَجُلًا أُمَّهَلُهُ حَتَّى آتِي بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ؟ قَالَ: "نَعَمْ". (شرح مشکل الآثار: ۳۸۹/۲)، ورواه مالك: ۴۳۷/۲، وابن حبان: (۴۲۷۳)، وفي "سنن الشافعي": (۵۵۶))

خلاصہ الحدیث:

یقیناً دنیا میں عبادات کی ادائیگی کا مقصد رضاء الہی اور دنیا اور آخرت میں فلاح و کامرانی حاصل کرنا ہے، اسی طرح زنا جیسے سنگین جرم پر حدود کے نفاذ کا مقصد انسان کی عزت و ناموس کی حفاظت ہے، یہ شریعت مطہرہ کا امتیاز ہے کہ اس نے عفت و عصمت کی صیانت و تحفظ کے لئے نہ صرف حدود کا حکم دیا ہے؛ بل کہ بہت سے مباح اعمال سے بھی اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے۔ جو زنا اور بے حیائی کے قریب کرنے والے ہیں، مثلاً سفر میں عورتوں کا محرم کے بغیر سفر کرنا، مرد اور عورت کو بدننگا ہی سے بچنے کا حکم، دوسرے کے گھر میں اجازت کے بغیر داخل ہونا وغیرہ۔

یہ صحیح ہے کہ مقاصد شریعت صرف پانچ ہیں: حفظ جان، حفظ مال، حفظ عرض، حفظ دین

اور حفظ نسل، مگر ان میں حفظ عرض (یعنی عزت و آبرو کی حفاظت) کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نہ صرف نکاح کی ترغیب دی ہے؛ بلکہ بعض صورتوں میں اسے ضروری قرار دیا ہے۔ اور جائز صورت کو چھوڑ کر ناجائز طریقہ پر خواہشات پوری کرنے کی صورت میں زانی اور زانیہ پر (محسن کی صورت میں) حد زناء کا نفاذ ضروری قرار دیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص نکاح پر قادر نہیں ہے، تو اسے روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔

”فمن لم يستطع منكم فعليه بالصوم فانه له وجاء“۔ (ابوداؤد شریف: ۲۷۹/۱)

اللہ تعالیٰ نے جرائم پر جو سزا نافذ کرنے کا حکم دیا ہے، وہ جرم کے موافق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حقوق اللہ میں حد زنا ایک سنگین سزا ہے، اس لئے اس جرم کو ثابت کرنے کی شرطیں بھی دیگر جرائم کے مقابلہ میں زیادہ سخت رکھی گئی ہیں، چنانچہ زنا کے ثبوت کے لئے چار چشم دید مردوں کی گواہی ضروری ہے، اگر قاذف نے اس جرم کو گواہوں سے ثابت نہیں کر سکا، تو اس پر حد قذف کا حکم دیا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا

تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۗ (نور: ۴)

بہر حال حدیث الباب میں یہی مضمون وارد ہوا ہے، نیز ذخیرہ احادیث سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ صحابہ کرام کو جب بھی کوئی ضرورت پیش آئی، یا کوئی مسئلہ پیش آتا، تو فوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے جیسا کہ حدیث الباب حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو ملوث پاؤں، تو کیا میں اس کو اسی حالت پر چھوڑ کر چار گواہ تلاش کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔

اشکال:

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ہم نے اس حدیث پاک میں غور و فکر کرنے کے بعد ایک فقہی بات کا استنباط کیا کہ ضابطہ کے مطابق مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو منکر چیزوں سے روکے، اس لحاظ سے آپ ﷺ کا حضرت سعد کو اس بات کا حکم دینا کہ وہ دونوں کو اسی حالت پر باقی رکھے، بظاہر ان کو اور زیادہ معصیت پر برقرار رکھنا ہے، نہ کہ اس سے روکنا ہے؟

جواب:

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس لئے ہے کہ ان دونوں پر حجت تمام ہو جائے اور ان پر سزا قائم کی جاسکے جیسا کہ فرمایا:

فَكَانَ ذَلِكَ عِنْدَنَا، وَاللَّهُ أَعْلَمُ؛ لِتُقَوْمَ الْحُجَّةَ عَلَيْهِمَا بِمَا هُمَا فِيهِ حَتَّى تُقَامَ عَلَيْهِمَا عُقُوبَتُهُ، وَفِي ذَلِكَ مَا قَدْ دَلَّ عَلَى أَنَّ مِثْلَ هَذَا حَتَّى تُقَامَ عُقُوبَتُهُ مُطْلَقًا.

(شرح مشکل الآثار: ۲/۳۹۰)

نیز یہ ان حضرات کی بھی دلیل ہے جو چار گواہوں کی شرط لگاتے ہیں، جو ان کے خلاف گواہی دے، اور ان گواہوں کا اس بارے میں بغور دیکھنا محمود ہے، اور ان کی گواہی بھی مقبول ہے، اور یہ اس لئے کیا ہے، تاکہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حد قائم ہو جائے، جس کے وہ مستحق ہوئے اور اسی کے قائل امام ابوحنیفہ اور صاحبین علیہم الرحمہ ہیں۔

لیکن بعض حضرات نے ان پر نکیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان گواہوں کی گواہی رد کر دی جائیگی، اس لئے کہ ان کی طرف جان بوجھ کر دیکھنا اچھا فعل نہیں ہے، البتہ اس سلسلہ میں احناف ہی کا قول معتبر ہوگا، مگر آپ ﷺ کا حضرت سعد کو حکم دینا کہ وہ ان دونوں کو اسی حال پر چھوڑ کر ان کے علاوہ چار گواہوں کی تلاش کرے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر کی گواہی عورت

کے خلاف قابل قبول نہیں ہوگی، جیسا کہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، اور سارے مدنیین کا یہی قول ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی کے متعلق روایت ہے، یعنی ان چار گواہوں کے متعلق جو عورت پر زنا کی گواہی دے، ان میں سے ایک شوہر ہو، تو فرمایا کہ شوہر سے لعان کیا جائے گا اور تین گواہوں کو کوڑے لگائے جائیں گے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ شوہر کے علاوہ تین گواہوں کا ہونا جوان پر گواہی دے آسان ہے، بنسبت اس کے کہ چار گواہ شوہر کے علاوہ ہوں، جو گواہی دے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت سعدؓ کو اس بات کا حکم دینا کہ وہ ان دونوں کو اسی معصیت پر باقی رکھے اور چار گواہ تلاش کرے، جو ان کے خلاف گواہی دے، یہ سارا اس لئے تھا کہ ان دونوں پر حجت تمام ہو جائے، لہذا جب معلوم ہو گیا کہ مطلوب چار گواہ شوہر کے علاوہ ہے، تاکہ تین تو اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ شوہر کی گواہی عورت کے خلاف قبول نہیں ہوگی، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد کے جواب میں تین گواہ کو تلاش کرنے کا حکم دینے کی بجائے چار کی کیا ضرورت تھی؟ چوتھے آپ ہوں گے یہ کہتے ہوئے کہ اس میں آسانی بھی رہتی، اور وقت بھی کم خرچ ہوتا، لیکن پھر بھی چار گواہوں کا حکم دیا معلوم ہوا کہ شوہر کی گواہی قبول نہیں کی جائیگی۔ واللہ اعلم۔

اقوال المحدثین:

حضرت ملا علی قاریؒ اس بارے میں فرماتے ہیں کہ مسئلہ یہ ہے کہ چار گواہ کا شرط ہونا قطعی اور متفق علیہ ہے اور حکمت یہ ہے کہ اس ستر کے معنی کی تحقیق کرنا جو کہ مندوب ہے۔

”مسئلة وهي اشتراط الأربع قطعية مجمع عليها والحكمة تحقيق معنى الستر المندوب اليه“۔ (مرقاة المفاتيح: ۳۰۹/۶)

وفي اوجز المسالك: في الحديث النهي عن اقامة حد بغير سلطان ولا شهود ووقوع الذريعة الى سفك الدم بمجرد الدعوى. (اوجز المسالك: ۲۹۴/۵)

وفي فتح الباري: اختلف فيه فقال الجمهور عليه لقود وقال احمد واسحاق — إن اقام بينة انه وجدته مع امرئته هدر دمه وقال الشافعي: سعيه فيما بينه الله قتل الرجل ان كان ثيبا. وعلم انه نال منها ما بوجب الغسل ولكن لا يسقط عنه القود في ظاهر الحكم وقد اخرج عبدالرزاق بسند صحيح إلى هاني بن جزام، ان رجلا ن وجد من امرئته رجلا فقتلها، فكتب عمر كتابا في العلانية أن يقيدوه به وكتابا في السر ان يعطوه الدية، وقال ابن المنذر: جاءت الاخبار عن عمر في ذلك مختلف، وعامة أسانيدھا منقطعة وقد ثبت عن علي انه سئل رجل قتل رجلا وجدته مع امرئته فقال: إن لم يأت باربعة شهد وإلا فليعض برمته.

وقال الشافعي عليه السلام: ولهذا نأخذوه نعلم لعلي مخالف ذلك.

(فتح الباري: ۲/۱۲/۲۰۱)

امام جصاص اپنی کتاب احکام القرآن میں قلم بند کرتے ہیں کہ نہی عن المنکر کا تقاضہ یہ ہے کہ فوراً زانیوں کو زنا سے روک دیا جائے، لیکن حدیث میں اس کے برعکس حکم ہے کہ ٹھہر جائے یہاں تک کہ چار گواہ حاضر ہو جائے، تا کہ ان پر حد قائم کیا جائے، اسی طرح غصن بصر کا تقاضہ یہی ہے کہ زانیوں کی طرح نہ دیکھے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے زنا پر گواہوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا ہے، اور یہ اسی وقت ہوگا، جب کہ عمداً زنا کو دیکھا جائے، تا کہ زانیوں پر حد قائم کی جائے اور گواہوں کی گواہی ساقط نہ ہوں۔

لان الله تعالى أمر بالاشتتھاد على الزنا وذلك لا يكون إلا بتعمد النظر، فدل ذلك على أن تعمد النظر الى الزانين لاقامة الحد عليها لايسقط شهادته وذلك موافق لظاهر الآية۔۔۔ (احکام القرآن: ۳/۲۰۶)



باب :- ۱۴۰

بَابُ بَيَانِ مُشْكِْلِ مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيمَنْ أَطَّلَعَ عَلَى رَجُلٍ فِي مَنْزِلِهِ بِغَيْرِ إِذْنِهِ
هَلْ لَهُ فِقْهُ عَيْنِهِ لِذَلِكَ أَمْ لَا؟

﴿دوسرے کے گھر میں جھانکنے کی سزا کا بیان﴾

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَوْ أَطَّلَعَ عَلَيْكَ رَجُلٌ
فَحَدَفْتُهُ فَفَقَّأَتْ عَيْنَهُ مَا كَانَ عَلَيْكَ جُنَاحٌ". (شرح مشكل الآثار: ۳۹۲/۲)، ورواه وابن حبان:
(۶۰۰۲)، ابن الجارود: (۷۹۱)

خلاصۃ الحدیث:

اسلام ایک ایسا ہمہ گیر مذہب ہے جس میں پیش آنے والے تمام مسائل کی رہنمائی کی گئی ہے، ایک انسان کو اپنے معاشرے میں رہ کر کس طرح زندگی بسر کرنی ہے؟ اور دیہات اور شہر میں کس طرح زندگی گزارنی ہے؟ حتیٰ کہ راستے کے حقوق اور کسی کے گھر کے پاس سے گزرنے کے آداب بھی بتائے گئے ہیں، اسی لئے راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹانے، نگاہیں نیچی کر کے چلنے کا حکم دیا ہے، کسی کے دروازے اور گھر کی کھڑکی سے جھانکنے اور بلا اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونے سے منع فرمایا ہے؛ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی انسان بلا اجازت کسی کے گھر میں جھانک کر دیکھ لیتا ہے، اور صاحب مکان نے ایسے شخص کی آنکھ میں کنکری مار دی اور اس کی وجہ سے اس کی آنکھ بہہ گئی، تو صاحب مکان پر کوئی گناہ اور جرم عائد نہیں ہوگا۔

چنانچہ امام طحاویؒ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

شخص سے جو کسی کی آنکھ پھوڑ دے، اس کے گھر میں دیکھنے کی وجہ سے، تو گناہ اور جرمانہ کی نفی کر دی؛ وجہ اس کی یہ ہے کہ صاحب دار کا حق ہے کہ وہ گھر میں کسی کو دیکھنے نہ دے، بہر حال امام طحاویؒ نے اس طرح کی مختلف احادیث ذکر کی ہیں، لیکن حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث مختلف طرق سے ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک آدمی نے آپ ﷺ کے حجرے میں بل اور سرخ سے جھانک کر دیکھ رہا تھا، اور اس وقت آپ کے پاس ایک کنکر تھا جس کے ذریعہ اپنے پیر کو کھجا رہے تھے، پھر جب نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا، تو فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ دیکھ رہے تھے، تو تیری آنکھ میں نیزہ مارتا اور فرمایا کہ بغیر اجازت کے کسی کے گھر داخل ہونے سے اس لئے منع کیا گیا، تا کہ کوئی کس کے گھر اور کھڑکی سے نہ دیکھے۔

اشکال:

الغرض مختلف احادیث کو بیان کرنے کے بعد امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ تمام روایات سے پتہ چلا کہ صاحب دار کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے گھر میں کسی کو نہ جھانکنے دے، اور اگر کوئی جھانکے، تو اس کو روکنے کا اور اس کو ہٹانے کا حق ہوگا، اگرچہ اس میں آنکھ تلف کرنا لازم آئے، پھر بھی اس پر ضمان اور دیت کے اعتبار سے کچھ واجب نہ ہوگا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے منقول ہے جو کسی قوم کے گھر میں جھانکے اس کی اجازت کے بغیر، پھر انہوں نے اس کی آنکھ پھوڑ دی، تو ان پر نہ اس کی کوئی دیت ہوگی اور نہ قصاص ہوگا۔

آگے امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ روایات اتنی تو اتر کے ساتھ آئی ہیں کہ ان میں سے بعض بعض کی تائید کرتی ہے؛ لیکن ہم اپنے شہر کے فقہاء کو اس پر عمل کرتے ہوئے نہیں پاتے؛ بلکہ وہ تو صرف زبان کے ذریعہ سے سخت جملے کہہ کر ڈانٹ دیتے ہیں، لہذا احتمال ہے کہ اس زمانہ میں آنکھ پھوڑنا ضمان کا سبب ہو؟

وَفِيمَا رَوَيْنَا مِنْ هَذِهِ الْأَثَارِ مَا قَدْ دَلَّ أَنَّهُ لَمَّا كَانَ مِنْ صَاحِبِ الْمَنْزِلِ تَوَكُّؤُكَ الْإِطْلَاعِ

إِلَى مَنْزِلِهِ كَانَ لَهُ قَطْعُ ذَلِكَ عَنْ مَنْزِلِهِ، وَإِنْ كَانَ فِي قَطْعِهِ إِتْيَاهُ عَنْهُ تَلَفٌ عَيْنِ الْمُطَّلِعِ عَلَيْهِ، وَكَانَ مَنْ كَانَ لَهُ أَنْ يَفْعَلَ شَيْئًا فَفَعَلَهُ مَعْقُولًا أَنْ لَا ضَمَانَ عَلَيْهِ فِيهِ.

(شرح مشکل الآثار: ۲/۳۹۵)

الجواب:

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ہم نے اس مسئلہ میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ دشمنان اسلام سے جہاد کرنا ہم پر واجب ہے، لہذا اس واجب کی ادائیگی کے لئے ہم نے آگے بڑھ کر دشمنوں کو جہاد اور قتال کی طرف بلا یا تو یہ اچھا ہے، اور اس صورت میں جو کچھ ان کو نقصان پہنچے گا، تو ہم پر کوئی ضمان نہیں ہوگا اور اگر ہم نے ان سے قتال اور لڑائی کی، جہاد کی طرف بلائے بغیر تو اس صورت میں جو کچھ ان کو نقصان پہنچے گا اس پر کوئی ضمان عائد نہ ہوگا، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جس لڑائی کی طرف وہ ان کو بلاتے ہیں وہ بھی اس کو اچھی طرح جانتے ہیں، لہذا ہم پر کوئی ضمان عائد نہ ہوگا، پس یہی مثال اس آدمی کی ہے جو گھر میں جھانکنے کے لئے اس کو کسی کام کے لئے بلایا ہے اور اس کو بتلا دیا ہے کہ وہ گھر میں جھانکنے سے باز نہیں آیا، تو اس کے ساتھ یہ معاملہ کریں گے، تو یہ اچھا ہے اور اگر ہم نے اس کی آنکھ پھوڑ بھی دی، تو ہم پر کوئی ضمان عائد نہیں ہوگا، کیونکہ ہم نے اس کو روک دیا ہے اور اگر ہم نے اس کو گھر میں دیکھنے سے نہیں روکا اور اس کو کسی کام کے لئے بلایا اور نہ روکنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اجنبی گھر کی طرف دیکھنا حرام ہے اور پھر ہم نے اس کی آنکھ کے ساتھ یہ معاملہ کیا تو جائز ہوگا۔

اسی طرح کوئی آدمی اسلام سے مرتد ہو جائے، تو اسلام کا قانون یہ ہے کہ تین دن کی مہلت کے بعد اسلام کی طرف واپس نہ لوٹے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا، اب اگر قتل کرنے سے پہلے اس کو توبہ کرائی، تو بہت اچھا ہے اور اگر توبہ کرائے بغیر قتل کر دیا، تو بھی جائز ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بھی توبہ کو جانتا ہے۔

امام طحاوی فرماتے ہیں ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ گھر میں جھانکنے کی وجہ سے اس کی آنکھ پھوڑ دینا صحیح ہے اور اس پر کوئی ضمان عائد نہ ہوگا، جیسا کہ یہ بات دلیل نقلی سے ثابت ہوتی ہے۔

اخیر میں حضرت عمرؓ کا بھی قول ذکر کیا گیا ہے، جس سے اس مسئلہ کی بھی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: جو شخص کسی قوم میں جھانک کر دیکھے، پس انہوں نے اس کو زخم پہنچایا، تو اس پر کوئی دیت نہ ہوگی۔

وَقَدْ رُوِيَ هَذَا الْقَوْلُ الَّذِي اجْتَبَيْنَا عَنْ عُمَرَ كَمَا حَدَّثَنَا يُوْسُفُ بْنُ يَزِيدَ، حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ، حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ، حَدَّثَنَا أَشْعَثُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ، عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: "مَنْ اطَّلَعَ عَلَى قَوْمٍ فَأَصَابُوهُ بِجِرَاحَةٍ فَلَا دِيَةَ لَهُ".

(شرح مشکل الآثار: ۲/۳۹۷)

اقوال لمحدثین:

اس حدیث کے بارے میں دیگر محدثین اور شراح حدیث نے بھی چند جواب اور تاویل پیش کی ہیں، ان میں سے چند مندرج ذیل ہیں:

(۱) علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور صاحب "بذل الجھوڈ" نے مذکورہ حدیث کے بارے میں جمہور ائمہ (سوائے امام مالکؒ کے) کے اقوال کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر گھر والے گھر میں جھانکنے والے کی آنکھ کو پھوڑ دیں، تو اس کی آنکھ کا ضمان نہیں ہوگا، وہ معاف ہے، گویا جمہور ائمہ اس حدیث کے ظاہر اور اطلاق پر عمل کرتے ہیں اور اس کی کوئی تاویل نہیں کرتے ہیں۔

جبکہ مالکیہ نے اس حدیث کو تغلیظ پر محمول کیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جان کر قصداً آنکھ پھوڑی ہے، تو اس صورت میں ان کے یہاں قصاص ہے اور اگر آنکھ پھوڑنا مقصود نہیں تھا بلکہ روکنا مقصود تھا، لیکن اچانک پھوٹ گئی، تو اس صورت میں دیت دینا ہوگا۔ (الدر المنصور: ۶/۲۵۵)

”وقال الحافظ بن حجر نقلا عن الشوكاني: قال الشوكاني: ذهب إلى مقتضى هذه الاحاديث جماعة من العلماء، منهم الشافعي وخالفت المالكية هذه الاحاديث فقالت: إذا فعل صاحب المكان بمن اطع عليه ما اذن به النبي - ﷺ - وجب عليه القصاص أو الدية وساعدهم على ذلك جماعة من العلماء ولم يذكر الحنفية في مختلف الحديث بل في كتب الحنفية. (بذل المجهود: ۳/۵۵۸، فتح الباري: ۲/۲۳۸، ۲۳۵)

(۲) صاحب عون المعبود ذکر کرتے ہیں کہ حنفیہ ضمان کے قائل ہیں اور انہوں نے اس حدیث کو مبالغہ فی الزجر پر محمول کیا ہے۔

”وقال ابوحنيفة: عليه الضمان والحديث محمول على المبالغة في الزجر.“ (عون المعبود: ۸/۴۳۰، ۴۳۱)

(۳) صاحب بذل المجہود نے در مختار کے حوالے سے حنفیہ کا یہ مذہب نقل کیا ہے، اگر جھانکنے والے کو اس فعل سے روکنا بغیر فقہی عین کے ممکن نہ ہو، تب ضمان نہیں ہوگا، اور اگر ممکن ہوگا، تو ضمان ہوگا، گویا مذکور قول کے مطابق حنفیہ اس حدیث کو عدم قدرت عن التحیة من غیر فقہی پر محمول کیا ہے۔

”بل في كتب الحنفية ما قال في الدر المختار في القنية: نظر في باب دار رجل فقفا الرجل عينه لا يضمن إن لم يمكنه تحنيطه من غير فقئها وإن امكن ضمن.“

(بذل المجهود: ۱۳/۵۵۸)

جبکہ علامہ شامی علیہ الرحمہ ”معراج الدرہ“ کے حوالے سے حنفیہ کا مذہب وجوب ضمان

نقل کیا ہے، اسی وجہ سے صاحب بذل المجهود کہتے ہیں کہ حنفیہ کی اس بارے میں روایات مختلف ہیں امام صاحب اور صاحبین سے کوئی صراحت نہیں ملتی۔

”فعلم بهذا ان الروایات الحنفية مختلفة وليس نص على ابي حنيفة ولا عن صاحبيه“۔ (بذل المجهود: ۵۵۸/۱۳)

علامہ عینی نے اپنی کتاب ”عمدة القاری“ میں قلم بند کرتے ہیں کہ اس صورت میں ضمان نہیں آئے گا، جب کہ گھر میں آنے والا ایسے طریقہ سے آئے کہ صاحب منزل کو اس کا علم نہ ہو اور صاحب منزل اس کی آنکھ کو زخمی کر دے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر بغیر قصد کے اس کی آنکھ کو زخمی کر دیا، تو کوئی حرج نہیں اور یہ بطور تہدید اور تغلیظ ہے۔

والحاصل أنه يأتي من حيث لا يشعر حتى يطعمه وهذا تخصص بمن تعمد النظر، واذا وقع ذلك منه من غير قصد فلا حرج عليه، وقيل هذا على وجه التهديد والتغليظ. (عمدة القاري: ۲۲۱/۲۲)



باب :- ۱۴۱

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلا مَا رَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي جَوَابِهِ الْمِقْدَادَ لَمَّا سَأَلَهُ عَنِ الْكَافِرِ الَّذِي قَطَعَ يَدَهُ، ثُمَّ لَذَّ بِشَجَرَةٍ فَقَالَ: أَسْلَمْتُ لِلَّهِ جَلَّ وَعَزَّ أَفْقَلُهُ؟

﴿ کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کرنے کا بیان ﴾

عَنِ الْمِقْدَادِ، أَخْبَرَهُ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَيْتَ إِنْ لَقَيْتُ رَجُلًا مِنَ الْكُفَّارِ فَقَاتَلَنِي فَضَرَبَ إِحْدَى يَدَيَّ بِالسَّيْفِ فَقَطَعَهَا، ثُمَّ لَذَّ مِنْ شَجَرَةٍ فَقَالَ: أَسْلَمْتُ لِلَّهِ، أَفْقَلُهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ بَعْدَ أَنْ قَالَهَا؟ قَالَ: "لَا تَقْتُلُهُ فَإِنْ تَقْتُلُهُ فَإِنَّهُ بِمَنْزِلَتِكَ قَبْلَ أَنْ تَقْتُلَهُ، وَأَنْتَ بِمَنْزِلَتِهِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ كَلِمَتَهُ الَّتِي قَالَ". (شرح مشکل الآثار: ۳۹۷/۲)، ورواه البخاري: (۳۰۱۹)، ومسلم: (۹۵)، وأبو داود: (۲۶۳۳)

خلاصہ الحدیث:

مذہب اسلام ایک ایسا واحد مذہب ہے، جس نے ایک طرف ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے، تو وہیں دوسری طرف ہر طرح کی زیادتی اور ظلم و جور سے روکا ہے، اس لئے کہ کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ دوسروں پر ظلم کرے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے موقع پر بھی عورتوں اور بچوں کو مارنے پر صاف طور پر منع کر دیا اور اسی طرح ہر ظلم و زیادتی سے منع کر دیا، چنانچہ اسی کی ایک مثال حدیث پاک میں مذکور ہے۔

حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اگر جنگ کے موقع پر کسی

کافر سے مونڈ بھیر ہو جائے اور وہ میرا ہاتھ کاٹ کر کسی درخت کی پناہ لے اور وہ یہ کہے کہ میں اللہ پر ایمان لایا، تو کیا میں اس کو قتل کر دوں؟ یہ کلمہ کہنے کے بعد، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم قتل مت کرو، اس لئے کہ اگر تم نے اس کو قتل کیا، تو اس کو قتل کرنے سے پہلے وہ آپ کے درجہ میں ہو جائے گا۔“

اشکال:

اس حدیث سے یہ معنی نکلتا ہے کہ اگر کسی مجرم کافر کے کلمہ پڑھنے کے بعد اس کو قتل کرنے سے قاتل مسلمان ایمان کے درجہ سے نکل جائے گا اور کافر کے درجہ میں پہنچ جائیگا، جب کہ نفس ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، جو قلبی کیفیت ہے، وہ دل سے انکار کرنے سے ہی زائل ہو سکتی ہے، نیز اصول و روایت سے یہ بات درجہ یقین کو پہنچ چکی ہے کہ مومن اور کافر کے درمیان میں فرق ہے، کافر ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہے گا؛ جب کہ مومن ایک نہ ایک دن جنت میں جائے گا، چاہے کتنا ہی اور کیسا ہی گناہ کیا ہو؟ جیسا کہ مسلم شریف کی درج ذیل روایت میں ہے

”عن ابی ذر عن النبی ﷺ قال: أتانی جبرئیل فبشرنی أنه من مات من أمتک لا یشرک باللہ شیئاً دخل الجنة، قلت: وان زنی وسرق؟ قال: وان زنی وان سرق.“

(مسلم شریف: رقم الحدیث: ۱۵۳)

الجواب:

امام طحاوی فرماتے ہیں ”کان بِمَنْزِلَتِكَ قَبْلَ أَنْ تَقْتُلَهُ“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اسلام کو لیکر گیا، جیسا کہ تو مسلمان ہے، اور ”تكون أنتَ بِمَنْزِلَتِهِ“ کا مطلب یہ ہے کہ جیسے وہ کلمہ پڑھنے سے پہلے کفر کی وجہ سے اہل فارس میں سے تھا، ایسا ہی تو مسلمان کے قاتل ہونے کی وجہ سے اہل نار میں سے ہو گیا۔

فَكَانَ مَا فِي هَذَا الْحَدِيثِ مِنْ مَا يَجِبُ كَشْفُهُ وَتَأْوِيلُهُ وَطَلَبُ الْمَعْنَى الْمُرَادِ فِيهِ، فَكَانَ قَوْلُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَوَابًا لِلْمَقْدَادِ لَمَّا سَأَلَهُ بَعْدَ قَطْعِ الْكَافِرِ يَدَهُ أَنْ لَا يَقْتُلَهُ، وَأَعْلَمَهُ أَنَّهُ إِنْ قَتَلَهُ، كَانَ بِمَنْزِلَتِهِ قَبْلَ أَنْ يَقْتُلَهُ أَيُّ إِنَّهُ يُعَوِّدُ بِإِسْلَامِهِ إِلَى أَنْ يَكُونَ بِهِ مُسْلِمًا كَمَا كُنْتَ أَنْتَ مُسْلِمًا، وَأَنْ تَكُونِ أَنْتَ بِمَنْزِلَتِهِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ كَلِمَتَهُ الَّتِي قَالَ، يَعْنِي بِذَلِكَ كَلِمَتَهُ الَّتِي صَارَ بِهَا مُسْلِمًا أَيُّ إِنَّكَ تَعُوذُ قَاتِلًا لِمَنْ قَدْ صَارَ مُسْلِمًا، فَتَكُونُ بِذَلِكَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ كَمَا كَانَ هُوَ قَبْلَ الْكَلِمَةِ الَّتِي قَالَهَا كَافِرًا مِنْ أَهْلِ النَّارِ، وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ.

(شرح مشکل الآثار: ۲/۳۹۹)

اقوال المحدثين:

امام شافعیؒ اور ابن قسار مالکیؒ فرماتے ہیں کہ وہ کلمہ توحید پڑھنے کے بعد معصوم الدم اور محروم القتل ہو جائیگا، جیسا کہ تو اس کو قتل کرنے سے پہلے تھا، اس لئے اس کو قتل کرنے کے بعد تو غیر معصوم الدم اور مباح القتل ہو جائے گا جیسا کہ وہ کلمہ توحید پڑھنے سے پہلے تھا۔

”اختلف في معناه فاحسن ما قيل واظهره: مقاله الشافعي وابن القصار المالكي وغيرهم أن معناه فانه معصوم الدم محرم قتله بعد قوله لا إله إلا الله كنت انت قبل ان تقتله وإنك بعد قتله غير معصوم الدم ولا محرم القتل كما هو قبل قوله: لا إله إلا الله“.

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: ”إِنَّكَ بِمَنْزِلَتِهِ“ کا مطلب یہ ہے کہ تو مخالفت حق اور ارتکاب معصیت میں اس کے جیسا ہے، اگر چہ مخالفت اور گناہ کی حیثیت مختلف ہے، کیوں کہ اس کا گناہ کفر تھا اور تیرا گناہ فسق تھا۔

”قال القاضي وقيل معناه: إنك مثله في مخالفة الحق وارتكاب الاثم، وان اختلفت انواع المخالفة والاثم فتسمى إثمه كفرًا وإثمك معصية وفسقًا“۔ (فتح الباری: ۱۳/۱۶۹)

داودی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ تو قاتل بن گیا جیسا کہ وہ قاتل تھا، ”ونقل ابن

التین عن الداودی قال: معناه إنك صرت قاتلا كما هو قاتل“ (فتح الباری: ۱۳/۱۶۹)

ملا علی قاری فرماتے ہیں:

والمعنى كما كنت قبل قتله محقون الدم بالاسلام، كذلك هو بعد الاسلام ”إنك

بمنزلته قبل ان يقول كلمته التي قال“ . لانك صرت مباح الدم كما هو مباح الدم قبل

الاسلام ولكن السبب مختلف، فان اباحة دم القاتل بحق القصاص و اباحة دم الكافر

بحق الاسلام-----

قال الطيبي: ولو حمل على التعليل والتشديد كما في قوله تعالى: ﴿وَلِلَّهِ عَلَى

النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتِطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ (ال

عمران: ۹۷) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمْ يَوْمٌ لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا خُلَّةَ وَلَا

شَفَاعَةً وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (سورة البقرة: ۲۵۴) لجاز فإنه جعل تاره الحج والزكاة في

الآيتين في زمرة الكافرين تغليظا وتشديداً أيذناً، بأن ذلك من اوصاف الكافر.

(مرقاة المفاتيح: ۸/۹۷)

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ”فإن قتله فانه

بمنزلك قبل أن تقتله“ تغليظ وتشديد پر محمول ہے، جیسا کہ تارک زکاۃ، تارک حج کو کافرین کے

زمرے میں شمار کیا گیا ہے، اس لئے حدیث الباب میں ”فانه بمنزلك“ کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تو

اس کو قتل کرے گا، تو اسی کی طرح تم ہو جاؤ گے، یعنی کافروں کے زمرے میں شمار کئے جاؤ گے۔

اقول ولو حمل على التعليل والتشديد كما في قوله تعالى ﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ

الْبَيْتِ مَنِ اسْتِطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ (ال عمران: ۹۷) وقوله تعالى: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا

رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا يَبْعُ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٥٤﴾
 (البقرة: ۲۵۴) لجاز فأنه حصل تارك الحج والزكاة في الآيتين من زمرة الكافرين تغليظا
 وتشديدا وايدانا بأن ذلك من اوصاف الكفار فينبغي للمسلم أن يحترز منه.

(شرح الطيبي: ۲۴۵۵/۸)

قاضی عیاض رقمطراز ہیں کے گرچہ قاتل حق کی مخالفت اور گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے
 کافر کے زمرے میں شامل ہو گیا، لیکن اثم و معصیت کے درجات کے اعتبار سے کافر اور قاتل
 میں واضح فرق ہے، چنانچہ کافر کا (اثم) گناہ موجب کفر و شرک ہے اور قاتل کا گناہ موجب
 معصیت اور فسق ہے۔

معناه انك مثله في مخالفت الحق وارتكاب الاثم وان اختلفت انواع المخالفة

والاثم، فيسمى اثمه كفرا وشركا واثمك معصية وفسقا. (اكمال المعلم: ۱/۳۶۸)



باب :- ۱۴۲

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا زَوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ فِي حَدِيثِ التَّسْعَةِ لِأَخِي الْمَقْتُولِ
الْمَذْكُورِ فِيهِ: "أَمَا إِنَّكَ إِنْ قَتَلْتَهُ يَعْنِي قَاتِلَ أَخِيهِ "كُنْتَ مِثْلَهُ"

﴿ قاتل سے قصاص کا مطالبہ کرنے کے بجائے معاف کرنے کا بیان ﴾

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ بِقَاتِلِ وَلِيِّهِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ لَهُ: "اعْفُ
فَأَبَى" قَالَ: "خُذْ أَرْضًا فَأَبَى" قَالَ: "أَتَقْتُلُهُ؟ فَإِنَّكَ مِثْلُهُ" قَالَ: فَخَلَى سَبِيلَهُ فَرُئِيَ يَجْرُ
نِسْعَتَهُ ذَاهِبًا إِلَى أَهْلِهِ. (شرح مشكل الآثار: ۲/۴۰۰)، ورواه النسائي: ۸/۱۷۸، وابن ماجه: (۲۶۹۱)

خلاصۃ الحدیث:

اسلام نے جہاں مظلوم و مقتول کے وارث کو قصاص کا مطالبہ کی اجازت دی ہے، وہیں
عفو و درگزر اور قاتل کو معاف کرنے کی بھی ترغیب دی ہے، اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے قاتل
کو "مِنْ أَخِيهِ" سے تعبیر کیا ہے، کہ قاتل نے گرچہ وقتی طور پر شیطانی غلبہ کی وجہ سے قتل کر بیٹھا ہے
مگر وہ دراصل تمہارا بھائی ہے، اس لئے قصاص اور بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دینا زیادہ بہتر
ہے، اور یہ عفو و درگزر اسلام ہی کا طرہ امتیاز ہے، اس بنا پر اس کو قرآن نے تخفیف و رحمت الہی
سے تعبیر کیا ہے، اور یہ انبیاء اور صلحاء کا کردار ہے، اسی وجہ سے اس باب کی پہلی روایت میں یہی
مضمون مذکور ہے کہ ایک ولی مقتول قاتل کو لے کر دربار رسالت میں حاضر ہو کر حق قصاص کا
مطالبہ کیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً معاف کرنے کا مشورہ دیا، لیکن جب وہ اس پر آمادہ نہیں ہوا
تب دیت لے کر درگزر کرنے کا مشورہ دیا، مگر اس پر بھی وہ راضی نہیں ہوا، تو اخیر میں "فإنك

مثله، ”جیسے مبہم الفاظ سے عفو و درگزر کی ترغیب دی۔

تعارض:

حدیث اول میں معاف نہ کرنے پر وعید مذکور ہے، اس طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم نے معاف نہیں کیا، تو تم بھی اس کی طرح ہو جاؤ گے، جب کہ حضرت وائل کی دوسری روایت میں معاف کرنے پر وعید مذکور ہے، اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر تم نے معاف کر دیا، تو گناہ لے کر لوٹے گا؛ لہذا دونوں روایتوں میں بظاہر تعارض نظر آ رہا ہے۔

فَكَانَ مَا فِي حَدِيثِ وَايِلٍ هَذَا مَكَانَ مَا قَدْ رَوَيْنَاهُ عَنْ وَايِلٍ، وَعَنْ أَنَسٍ: ”إِنَّكَ إِذَا قَتَلْتَهُ كُنْتَ مِثْلَهُ، أَمَا إِنَّكَ إِذَا عَفَوْتَ عَنْهُ فَإِنَّهُ يَبُوءُ بِإِثْمِكَ وَإِثْمِ صَاحِبِهِ“، فَمَعْنَى ذَلِكَ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ،

إِنْ كَانَ هُوَ الصَّحِيحَ فِي حَدِيثِ وَايِلٍ أَنَّكَ إِذَا عَفَوْتَ عَنْهُ بَاءَ بِإِثْمِ صَاحِبِكَ الَّذِي لَمْ تُقِمْ عَلَيْهِ عُقُوبَتَهُ وَبَاءَ بِإِثْمِكَ، فِيمَا أَدْخَلَ عَلَى قَلْبِكَ فِي قَتْلِهِ صَاحِبِكَ، مِمَّا لَمْ تُقِمْ عَلَيْهِ عُقُوبَتَهُ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۰۵)

جمع و تطبیق:

امام نووی نے اس عبارت سے دو معنی مراد لیا ہے:

(۱) قاتل کا قتل کرنا دراصل مقتول کے سابقہ گناہ کے ازالہ کا سبب ہے، جن کا اس قاتل سے کوئی تعلق نہیں۔

هذا يحتمل معنيين: الأول يكون عفو له عنه سبباً لسقوط اثمه واثم أخيك المقتول،

والمراد اثمها السابق بمعاص لها متقدمة لا تعلق بهذا القاتل. (تكملة فتح الملهم: ۸/۳۲۲)

(۲) دوسرا معنی یہ ہے کہ قاتل قتل کرنے کا گناہ اور مقتول کے اولیاء کو پہنچنے والا رنج و صدمہ کا گناہ لے کر لوٹے گا، اور اس بات کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ دی۔

والثانی: یصل القاتل اثماً المقتول بالثلافة مهجته واثم الولی لكونه فجعه فی أخیه
ویكون قد اوحی الیه وآله وسلم بذلك فی هذا الرجل خاصة. (موسوعة تکملة فتح الملهم: ۳۲۲/۸)

امام جصاص احکام القرآن میں لکھتے ہیں:

آپ ﷺ کا ارشاد ”اما انک ان قتلت کنت مثله“ کے دو معانی ہیں، اول یہ کہ تم قاتل کے درجہ میں ہو جاؤ گے، اگر تم نے قاتل کو قتل کیا۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ اگر تم نے اس کو قتل کیا، تو وہ تمہارا پورا حق لے لیگا۔ کوئی ثواب تمہارے لئے نہیں ہوگا، حالانکہ بہتر یہ تھا کہ قتل کرنے کے بجائے اس کو معاف کر دیتا، جیسا کہ قرآن میں اس کی ترغیب آئی ہے ”فمن تصدق به فهو کفارة له“ (مائدہ: ۵۱)۔

پھر جو شخص اس کو معاف کر دے، تو وہ اس کے لئے کفارہ ہو جائے گا۔

یحتمل معنیین احدھما أنك قاتل کما أنه قاتل والآخر أنك اذا قتلته فقد استوفیت
حقتک منه ولا فضل لك علیه، وقد ندب اللہ تعالیٰ الی الافعال بالعنوب قوله تعالیٰ ”فمن
تصدق به فهو کفارة“۔ (احکام القرآن: ۱۹۳/۱)

اقوال المحدثین:

صاحب بذل نے حضرت مولانا بیگی کا ندھلوی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایسی تعبیر اختیار فرمائی ہے جو معنی مقصود کے علاوہ کا وہم پیدا کرتی

تھی، تاکہ ولی مقتول اپنی اور قاتل کی مغفرت کے حرص میں مقتول کو معاف کر دے۔

وكتب مولانا يحيى المرحوم في التقرير: قوله ييوء باثمه واثم --- الخ لم يرد بذلك إلا انه ييوء باثم قتل صاحبه وبآثامه الآخر، لانه ييوء باثم نفسه واثم صاحبه.

لأن ذلك مما لا يمكن، إذ لا تزروا زرة وزرراخرى الا أنه أو رده في العبارة الموهمة للمعنى غير المقصود ليركه القاتل حثا على مغفرة --- وليه المقتول ---.

(بذل المجهود: ۱۲/۹۴)

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب رقمطراز ہیں:-

قتل کرنے اور ولی مقتول کو پہنچنے والے رنج و صدمہ کا گناہ تو آخرت میں قاتل کو ہر حال میں ملنے والا ہے، پھر اگر وہی مقتول قصاص لے گا، تو اس کی سزا بڑھ جائے گی، اس طور پر کہ دنیا میں ہی سزا ملے گی، لہذا تم آخرت کی سزا پر اکتفاء کرو اور دنیا کی سزا چھوڑ دیں یہ مطلب ہوگا۔

وليكون المراد أنه القتل قد استحق اثم قتل اخيك واثم اخاك لقتله، وانه يعاقب بذلك في الآخرة على كل حال، فلو اخذت منه القصاص ردت عليه عقابا في الدنيا أفلا تكتفى بعقاب الآخرة وتعفو عنه في الدنيا. (تكملة فتح الملهم: ۸/۳۲۲)



باب :- ۱۴۳

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا فِي جَوَابِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْ أَبِي بَكْرٍ، وَمِنْ عُمَرَ، وَمِنْ سَهِيلِ بْنِ بَيْضَاءَ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ سُؤْلِهَا إِيَّاهُ مَا يَفْعَلُ بِرَجُلٍ لَوْ وَجَدَهُ مَعَ امْرَأَتِهِ؟

﴿لعان کی صورت اور اس کا بیان﴾

حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ عُمَرَ بْنِ سُلَيْمَانَ بْنِ عُمَرَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ شَبَّوَيْهِ، حَدَّثَنَا النَّضْرُ
بْنُ سُمَيْلٍ، عَنْ يُونُسَ بْنِ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ زَيْدِ بْنِ يَثِيجَ، عَنْ حَذِيفَةَ قَالَ: قَالَ
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَبِي بَكْرٍ: ”أَرَأَيْتَ لَوْ وَجَدْتَ مَعَ امْرَأَتِهِ رَجُلًا مَا كُنْتَ
صَانِعًا بِهِ؟“ قَالَ: كُنْتُ صَانِعًا بِهِ شَرًّا قَالَ: ”فَأَنْتَ يَا عُمَرُ؟“ قَالَ: كُنْتُ قَاتِلُهُ، قَالَ: ”فَأَنْتَ
يَا سَهِيلُ بْنُ بَيْضَاءَ؟“ قَالَ: كُنْتُ أَقُولُ أَوْ قَائِلًا: لَعَنَ اللَّهُ الْأَبْعَدَ وَلَعَنَ اللَّهُ الْبَعْدَاءَ وَلَعَنَ أَوْلَ
الثَّلَاثَةِ، أَخْبَرَ بِهَذَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ”تَأَوَّلْتَ الْقُرْآنَ يَا ابْنَ بَيْضَاءَ؟“ ﴿وَالَّذِينَ
يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ﴾ (النور: 6) ”الآية. (شرح مشكل الآثار: ۴۰۶/۲)، ورواه البزار: (۲۳۳۷)، وأورده
الهيثمی فی ”المجمع“: (۷۴/۷۷))

خلاصہ الحدیث:

یہ بات عین قیاس بھی ہے کہ جس جرم کی سزا سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، اس کے
ثبوت کی شرطیں اور قیود بھی سخت ہونی چاہئے، چنانچہ زنا تمام جرائم میں سب سے سنگین جرم ہے،
اس کی سزا بھی سنگین ہے، اس لئے اس کے ثبوت کے لئے چار چشم دید گواہوں کی گواہی ضروری

ہے، حتیٰ کہ میاں بیوی میں سے ایک کا دوسرے کی عزت پر تہمت کو ثابت کرنے کے لئے بھی (یعنی چار گواہوں کو پیش کرنا ضروری ہے) ورنہ دونوں پر لعان واجب ہوتا ہے، جیسا کہ اس باب کی پہلی روایت میں مذکور ہے، لیکن اگر شوہر نے لعان کئے بغیر طلاق دے دی، تو عدت کے پورا ہونے کے ساتھ ساتھ فرقت بغیر حرمت ابدیہ کے ہوگی، اور یہ بہتر ہے، اس لئے کہ شریعت نے رہنمائی کی ہے کہ جب کسی معاملہ میں دورا ہیں ہوں، تو ان میں سے آسان راہ کو اختیار کیا جائے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بخاری شریف میں مروی ہے۔

”ما خیر رسول اللہ بین أمرین الا اخذ ايسرهما ما لم یکن اثماً“.

(صحیح البخاری: کتاب المناقب، رقم الحدیث: ۳۵۶۰)

اسی طرح اس باب کی پہلی روایت میں ہے اور حضرت حدیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین صحابہ (حضرت ابو بکر، عمر، سہیل بن بیضار رضی اللہ عنہم) سے یہ سوال کیا کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ کسی اجنبی مرد کو پاؤ، تو کیا کرو گے؟ تو حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ اس سے بُرائی کا معاملہ کروں گا، اور حضرت عمرؓ سے پوچھا، تو انہوں نے کہا کہ ایسے شخص کو قتل کر دوں گا، اسی طرح جب سہیل بن بیضارؓ سے پوچھا، تو انہوں نے جواب دیا کہ میں ان دونوں پر لعنت بھیجوں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے ابن البیضاء! تم نے قرآن کریم کی مذکورہ آیت ﴿وَالَّذِينَ يَزْمُونَ اَرْوَاجَهُمْ﴾ (النور: 6)“ الآیة کی بڑی اچھی تاویل کی۔

تعارض:

حدیث الباب میں دو اعتبار سے تعارض ہے، ایک یہ کہ حضرت عمرؓ کا سوال کے جواب میں قتل کرنے کا مشورہ دینا، بخاری شریف کی حدیث کے خلاف ہے، وَوَجَدْنَا مَا فِيهِ مِنْ جَوَابٍ عُمَرَ اِيَّاهُ عَمَّا سَأَلَهُ عَنْهُ فِيهِ مِمَّا يَحْتَجُّجُ اِلَى تَأْمُلِهِ وَالْوُقُوفِ عَلٰى الْمَعْنٰى فِيهِ. (شرح مشکل

عن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ لا يحل دم امرء مسلم يشهدان لا إله إلا الله وأنى رسول الله إلا بأحدى ثلاث: النفس بالنفس والثيب الزاني، والسارق من الدين التارك الجماعة. (بخارى شريف، كتاب الديات، باب: ۲، رقم الحديث: ۲۸۷۸)

اس حدیث میں صرف تین صورتوں میں کسی مسلمان کی جان لینے کی اجازت ہے، اور حدیث الباب میں حضرت عمر نے قتل کرنے کا مشورہ دیا ہے وہ ان صورتوں کے علاوہ ہے اس لئے تعارض ہے۔

(۲) تعارض کی دوسری صورت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے سوال پر حضرت سہیل بن بیضاء نے لعنت بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا، حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت بھیجنے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ حضرت سمرہ بن جندبؓ کی حدیث میں ہے۔

عن سمرة بن جندب عن النبي ﷺ قال: لا تلعنوا بلعنة الله ولا بغضب الله ولا بالنار. (ابوداود: ۴۹۷۲)

جمع و تطبیق:

جہاں تک حضرت عمرؓ کے قول کا تعلق ہے، تو یہ قول اجماع کے خلاف ہے، اس کا کوئی عالم قائل نہیں؛ بلکہ وہ منسوخ ہے، اور ناسخ صرف بخاری شریف کی حدیث ہے، اور منسوخ متروک کے معنی میں ہوتا ہے، لہذا اس وقت حکم بخاری شریف کی حدیث پر ہے، اس لئے اب دونوں میں کوئی تعارض باقی نہیں رہا۔

فَإِنْ كَانَ ذَلِكَ مِمَّا لَا قَائِلَ لَهُ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ كَانَ تَرْكُهُمُ الْقَوْلَ بِهِ أَوْ الْعُدُولَ عَنَّهُ إِلَى ضِدِّهِ دَلِيلًا عَلَى نَسْخِهِ؛ لِأَنَّا إِنَّمَا نَقُولُ كَمَا يَقُولُ بِهِ لِأَخْذِنَا إِتْيَاهُ عَنَّهُ وَامْتِنَالِ مَا كَانُوا عَلَيْهِ فِيهِ أَوْ فِي مِثْلِهِ مِنْ مَا يَدُلُّ عَلَى أَنْ يَجِبَ الْقَوْلُ بِهِ فِيهِ..... (شرح مشكل الآثار: ۲/۴۰۷)

رہا مسئلہ دوسرے تعارض کا تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت سمرہ بن جندب کی حدیث میں لعنت کی ممانعت علی الاطلاق نہیں؛ بلکہ خاص صورتوں میں ہے، اس کے علاوہ صورتوں میں جائز ہے، اور حضرت سہیل بن بیضاء نے جس صورت میں لعنت بھیجنے کی بات کہی ہے، وہ مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ ہے، لہذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

أَخَذَهُمَا: إِبَاحَةُ لَعْنِ أَهْلِ تِلْكَ الْمَعْصِيَةِ وَأَنَّ ذَلِكَ خَارِجٌ مِنْ نَهْيِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أُمَّتَهُ
 أَنَّ يَكُونُوا الْعَانِينَ وَدَلِيلٌ أَنَّ الْمُرَادَ بِالتَّهْيِ عَنْ ذَلِكَ فِي مَا رُوِيَ عَنْهُ التَّهْيِ فِيهِ غَيْرُ الْمُطْلَقِ مِنْهُ
 فِي هَذَا الْحَدِيثِ، - (شرح مشکل الآثار: ۲/۴۰۸)



باب :- ۱۴۴

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا رُوِيَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهِ:
 ”لِيُؤَاخِذَ يَوْمَئِذٍ كُلَّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَأَعْتَبَتْ“

﴿مدیون کو سب و شتم کرنے کا بیان﴾

حَدَّثَنِي عَمْرُو بْنُ الشَّرِيدِ، سَمِعَ أَبَاهُ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ”لِيُؤَاخِذَ يَوْمَئِذٍ كُلَّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَأَعْتَبَتْ“ . (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۱۰)، ورواه أحمد: ۳۸۹/۴، والطبرانی: (۷۲۳۹)، والحاكم: ۱۰۲/۴))

خلاصہ الحدیث:

اس دنیا میں ہر شخص محتاج اور ضرورت مند ہے، کوئی غنی و بے نیاز نہیں، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جو غنی و بے نیاز ہے، جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ (سورہ فاطر: ۱۵) (اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ غنی اور بے نیاز ہے)۔

گرچہ رسول اللہ ﷺ نے دین اور قرض سے پناہ چاہی ہے اور امت کو بھی اس کی وصیت کی ہے؛ لیکن ضرورت مند اور حاجت مند کے لئے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ قرض خواہ اور صاحب مال کو اس کی ترغیب دی ہے کہ دائن مدیون مفلس کے ساتھ نرمی اور مسابہت کا معاملہ کرے، اور مفلس کے قرض کو معاف کر دے، تاکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے ساتھ بھی حساب و کتاب میں نرمی اور سہولت کا معاملہ کریں گے۔

وہیں دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مدیون اور قرض دار کی تشبیہ بھی کی ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی قرض دار ادائیگی دیون پر قادر ہونے کے باوجود ٹال مٹول کرتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بے حرمتی اور بے آبروئی کی اجازت دی ہے کہ دائن مدیون کو سب و شتم کر سکتا ہے، جیسا کہ اس باب کی پہلی روایت میں ہے۔

حضرت شریذ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدیون قادر کا ٹال مٹول کرنا، اس کی بے عزتی اور سزا کو حلال قرار دیا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو شخص صاحب استطاعت اور مالدار ہونے کے باوجود بلا عذر اپنے قرض خواہ کا قرض ادا نہ کرے، تو اس کی آبروریزی بھی مباح ہے، اور اس کو سزا دینا بھی درست ہے، کیوں کہ اس کی طرف سے بلا عذر ادائیگی قرض میں ٹال مٹول اور تاخیر پائی جا رہی ہے، وہ ایک طرح سے ظلم ہے، اور آبروریزی کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسے سرزنش کی جائے، اور اسے بُرا بھلا کہا جائے، حتیٰ کہ حاکم و عدالت سے چارہ جوئی کر کے اسے قید خانہ میں ڈلوادیا جائے۔

اشکال:

تمام مخلوقات میں انسان اشرف المخلوقات ہے، انسان کے رتبہ اور مقام کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی شایان شان تعظیم و احترام کیا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی بڑائی اور مقام احترام کا ذکر قرآن میں کیا ہے،

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾ (بنی اسرائیل: ۷۰)

(اور ہم نے آدم کی اولاد کی عزت کی ہے، اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا، اور نفس نفیس چیزیں عطا کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔) مگر حدیث

الباب میں انسان کی بے عزتی کی اجازت دی گئی ہے جو مقاصد شریعت اور مقام بنی آدم کے خلاف ہے؟

جواب:

امام طحاویؒ نے اس اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ بے عزتی اور بے آبروئی کی اجازت علی الاطلاق نہیں ہے، کہ ہر انسان کی شرافت و عزت کی بے عزتی کی جائے؛ بلکہ اس سے وہ انسان مراد ہے، جو کسی سے قرض حسنہ لیا، روپیے رہتے ہوئے ادا نہیں کرتا؛ بلکہ ٹال مٹول کرتا ہے، یہ ٹال مٹول کرنا ظلم ہے ”مطل الغنی ظلم“ اس صورت میں یہ مدیون اس کے مستحق ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بے عزتی کی اجازت دی ہے۔

وَإِذَا اسْتَحَقَّ بَلِيَّةٌ ذَلِكَ إِنْ كَانَ ظَالِمًا، اسْتَحَقَّ أَنْ يُخَاطَبَ بِذَلِكَ، وَأَنْ يُوَبَّخَ بِهِ يَقُولُ لَهُ: يَا ظَالِمُ، وَيُقَالُ لَهُ: أَنْتَ ظَالِمٌ، فَهَذَا الَّذِي يَحِلُّ مِنْ عَرْضِهِ بَلِيَّةٌ.

(شرح مشکل الآثار: ۴۱۳/۲)

اور امام طحاویؒ نے امام محمدؒ کے قول کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ یہاں پر بے عزتی سے سب و شتم مراد نہیں ہے؛ بلکہ اس سے مراد مدیون سے تقاضہ کرنا اور عقوبت سے ملازمت مراد ہے، یعنی مدیون سے ادائیگی دین کے لئے تقاضہ کرنا مراد ہے۔

غَيْرَ أَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ الْحَسَنِ فِيمَا أَجَارَهُ لَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ، عَنْ أَبِي عُبَيْدٍ، عَنْهُ قَالَ: هُوَ التَّقَاضِي، وَالْقَوْلُ عِنْدَنَا فِي ذَلِكَ هُوَ الْقَوْلُ الْأَوَّلُ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ؛ لِأَنَّ التَّقَاضِي مِنْ حَقِّ مَنْ لَهُ الدَّيْنُ عَلَى مَنْ هُوَ عَلَيْهِ قَبْلَ لِيهِ إِيَّاهُ بِهِ، وَإِذَا لَوَّاهُ بِهِ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِ مَعْنَى سِوَاهُ لَمْ يَكُنْ مُسْتَحَقًّا لَهُ عَلَيْهِ قَبْلَ ذَلِكَ وَهُوَ غَيْرُ التَّقَاضِي، وَأَمَّا الْعُقُوبَةُ الْمُسْتَحَقَّةُ عَلَيْهِ فَقَدْ قَالَ قَوْمٌ: إِنَّهَا الْحَبْسُ فِي ذَلِكَ الدَّيْنِ، وَقَالَ مُحَمَّدٌ فِي الرَّوَايَةِ الَّتِي ذَكَرْنَاهَا: إِنَّهَا الْمَلَازِمَةُ لَهُ، وَالْمَلَازِمَةُ هِيَ حَبْسٌ لِلْمَلْزُومِ عَنْ تَصَرُّفِهِ فِي أُمُورِهِ فَهِيَ تَقْرُبُ مِنَ الْحَبْسِ الْمَعْقُولِ غَيْرَ أَنَّ

الْأَوْلَىٰ فِي ذَلِكَ عِنْدَنَا. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۱۳)

اقوال المحدثین:

علامہ ابن حجرؒ نے سفیان ثوریؒ کے حوالہ سے بے عزتی کے معنی کو اس طرح واضح کیا ہے کہ بے عزتی سے مراد سفیان ثوری کے نزدیک مدیون کو تکلیف پہنچانا ہے۔

وقال اسحاق رضی اللہ عنہ: فسر سفیان عرضه أذاه بلسانه. (فتح الباری: ۳۴۲/۵)

امام وکیع نے یہاں پر بے عزتی سے مدیون کی شکایت کرنا مراد لیا ہے۔

وقال احمد رضی اللہ عنہ: كما رواه وكيع بسنده قال وكيع عرضه شكايته.

(فتح الباری: ۳۴۲/۵)

محدث کبیر شیخ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ بھی اس مدیون کو مراد لیا ہے، جو قرض ادا کرنے کی طاقت کے باوجود ٹال مٹول کرتا ہو، تو اس کی بے عزتی کو مباح قرار دیا ہے۔

أى مطله والواجد: الغنى القادر على قضاء دينه "يحل عرضه وعقوبته" قال ابن المبارك، معنى قوله: "ويحل عرضه أى يغلظله فى القول ويقال: انت مَطَلْتنى" وعقوبته "يحسبه" أى لاجل المطل. (بذل المجهود: ۳۶۱/۱۱)

علامہ سندھیؒ نسائی شریف کے حاشیہ پر قلم بند کرتے ہیں کہ وہ مدیون جو قرض ادا کرنے پر قادر ہونے کے باوجود ٹال مٹول کرتا ہے، تو اس کی بے عزتی مباح ہے، اور اسے یا ظالم کہنا، اور جس و تعزیر کا حاکم سے مطالبہ کرنا قرض خواہ کے لئے مباح ہے۔

قوله لئى الواجد "بفتح اللام وتشديد الياء، أى مطله، والواجد بالجيم، القادر على الاداء أي الذى يجد ما يؤدى،" يحل عرضه أى للدائن بأن يقول ظلمنى ومطلينى وعقوبته وبالحبس والتعذير. (حاشیہ النسائی للسندی: رقم الحدیث: ۴۶۹۰)



باب :- ۱۴۵

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا زَوَى عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي التَّهْيِ عَنِ اتِّخَاذِ الْغُرْفِ ،
وَمَا زَوَى عَنْهُ فِي إِبَاحَةِ ذَلِكَ

﴿بِالْإِخَانَةِ بِنَانِ كَابِيَانِ﴾

عَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ أَنَّهُ بَنَى غُرْفَةً، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "أَلْقَهَا"
فَقَالَ: أَنَا أَنْفَقْتُ مِثْلَ ثَمَنِهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَرَدَّ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلَيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، وَرَدَّ الْعَبَّاسُ
عَلَى النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ كُلُّ ذَلِكَ يَقُولُ لَهُ: "أَلْقَهَا" وَيَقُولُ الْعَبَّاسُ: أَنفَقْتُ مِثْلَ
ثَمَنِهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَنَفِي. (شرح مشكل الآثار: ۲/۴۱۳)، وأورده الهيثمي في "المجمع": (۷۰/۴)

خلاصہ الحدیث:

دنیا میں انسان کی تخلیق کا واحد مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دارالبقاء (آخرت) کی تیاری ہے، اسی لے عبادت کی ادائیگی میں جو چیزیں مؤید ہیں، ان کی فراہمی تعاون علی البر میں شامل ہیں، اور فقہاء نے انہیں ضرورت انسانی میں شمار کیا ہے، مثلاً کھانا، کپڑا اور مکان، لہذا کھانا کپڑا کی طرح سرچھپانے کے لئے مکان کا انتظام اور اس کے لئے تگ و دو کرنا جائز و درست ہی نہیں بلکہ اگر ضرورت کے مطابق ہے اور اس کی تعمیر میں مال حلال صرف کیا گیا ہے، اسراف نہیں کیا ہے، تو یہ عمل باعث ثواب اور باعث عبادت ہے، اس لئے اگر کوئی عام مسلمان اپنے لئے کوئی مکان کی تعمیر کرتا ہے اور عمدہ بالا خانہ بناتا ہے، تو اس کے لئے درست ہے۔ اگر عمارت اور مکان کی تعمیر میں مال حلال کا استعمال کیا گیا ہے یا مکان عمدہ بالا خانہ کی طرح بغیر ضرورت کے بنایا گیا

ہے، تو اس کی اجازت ہے مگر یہ عزیمت کے خلاف ہے، اسی طرح یہ عمل صحابہ کرام کی شان اور مقام کے خلاف ہے۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کے بالا خانہ کو دیکھا، تو تین مرتبہ اس کو گرا دینے کا حکم فرمایا، جیسا کہ حدیث الباب میں ذکر ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ نے اس بالا خانہ کے مطابق اللہ کے راستہ میں انفاق کا وعدہ بھی کیا، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گرا دینے کا حکم فرمایا۔

سوال:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ کے بالا خانہ کو پسند نہیں کیا؛ بلکہ اس کو گرانے کا حکم دیا اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:

حضرت امام طحاویؒ نے دو وجہیں ذکر کی ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ وہاں پر تمام لوگوں کے مکانات چھوٹے تھے، دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ عمارت اور بالا خانہ بغیر ضرورت کے بنائے گئی تھی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں کیا اور گرا دینے کا حکم دیا۔

فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَبَّاسَ بِالْقَاءِ الْعُرْفَةِ الَّتِي ابْتَنَاهَا، فَاحْتَمَلَ أَنْ يَكُونَ ذَلِكَ مِنْهُ كَرَاهِيَةً مِنْهُ لِاتِّخَاذِ الْعُرْفِ الَّتِي يُسْتَعْلَى مِنْهَا عَلَى مَنَازِلِ النَّاسِ؛ لِقَصْرِ مَنَازِلِهِمْ، وَاحْتَمَلَ أَنْ يَكُونَ ذَلِكَ لِكَرَاهَةِ الْبُنْيَانِ الَّذِي لَا يُحْتَاجُ إِلَيْهِ عُلُوًّا كَانَ أَوْ سُفْلًا. (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۱۴)

اس سلسلہ میں حدیث الباب حضرت انسؓ کی روایت بہت ہی چشم کشا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار گھر سے باہر تشریف لائے، تو ایک بلند و بالا گنبد نظر آیا،

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو ایک صحابہ نے کہا کہ ایک انصاری کا گھر ہے، کچھ دنوں کے بعد وہ صاحب مکان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض کیا، کوئی بات نہیں کی، اس صحابی کو بڑی فکر ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کیوں بات نہیں کی؟ ناراضگی کی کیا وجہ ہے؟ صحابہ کرام نے مذکورہ بالا پورا واقعہ سنایا، تو وہ صحابی گھر آئے اور اس گنبد والا مکان کو گرا دیا۔

اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوسری مرتبہ اس مکان کے پاس تشریف لے گئے، وہاں کوئی عمارت نہیں تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا وہ عمارت کہاں گئی؟ تو صحابہ نے بتایا کہ صاحب مکان نے اس کو گرا دیا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ہر عمارت اس کے مالک پر باعث وبال ہوگی، ہاں! وہ مکان جو ضرورت کے تحت بنایا گیا ہو، اس کی گنجائش ہے۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۱۵)

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ خَرَجَ فَرَأَى قُبَّةً مُشْرِفَةً فَقَالَ: "مَا هَذِهِ؟" فَقَالَ لَهُ أَصْحَابُهُ: هَذِهِ لِرَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ فَسَكَتَ وَحَمَلَهَا فِي نَفْسِهِ حَتَّى إِذَا جَاءَ صَاحِبُهَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي النَّاسِ أَعْرَضَ عَنْهُ، صَنَعَ ذَلِكَ بِهِ مِرَارًا، حَتَّى عَرَفَ الْغَضَبَ وَالْإِعْرَاضَ عَنْهُ شَكَا ذَلِكَ إِلَى أَصْحَابِهِ، فَقَالَ: وَاللَّهِ إِنِّي لَا نَكِرُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَمَا أَذْرِي مَا حَدَّثَ لِي وَمَا صَنَعْتُ؟ قَالُوا: خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَأَى قُبَّتَكَ فَسَأَلَ: لِمَنْ هِيَ؟ فَأَخْبَرْنَا، فَرَجَعَ الرَّجُلُ إِلَى قُبَّتِهِ فَهَدَمَهَا حَتَّى سَوَّاهَا بِالْأَرْضِ فَخَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَلَمَّ يَرَهَا فَقَالَ: "مَا فَعَلْتَ الْقُبَّةُ الَّتِي كَانَتْ هَاهُنَا؟" قَالُوا: شَكَا إِلَيْنَا صَاحِبُكَ إِعْرَاضَكَ عَنْهُ، فَأَخْبَرْنَا فَهَدَمَهَا فَقَالَ: "أَمَّا إِنْ كُلَّ بِنَاءٍ وَبِئَالٍ عَلَى صَاحِبِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا مَالًا إِلَّا مَالًا". (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۱۵)

تعارض:

باب کی پہلی اور دوسری حدیث اس بات پر دال ہے کہ عمارت اور مکان کی تعمیر مکروہ ہے،

جب کہ سہل بن معاذ الجہنی کی حدیث جواز پر دل ہے، بلکہ تعمیر مکان کو باعث اجر قرار دیا ہے۔

فَدَلَّ مَا فِي هَذَا الْحَدِيثِ عَلَى أَنَّ الْكَرَاهَةَ الْمَرْوِيَةَ فِيهِ إِنَّمَا هِيَ فِي نَفْسِ الْبُنْيَانِ. (شرح

مشکل الآثار: ۲/۴۱۶)

فَدَلَّ مَا فِي هَذَا الْحَدِيثِ عَلَى إِبَاحَةِ الْبِنَاءِ مَا يُنْتَفَعُ بِهِ أَحَدٌ مِنْ خَلْقِ الرَّحْمَنِ فِي غَيْرِ ظُلْمٍ وَلَا اعْتِدَاءٍ، وَكَانَ هُوَ الْمُسْتَشْنَى مِنْ مَا فِي الْحَدِيثِ الثَّانِي، وَاللَّهُ أَعْلَمُ. (شرح مشکل الآثار:

۲/۴۱۶-۴۱۷)

جمع و تطبیق:

امام طحاوی نے پہلے ”وَالْمَشْرُوبَةُ“ کا معنی ذکر کیا ہے ”وَالْمَشْرُوبَةُ هِيَ الْعُرْفَةُ“ کے معنی میں ہے، جس کا معنی بالا خانہ ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اگر عمارت کی تعمیر ظلم و زیادتی کے بغیر ہوئی ہے، تو مباح اور جائز ہے، لیکن اگر تعمیر ظلم و زیادتی کی بنیاد پر ہوئی ہے، تو وہ ممنوع اور ناجائز ہے۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَالْمَشْرُوبَةُ هِيَ الْعُرْفَةُ، فَدَلَّ مَا ذَكَرْنَا أَنَّ لَا تَضَادَّ فِي شَيْءٍ مِنْ مَأْرُؤِنَا فِي هَذَا الْبَابِ مِنْ أَحَادِيثِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّتِي رَوَيْنَاهَا عَنْهُ فِيهِ، وَأَنَّ اتِّخَاذَ الْعُرْفِ وَمَا سِوَاهَا مِنَ الْأَسَافِلِ فِي غَيْرِ ظُلْمٍ، وَلَا اعْتِدَاءٍ مِنْ مَا يُنْتَفَعُ بِهِ مُبَاحٌ غَيْرُ مَحْظُورٍ، وَاللَّهُ نَسْأَلُهُ التَّوْفِيقَ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۴۲۰)

اقوال المحدثین:

علامہ بدرالدین عینی نے تقریباً یہی جواب دیا ہے کہ متعدد روایات میں تعمیر مکان کی مذمت آئی ہے، چاہے وہ کسی بھی چیز سے بنی ہوئی ہو، اور اللہ تعالیٰ نے بھی ضرورت سے زائد تعمیر کی مذمت کی ہے۔

﴿أَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ﴾ ﴿وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ﴾ (شعراء:

”یعنی قصور او ما تنفق آدم فی الشراب، فلن یخلق له ولا یؤجر علیہ۔۔۔“ (۱۲۸-۱۲۹)

اور جو عمارت ضرورت کے پیش نظر بنائی جائے وہ مذموم نہیں۔

واما من بنی ما یحتاج إلیہ لیکنہ من الحر والبرد فمباح له وذلك. (عمدة القاری:

۲۷۴/۳۲)

ملا علی قاریؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ

وہ احادیث جو نفی پر دلالت کرتی ہیں وہ تباہ اور اسراف پر مبنی ہیں، البتہ اباحت والی احادیث کا رخیہ اور ضروریات پر محمول ہیں۔

معنی الحدیث ان کل بناء صاحبه فهو وبال أي عذاب في الآخرة والوبال في الاصل الثقل، والمكروه أراد ما بناه للتفاخر والتنعم فوق الحاجة لا ابنية الخیر من المساجد والمدارس والرباطات، وكذا مالا بد منه للرجل من القوت والملبس والمسكن. (مرقاة المفاتیح: ۳۲۴۵)

صاحب الفتح الربانی قلم بند کرتے ہیں:

اگر مکانات کی تعمیر خیر کے کاموں کے لئے تقرب الی اللہ کی نیت سے کی گئی ہے مثلاً مساجد و مدارس کی تعمیر میں روپے صرف کئے گئے ہیں، تو اس کے جواز میں کوئی قباحت نہیں؛ لیکن اگر اس سے دنیاوی غرض ہے، تو شرعیہ عمل مذموم ہوگا۔

سبیل الخیر کثیرة کبناء المدرسة لدراسة العلم والقرآن اولضيافة الفقير والغریب

وابن السبیل او نحو ذلك، مما یقصد بینائه التقرب الی اللہ، وما عدا ذلك فهو مذموم شرعا

وعرفا. (الفتح الربانی: ۳۱۵/۱۱)



باب :- ۱۴۶

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى عَزَّ
وَجَلَّ: ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُبِينٍ﴾ (الدخان: 10)

﴿قیامت سے قبل آسمان وزمین میں دھواں نظر آنے کا بیان﴾

الضُّحَى عَنْ مَسْرُوقٍ قَالَ: حَدَّثَنِي رَجُلٌ فِي الْمَسْجِدِ، فَذَكَرَ: ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ
بِدُخَانٍ مُبِينٍ﴾ (الدخان: 10) فَقَالَ: إِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَصَابَ النَّاسَ دُخَانٌ يَأْخُذُ بِأَسْمَاعِ
الْمُنَافِقِينَ وَأَبْصَارِهِمْ وَيَأْخُذُ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ كَهَيْئَةِ الزُّكَّامِ فَدَخَلْتُ عَلَى عَبْدِ اللَّهِ فَذَكَرْتُ
ذَلِكَ لَهُ، وَهُوَ مُتَكَبِّرٌ فَجَلَسَ غَضَبًا نَأْتُهُمْ قَالَ: ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ مَنْ عَلِمَ مِنْكُمْ شَيْئًا فَلْيَقُلْ بِهِ وَمَنْ
لَمْ يَعْلَمْ فَلْيَقُلْ: اللَّهُ أَعْلَمُ، فَإِنَّ مِنَ الْعِلْمِ إِذَا سِئِلَ الرَّجُلُ عَنْ مَا لَا يَعْلَمُ، قَالَ: اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ
أَعْلَمُ، وَقَدْ قَالَ عَزَّ وَجَلَّ لِنَبِيِّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: (قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ
الْمُتَكَلِّفِينَ) (ص: 86)، وَسَأَحَدْتُكُمْ عَنْ ذَلِكَ إِنَّ قُرَيْشًا اسْتَعْصَتْ وَنَفَرَتْ فَدَعَا عَلَيْهِمْ
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيلَ لَهُ (ارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُبِينٍ) فَآخَذَتْهُمْ
(ص: 422) سَنَةٌ عَصَتْ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى أَكَلُوا الْعِظَامَ وَالْحَتَّى كَانَ الرَّجُلُ يَرَى مَا بَيْنَهُ
وَبَيْنَ السَّمَاءِ كَهَيْئَةِ الدُّخَانِ مِنَ الْجَهْدِ فَقَالُوا: ﴿رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ﴾
(الدخان: 12) ثُمَّ قَرَأَ: ﴿إِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ﴾ (الدخان: 15) فَكَشِفَ عَنْهُمْ
فَعَادُوا فِي كُفْرِهِمْ: ﴿يَوْمَ تَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَى إِنَّا مُنْتَقِمُونَ﴾ (الدخان: 16)، فَعَادُوا فِي
كُفْرِهِمْ فَآخَذَهُمُ اللَّهُ فِي يَوْمٍ بَدْرٍ وَلَوْ كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَمْ يُكْشَفْ عَنْهُمْ“ (شرح مشکل الآثار:

(۳۲۱/۲) ورواہ البخاری: (۱۰۰۷)، (۱۰۲۰)، (وَأَحْمَدُ: ۳۸۰/۱))

خلاصہ الحدیث:

قیامت کا وقوع ایک یقینی امر ہے، جس میں شبہ کرنا درست نہیں؛ لیکن دن اور تاریخ کے اعتبار سے وہ متعین نہیں، البتہ اس کی کچھ علامات ہیں، جو پہلے پیش آئیں گی، پھر قیامت قائم ہوگی، ان نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ آسمان اور زمین کے درمیان دھواں نظر آئے گا، چنانچہ حضرت امام بیہقیؒ سے مروی ہے کہ اہل مکہ بھوک سے مرنے لگے، اور قاعدہ ہے کہ شدت کی بھوک اور خشکی میں یعنی آسمان و زمین کے اندر دھواں سا آنکھوں کے سامنے نظر آیا کرتا ہے، اس کو ”دخان“ فرمایا، الغرض اہل مکہ اپنی جانوں سے تنگ آگئے اور عاجزی کرنے لگے، چنانچہ یہ پیشین گوئی کے طور پر فرماتے ہیں کہ اس وقت جناب باری میں عرض کریں گے کہ اے ہمارے رب! ہم سے اس مصیبت کو دور کر دیجئے، ہم ضرور ایمان لے آویں گے۔ (بیان القرآن: ۳۷۵/۳)

اسی طرح اس باب کی ایک روایت میں ہے حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم چھ چیزوں کے ظاہر ہونے سے پہلے اعمال کر لو:

(۱) سورج مغرب کی طرف سے طلوع ہونے سے پہلے (۲) دھواں، (۳) دجال

(۴) دابة الارض (۵) قیامت۔ (شرح مشکل الآثار: ۲۲۲/۲)

الغرض اس حدیث میں جو دخان (دھواں) کا ذکر آیا ہے اس کے متعلق اختلاف ہے کہ

آیا یہ علامت واقع ہو چکی ہے یا نہیں؟

چنانچہ باب کی پہلی حدیث میں حضرت مسروق ارشاد فرماتے ہی کہ مسجد میں میرے

سامنے قرآن کریم کی اس آیت ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ (الدخان: ۱۰) کے تحت بیان فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا، تو لوگوں کو ایک دھواں پہنچے گا اور وہ منافقین کے کانوں اور

آنکھوں کو سلب کر لے گا، یعنی یہ دھنواں ان کے بدن میں اس طرح چلا جائے گا کہ ان کے بدن کے سارے مسامات سے دھواں نکلے گا؛ لیکن یہی دھواں مؤمنین کو صرف ذکام کی کیفیت پیدا کرے گا، حضرت مسروق فرماتے ہیں یہ سن کر میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس کا ذکر کیا اور وہ ٹیک لگائے ہوئے تھے، غصے کی وجہ سے بیٹھ گئے اور فرمایا: اے لوگو! تم میں سے جو کوئی بات جانتا ہے، وہی کہے اور جو نہ جانتا ہو اس کے متعلق ”اللہ اعلم“ کہہ دے، اس لئے کہ علم کے متعلق یہی بات ہے کہ جب اس کو ایسی بات پوچھی جائے، جو اس کو معلوم نہ ہو، وہ یوں کہہ دے ”اللہ اعلم“ اور اللہ نے بھی اپنے نبی کو بتلایا کہ آپ کہہ دیجئے میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں؛ لہذا جب کسی سے کوئی ایسی بات پوچھی جائے جو اس کو معلوم نہ ہو، تو وہ تکلف سے بات بنا کر بیان نہ کرے، پھر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں تمہارے سامنے اس ”دخان“ کے متعلق بیان کرتا ہوں کہ جب قریش نے نافرمانی کی، اور کفر کیا تو آپ ﷺ نے ان کے خلاف بددعا کی، چنانچہ ان کو کہا گیا کہ تم اس دن کا انتظار کرو، جس دن آسمان صریح دھواں لیکر آئے گا، چنانچہ ان کو ایک ایسے سال نے پکڑ لیا کہ جس میں ہر چیز ختم ہو گئی، تو وہ مردار اور ہڈیاں کھانے لگے، جس کے نتیجے میں وہ اپنے اور آسمان کے درمیان مشقت کی وجہ سے دھواں کی شکل دیکھنے لگے، تو وہ کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! تو ہم سے عذاب کو ہٹا دے، ہم ایمان لے آئیں گے، تو اللہ نے فرمایا ہم تھوڑی مدت تک عذاب کو ہٹا دیں گے، تو تم پھر اپنی پہلی حالت پر لوٹ آؤ گے، چنانچہ ان کے کہنے پر ان سے عذاب کو ہٹا دیا گیا، تو وہ پھر اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس دن ہم بڑی سخت پکڑ کریں گے، اس دن ہم اپنا پورا بدلہ لیں گے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اگر قیامت کے دن یہ عذاب ہوگا، وہ ان سے نہیں ہٹایا جائے گا، نیز ایک روایت میں ان الفاظ کی زیادتی ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے حق میں بددعا کی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے اللہ ان کے خلاف حضرت یوسف علیہ السلام کے

سات سالہ قحط کی طرح ان پر قحط کے ذریعہ میری مدد فرما۔

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ان دو حدیثوں سے معلوم ہوا کہ آیت مبارکہ میں جس ”دخان“ کا ذکر ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں گزر چکا۔

نیز حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے ایک روایت مذکور ہے وہ فرماتے ہیں کہ پانچ نشانیاں گزر چکی (۱) دخان (۲) انشقاق قمر (۳) روم اس سے مراد وہ پیشین گوئی ہے جو سورہ روم میں ان کے غلبہ کے متعلق ہے (۴) بطشہ کبریٰ یعنی غزوہ بدر (۵) ”لزام“ اس قرآن کی آیت ”فسوف یكون لزاماً“ کی طرف اشارہ ہے۔

(۱) اعتراض:

معارض کا اعتراض یہ ہے کہ یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ جبکہ اس سے پہلے والے باب میں حضرت حذیفہ ابن اسیدؓ کی روایت اس کے مخالف ہے، کیوں کہ اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی، یہاں تک کہ تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو، پھر ان میں سے ”دخان“ کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوا کہ ابھی یہ نشانی واقع نہیں ہوئی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم چھ چیزوں کے واقع ہونے سے پہلے اعمال صالحہ کرنے میں جلدی کرو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزیں شمار کرائی، جن میں دخان کا ذکر ہے، لہذا اس سے بھی معلوم ہوا کہ ابھی یہ نشانی واقع نہیں ہوئی۔

فَقَالَ قَائِلٌ: فَكَيْفَ تَقْبَلُونَ هَذَا وَقَدْ رَوَيْتُمْ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا قَدْ ذَكَرْتُمُوهُ فِي الْبَابِ الَّذِي قَبْلَ هَذَا الْبَابِ فِي حَدِيثِ حُدَيْفَةَ بْنِ أَسِيدٍ مِنْ مَا يُوجِبُ أَنَّ الدُّخَانَ لَمْ يَكُنْ بَعْدُ، وَأَنَّهُ كَانِ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ؟ (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۲۳-۲۲۳)

جواب:

امام طحاویؒ جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت میں جس ”دخان“ کا ذکر ہے وہ الگ ہے اور حضرت حذیفہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات میں جس ”دخان“ کا ذکر ہے وہ بھی الگ ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ دخان میں فرمایا:

﴿بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ﴾ (الدخان: 9) یعنی یہ لوگ شک میں ہے اور کھیل میں مصروف ہے، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ (الدخان: 10) معلوم ہوا کہ دخان (دھواں) کی سزا جو ان کو ملی وہ شک اور لعب کی وجہ سے، لہذا یہ بات محال ہے کہ یہ دونوں سزائیں (دخان اور بطشہ کبریٰ) ان کے علاوہ کے لئے ہوں، یا دونوں سزائیں ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ہوں، چوں کہ جب کرتوت ان کے ہیں، تو سزا بھی ان کو ہی ملے گی، اور دنیا میں ہی ملے گی۔

فَكَانَ جَوَابَنَا لَهُ بِتَوْفِيقِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَعَوْنِهِ أَنَّ الدُّخَانَ الْمَذْكُورَ فِي حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ غَيْرَ الدُّخَانِ الْمَذْكُورِ فِي حَدِيثِي حُذَيْفَةَ، وَأَبِي هُرَيْرَةَ وَذَلِكَ أَنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ فِي كِتَابِهِ فِي سُورَةِ الدُّخَانِ: ﴿بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ﴾ (الدخان: 9)، ثُمَّ أَتْبَعَ ذَلِكَ قَوْلَهُ تَعَالَى: ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ (الدخان: 10) أَيِ عُقُوبَةٍ لَهُمْ لِمَا هُمْ عَلَيْهِ مِنَ الشَّكِّ وَاللَّعِبِ، وَمُحَالٌ أَنْ تَكُونَ هَاتَانِ الْعُقُوبَتَانِ لِغَيْرِهِمْ، أَوْ يُؤْتَى بِهِمَا بَعْدَ خُرُوجِهِمْ مِنَ الدُّنْيَا وَسَلَامَتِهِمْ مِنْ ذَلِكَ الدُّخَانِ. فَقَالَ هَذَا الْقَائِلُ: قَدْ قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي هَذِهِ السُّورَةِ: ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ (الدخان: 10) وَالَّذِي ذَكَرَهُ ابْنُ مَسْعُودٍ فِي حَدِيثِهِ لَيْسَ هُوَ دُخَانًا حَقِيقِيًّا، وَإِنَّمَا هُوَ شَيْءٌ كَانَتْ قُرَيْشٌ تَتَوَهَّمُهُ أَنَّهُ دُخَانٌ وَلَيْسَ بِدُخَانٍ، وَفِيهَا أَنْ إِتْيَانُهُ يَكُونُ مِنَ السَّمَاءِ...، (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۲۵-۲۲۳)

(۲) اعتراض:

جبکہ ابن مسعودؓ کی روایت میں ذکر کردہ دھواں وہ حقیقت میں ”دخان“ نہیں تھا، بلکہ قریش نے اپنے وہم و گمان کے اعتبار سے اس کو دھواں سمجھا تھا، نیز آیت میں ہے کہ وہ دھواں آسمان سے آئے گا، جبکہ ابن مسعودؓ کی حدیث میں یہ ہے کہ وہ بھوک کی شدت اور قحط کی وجہ سے جو ان پر نازل ہوا تھا، اس کی وجہ سے وہ اپنے درمیان اور آسمان کے درمیان دھواں کے مانند وہ دیکھنے لگے حقیقتاً وہ دھواں نہیں تھا۔

وَالَّذِي ذَكَرَهُ ابْنُ مَسْعُودٍ فِي حَدِيثِهِ لَيْسَ هُوَ دُخَانًا حَقِيقِيًّا، وَإِنَّمَا هُوَ شَيْءٌ كَانَتْ قُرَيْشٌ تَتَوَهَّمُهُ أَنَّهُ دُخَانٌ وَلَيْسَ بِدُخَانٍ، وَفِيهَا أَنَّ إِثْبَانَهُ يَكُونُ مِنَ السَّمَاءِ، وَلَيْسَ فِي حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ ذَلِكَ، (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۲۵)

جواب:

امام طحاویؒ کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن مسعودؓ کی حدیث میں جس دخان کا ذکر ہے اس کو مجازاً ادخان کہا گیا ہے، کیونکہ قریش پر جو قحط اور مشقت آگری تھی، اس کی وجہ سے وہ حقیقت میں اس کو دخان سمجھنے لگے؛ حالانکہ وہ حقیقت میں دخان نہیں تھا، جیسا کہ دجال کے قصے کے بارے میں ہے کہ وہ آسمان کو حکم دے گا، تو وہ بارش برسائے گا اور زمین کو حکم دیگا، تو وہ نباتات اگانگی، اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے ساتھ دونہریں ہوں گی، میں ان دونوں کو اس سے زیادہ جانتا ہوں، چنانچہ وہ آسمان کو حکم دے گا، تو وہ بارش برسائے گا، جس کو لوگ دیکھیں گے۔

بہر حال یہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس کے سحر کا نتیجہ ہوگا، حقیقت میں کچھ نہیں ہوگا، لہذا یہاں کہا جاسکتا ہے کہ قریش نے جو دھواں دیکھا تھا، اس کو مجازاً ادخان کہا جاسکتا ہے، نہ کہ حقیقتاً اس کو دخان کہا جاسکتا ہے۔

امام طحاویؒ ابن مسعودؓ کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابن مسعودؓ کے قول کے مطابق دخان واقع ہو چکا ہے، لیکن اس پر اعتراض یہ ہوگا کہ آیت مبارکہ میں دخان کو آسمان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، یعنی وہ دھواں آسمان سے آریگا، جبکہ قریش نے جو دھواں دیکھا تھا، وہ حقیقت میں دھواں نہیں تھا؛ بلکہ قحطان پر اتنا سخت ہوا کہ اپنے اور آسمان کے درمیان دھواں سمجھنے لگے، اسی کا جواب دیتے ہوئے امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں پر جو چیزیں اپنے رب کی طرف سے نازل ہوتی ہے، وہ آسمان کی طرف منسوب ہوتی ہے، چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿يُنزِلُ السَّمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ﴾ (السجدة: 5) (یعنی خدا تعالیٰ تمام کاموں کا آسمان سے لے کر زمین تک انتظام کرتے ہیں) اللہ تعالیٰ اس آیت مبارکہ میں یہ خبر دے رہے ہیں کہ زمین میں جتنے امور ہوتے ہیں، وہ آسمان سے تدبیر کئے ہوئے ہیں، اس طرح کفار قریش جب خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر اتر آئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جس سبب سے سزا دی وہ سبب خدا تعالیٰ کا تدبیر کیا ہوا تھا، چنانچہ انہوں نے اس سزا میں دھواں دیکھا، حالانکہ حقیقت وہ دھواں نہیں تھا، اس لئے اس کو آسمان کی طرف منسوب کر دیا گیا، جہاں تک مسئلہ ہے دخان حقیقی کا، تو وہ قیامت کے قریب واقع ہوگا۔

فِي حَدِيثِ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ الدُّخَانَ لَمْ يَكُنْ بَعْدَ وَأَنَّهُ كَائِنٌ قَبْلَ يَوْمِ

الْقِيَامَةِ؟ وَمَا قَدَّرُوهُ عَنِ أَبِي هُرَيْرَةَ مِنْ مَا يَحَقُّ ذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۲۲۴/۲)

اقوال المحدثین :-

(۱) ----- بخاری شریف نے ابن دحیہ سے نقل کیا ہے کہ دخان دو ہیں، ایک گزر چکا اور دوسرا آنے والا ہے:

”وقال ابن دحیة الذی یقضیه النظر الصحیح حل أمر الدخان علی قضیتین

أحدهما وقعت، وكانت الأخرى ستقع. (بخاری: ۱۳۷۱، حشیہ: ۸)

(۲) امام ترمذی نے قرآن کریم کی مذکورہ آیات کے متعلق ابن مسعودؓ کی حدیث کو ترجیح دی یعنی یہ دخان واقع ہو چکا ہے، اور ”لزام“ سے مراد یوم بدر کو لیا۔

(۳) حضرت مفتی شفیع صاحب عثمانیؒ معارف القرآن کے اندر روح المعانی کے حوالے سے علامہ سارینی کا قول جو ابن مسعود کی دوسری روایت کے مطابق ہے نقل کیا ہے: یعنی ”دخان“ دو ہیں: ایک گزر چکا (قحط مکہ کے وقت) دوسرا باقی ہے، وہ آسمان اور زمین کی درمیان کی فضاء کو بھر دیا، اور مؤمنین کو اس سے صرف زکام کی کیفیت پیدا ہوگی، اور کافر کے تمام منافذ کو پھاڑ ڈالے گا، اس وقت اللہ تعالیٰ یمن کی طرف سے جنوبی ہوا بھیج دیں گے، جو مؤمنین کی روح قبض کر لے گی اور صرف کفار شرار الناس باقی رہ جائیں گے۔

”مما دخان مضی واحد والذی یقی یملا ما بین السماء والأرض وما یصیب المؤمن الا بالزکمة واما الکافر فیشق مسامعہ فیبعث اللہ تعالیٰ عند ذلک الریح الجنوب من الیمن، فتقتبض روح کل مؤمن ویقی شرار الناس (روح)۔ (معارف القرآن: ۷۶۲/۷۷)

علامہ عینیؒ ذکر کرتے ہیں کہ:

دخان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ دخان ہے، جو زمین و آسمان کے درمیان کو بھر دے گی اور مؤمن اس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ زکام کی طرح محسوس کرے گا، اور دخان حقیقی کے علاوہ ہے، اور دوسرا دخان حقیقی ہے جس کا ظہور قیامت کے قریب ہوگا۔

فعلی هذا هما دخانان: احدهما: الذی یملا ما بین السماء والأرض ولا یجد منه المؤمن الا کالزکامة وهو کھیئة الدخان غیر الدخان الحقیقی والآخراً هو الدخان الذی یکون عند ظهور الآیات والعلامات۔ (عمدة القاری: ۲۹۷/۷۷)

اسی طرح علامہ قرطبیؒ نے ابن وحیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ دخان دو قسم کے ہیں: ایک

واقع ہو چکا ہے اور دوسرا قیامت کے قریب واقع ہونے والا ہے، البتہ جو دخان واقع ہو چکا ہے وہ اصلاً دخان نہیں، بلکہ صرف ہیئت کے اعتبار سے دخان ہے، حقیقی دخان وہ ہے جو علامات قیامت میں سے ہے۔

قال القرطبي في التذكرة: قال ابن دحية: والذي يقتضيه النظر الصحيح حمل ذلك على قضيتين، أحدها وقعت، وكانت الأخرى ستقع وتكون، فاما التي كانت فهي التي كانوا يرون فيها كهيئة الدخان غير الدخان الحقيق الذي يكون عند ظهور الآيات هي من الأشرط والعلامات. (تحفة الاحوذى: ۳۴۵/۶)



باب :- ۱۴۷

بَابُ بَيَانِ مُشْكَلِ مَا رَوَى عَنْ رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ اسْتِغْفَارِهِ فِي صَلَاتِهِ عَلَى
الْمَيِّتِ الصَّغِيرِ

﴿ جنازہ کی دعاء ﴾

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي قَتَادَةَ، عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ شَهِدَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى عَلَى
الْمَيِّتِ قَالَ: سَمِعْتُهُ يَقُولُ: ”اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا، وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا، وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا،
وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا“ . (شرح مشکل الآثار: ۴۲۷/۲)، ورواه أحمد: ۱۷۰/۳، ۲۹۹/۵، والبيهقي: ۴۱/۳،
والنسائي في ”عمل اليوم والليلة“: (۱۰۸۲))

خلاصہ الحدیث:

دعا مؤمنین کے لئے ایک بڑا ہتھیار ہے، دعا عبادت ہے، دعا عبادت کی روح اور مغز ہے، اور بے سہارا لوگوں کے لئے بڑا سہارا ہے، یوں تو مؤمن کی کوئی دعا روئیں کی جاتی؛ بلکہ تین صورتوں میں سے ایک صورت میں ضرور قبول کی جاتی ہے، یہ ممکن ہے کہ کسی کی دعائی الحال کسی وجہ سے قبول نہیں ہو، مگر دعا کی وجہ سے دعا کرنے والوں کو قلبی اعتبار سے سکون و اطمینان ضرور حاصل ہوتا ہے، اور دلوں کو تسلی و فرحت بھی، اور دعا نہ صرف اپنے حق میں مفید ہے بلکہ دوسروں کے حق میں بھی مفید ہوتی ہے، حتیٰ کہ مردہ مؤمنین اور مؤمنات کے حق میں بھی دعا قبول ہوتی ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف دعا کی ترغیب و فضیلت بیان کی ہے؛ بلکہ آپ نے زندہ مسلمان کے علاوہ مردہ مؤمنین اور چھوٹے بچوں کے لئے بھی دعا کی ہے، جیسا کہ اس

باب کی پہلے حدیث میں مذکور ہے۔

اشکال:

نسائی شریف میں ہے تین اشخاص سے قلم اٹھادی گئی ہے، ان میں سے ایک وہ بچہ ہے، جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا، جبکہ اس باب کی پہلی حدیث میں ہے جنازہ کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے بچوں کے لئے بھی دعا استغفار کیا ہے؛ حالانکہ بچوں پر کوئی گناہ نہیں ہوتا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف سے استغفار کیوں کیا؟ اس اعتبار سے اشکال ہے۔

فَتَأْمَلْنَا مَا فِي هَذِهِ الْأَحَادِيثِ مِنْ اسْتِغْفَارِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلصِّغَارِ الَّذِينَ لَا ذُنُوبَ لَهُمْ كَمَا اسْتِغْفَارَهُ لِلْكِبَارِ ذَوِي الذُّنُوبِ إِذْ كَانَ بَعْضُ النَّاسِ قَدْ سَأَلَ عَنْ كَشْفِ ذَلِكَ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۳۱)

الجواب:

امام طحاوی نے اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بات صحیح ہے کہ بچوں سے بلوغ سے پہلے گناہ صادر نہیں ہوتا، مگر یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کی طرف سے اس گناہ سے استغفار کیا ہے، جو بالغ ہونے کے بعد صادر ہوگا، تا کہ استغفار سے گناہ معاف ہو جائے اور اس کے نامہ اعمال میں کوئی گناہ نہ لکھا جائے، اور نہ گناہوں کی وجہ سے مواخذہ ہو۔

فَمِثْلُ ذَلِكَ سُؤَالَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَبَّهُ عَزَّ وَجَلَّ الْغُضْرَانَ لِلصِّغَارِ هُوَ عَلَى هَذَا الْمَعْنَى، وَعَلَى الْغُضْرَانَ لَهُمْ مَا يَصِيبُونَهُ بَعْدَ بُلُوغِهِمْ مِنَ الذُّنُوبِ الَّتِي لَوْلَمْ يَكُنْ هَذَا الدُّعَاءُ مِنْهُ لَهُمْ كَانُوا مَا أَخُوذِينَ بِهَا مُعَاقِبِينَ عَلَيْهَا، فَعَادُوا بِدُعَاءِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهَذَا الدُّعَاءِ غَيْرَ مَا أَخُوذِينَ بِهَا وَغَيْرَ مُعَاقِبِينَ عَلَيْهَا. (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۳۲)

اس کی مثال قرآن کریم کی وہ آیت ہے، جس میں گناہ صادر ہونے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغفرت کا مزدہ سنایا گیا ہے۔

﴿لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾ (الفتح: 2)

(تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرما دے)

دوسری مثال حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمرؓ سے یہ فرمانا ہے:

مَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ اللَّهَ قَدْ أَطَّلَعَ عَلَى أَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ: اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ.

(شرح مشکل الآثار: ۲/۳۳۱)

الغرض جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدری صحابہ کی مغفرت کا اعلان گناہ سرزد ہونے سے پہلے کیا ہے، اسی طرح ان بچوں کے لیے گناہ ہونے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء مغفرت کی ہے، اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

وَمِثْلُ قَوْلِ اللَّهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى لِنَبِيِّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ﴿لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾ (الفتح: 2)، فَكَانَ ذَلِكَ غُفْرًا نَامِنُهُ لَهُ مَا لَمْ يَعْمَلْهُ حَتَّى يَكُونَ فِي عَمَلِهِ إِيَّاهُ مَعْفُورًا لَهُ مَعْفُورًا عَنْهُ مَا عَمَلَهُ غَيْرَ مَكْتُوبٍ عَلَيْهِ.

وَمِثْلُ ذَلِكَ قَوْلُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعُمَرَ فِي قِصَّةِ حَاطِبٍ: ”مَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ اللَّهَ قَدْ أَطَّلَعَ عَلَى أَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ: اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ“.

(شرح مشکل الآثار: ۲/۳۳۱)

اقوال المحدثین:

صاحب التعليق الصبیح امام توربشتی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ صبی (بچہ)

احکام کا مکلف نہیں ہے؛ لہذا استغفار کی اسے ضرورت نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں صبی کی طرف سے استغفار اس گناہ کے لئے ہے، جو بلوغ محفوظ میں بلوغ کے بعد گناہ کرنے کی وجہ سے لکھا جائے گا، تاکہ وہ گناہ سے پاک ہو جائے۔

وقال التولبشي عن الطحاوي أنه سئل عن معنى الاستغفار للصبيان مع انه لا ذنب لهم، فقال معناه السؤال من الله أن يغفره ما كتب في اللوح المحفوظ أن يفعل بعد البلوغ من الذنوب حتى إذا كان فعله كان مغفورًا إلا فالصغير غير مكلف لا حاجة له إلى الاستغفار. (التعلقى الصحيح: ۲/۲۳۶)

علامہ سندھی نسائی شریف کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ اس میں عموم مراد ہے، یعنی دعا میں تمام مسلمان مراد ہیں، یعنی دعا میں تمام مسلمان کو شامل کرنا مقصود ہے، اور اسی طرح ”عمون المعبود شرح ابی داؤد“ میں بھی ابن حجر کئی کا قول نقل کیا گیا ہے۔

وقول ”وصغيرنا وكبيرنا“ المقصود منه التعميم فلا اشكال بانه المغفرة مسبوقه بالذنوب فكيف تتعلق بالصغير ولا ذنب له.

(حاشیہ الامام السندهی علی هامش السنن النسائی: ۴/۷۵)

اور ”بلوغ المعانی“ میں ذکر ہے کہ بچہ واقعی احکام کا مکلف نہیں ہے، تو اس پر گناہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا؛ لیکن حدیث الباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کی طرف سے استغفار کرنا رفع درجات کے لئے ہے۔

ان الصغیر غیر مکلف لا ذنب له فما معنی الاستغفار له؟ فالجواب: أن الاستغفار فی حق الصغیر لرفع الدرجات.

ایک جواب یہ ہے کہ یہاں صغیر سے نوجوان اور شیخ کبیر مراد ہے۔ (بلوغ الامانی علی هامش

اسی طرح مولانا عبدالرحمن مبارکپوری نے لکھا ہے کہ:

بچوں کے لئے استغفار کرنا درجات کی بلندی کے لئے ہے، اور یہاں صغیر سے شاب (نوجوان) اور کبیر سے شیخ (بوڑھا) مراد ہے۔

ہاہنا إشکال وهو أن الصغیر غیر مکلف لا ذنب له، فمما معنی الاستغفار له و ذکر وا

فی دفعه وجوها، فقیل المراد بالصغیر والكبیر الشاب والشیخ. (تحفة الأحرذی: ۳۰/۳)



باب :- ۱۴۸

بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رَوَى عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَوْلِهِ فِي الصَّلَاةِ عَلَى
الْمَيِّتِ مَخْلُوطًا بِالدَّعَاءِ لَهُ: "وَلَا نَعْلَمُ إِلَّا خَيْرًا"

﴿میت کے لئے دعاء خیر کرنے کی ترغیب﴾

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْحَارِثِ، عَنْ أَبِيهِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي الصَّلَاةِ:
"اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِأَحْيَائِنَا وَأَمْوَاتِنَا، وَأَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا، وَالْأَلْفَ بَيْنَ قُلُوبِنَا، اللَّهُمَّ هَذَا عَبْدُكَ فُلَانُ
ابْنُ فُلَانٍ وَلَا نَعْلَمُ إِلَّا خَيْرًا، وَأَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ فَاعْفِرْ لَنَا وَ لَهُ" فَقُلْتُ أَنَا، وَكُنْتُ أَصْغَرَ الْقَوْمِ: فَإِنْ
لَمْ يَكُنْ يَعْلَمُ خَيْرًا؟ قَالَ: "فَلَا يَقُولُ إِلَّا مَا يَعْلَمُ". (شرح مشكل الآثار: ۲/۳۳۳)، ورواه الطبراني
في "الكبير": (۲۲۶۵)

خلاصہ الحدیث:

اسلام میں ہر عمل کا صلہ اور ثواب متعین اور مقدر ہے، کبھی اس میں نیت اور اخلاص کے اعتبار سے اضافہ بھی ہوتا ہے، اسی طرح بعض اعمال وہ ہیں، جو بظاہر معمولی ہیں، مگر ان کا اجر اللہ کے پاس بہت زیادہ ہے، ان میں ایک عمل نماز جنازہ ہے، جس کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو شخص کسی جنازہ کے ساتھ اس وقت تک شریک رہتا ہے، جب تک اس پر نماز نہ پڑھی جائے، اس کے لئے ایک قیراط کا اجر ہے، اور جو تدفین تک شریک رہتا ہے، اس کے لئے دو قیراط کا اجر ہے۔

چوں کہ قرآن مجید میں مُردہ مومنین و مومنات کے بارے میں حسن ظن رکھنے کا حکم ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محاسن اور خوبیاں ذکر کرنے کی ترغیب دی، اور مردوں کو بُرا اور لعن طعن کرنے سے منع کیا ہے، ”لا تسبوا الاموات فانهم قد افضوا الی ما قدمها“ (مشکوٰۃ شریف) (مردوں کو بُرا مت کہو، کیوں کہ انہوں نے (اعمال کی صورت میں) جو کچھ آگے بھیجا وہ اس کے بدلہ کو پہنچ گئے) البتہ محاسن نیکیاں ذکر کرنے کی ترغیب دی ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث الباب میں مردوں کے لئے دعاء کی، اور اسی کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کسی کے جنازہ میں شرکت کرتے، تو اس کے لئے دعاء خیر کرتے اور یہ کہتے کہ ”وَلَا نَعْلَمُ إِلَّا خَيْرًا“ ہم اس کے بارے میں خیر ہی جانتے ہیں۔

اشکال:

حدیث الباب میں جہاں ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کے لئے دعاء مغفرت کی ہے، وہیں دوسری طرف یہ جملہ ”وَلَا نَعْلَمُ إِلَّا خَيْرًا“ (ہم بھلائی کے علاوہ نہیں جانتے) فرمانا محل غور و طلب اور محل وضاحت ہے، کیوں کہ تمام میت اعمال کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے، بعض اچھے ہوتے ہیں، تو بعض گنہگار، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سب میت کے بارے میں خیر کا علم رکھنا کیسے درست ہوگا؟

جواب:

امام طحاویؒ لکھتے ہیں کہ حدیث الباب میں ”وَلَا نَعْلَمُ إِلَّا خَيْرًا“ کے معنی کے سلسلہ میں حضرت حارثؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریح کی، تب اس کا معنی واضح ہوا۔ جیسا کہ میمون بن مہرانؓ کی روایت میں ہے کہ جس میت کے بارے میں خیر کا علم نہیں ہوتا اس کی نماز جنازہ میں ”وَلَا نَعْلَمُ إِلَّا خَيْرًا“ نہیں کہتے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خواہش پرست

لوگوں کی نماز جنازہ میں جب دعاء پڑھتے تو صرف یہ دعا ﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ﴾ (غافر: 7) پر اکتفا کرتے، البتہ آپ جب اپنے محبوب صحابہ کی جنازہ میں شریک ہوتے، تو اپنے اجتہاد اور صوابدید سے جو چاہتے وہ دعاء پڑھتے۔ (شرح مشکل الآثار: ۲/۲۳۴)

چونکہ جب کسی کی موت ایمان کی حالت میں ہوتی ہے، تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، اور ”اذکروا محاسن موتاكم“ کے تحت اس کے محاسن و خوبیاں بیان کی جائے گی، اور ”ظنوا بالمؤمنین خیراً“ کی بنیاد پر حسن ظن گمان کیا جائے گا، چاہے دنیا میں اعمال کے اعتبار سے اچھا ہو یا بُرا، اسی بنیاد پر مال غنیمت میں خیانت والے اشخاص کی نماز جنازہ پڑھنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا، ہاں اگر کوئی شخص زندگی میں دین اسلام سے نکل چکا تھا اور کفر کی حالت میں موت ہوئی، تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ: وَأَهْلُ الْأَهْوَاءِ هَؤُلَاءِ هُمُ الَّذِينَ لَا يَخْرُجُونَ بِهَا مِنَ الْإِسْلَامِ وَلَا يَمْنَعُهُمْ وَإِنْ كَانُوا مَدْمُومِينَ بِهَا مِنَ الصَّلَاةِ عَلَيْهِمْ كَمَا يُصَلِّي عَلَى مَنْ سِوَاهُمْ مِنَ الْمَدْمُومِينَ مِنَ أَهْلِ الْإِسْلَامِ، كَمَا قَدْ ضَلِّيَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبِأَمْرِهِ عَلَى مَنْ غَلَّ فِي سَبِيلِ اللَّهِ مِنْ مَا ذَكَرْنَا فِي مَا تَقَدَّمَ فِي كِتَابِنَا هَذَا، فَأَمَّا مَنْ كَانَ عَلَى شَيْءٍ مِنَ الْأَهْوَاءِ مِنْ مَا يُخْرِجُ مِنَ الْإِسْلَامِ فَلَا يُصَلِّي عَلَيْهِ فَإِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِ الْأَدْيَانِ الَّتِي يُصَلِّي عَلَى أَهْلِهَا، وَبِاللَّهِ التَّوْفِيقُ. (شرح مشکل الآثار: ۲/۳۳۴)

علامہ شوکانیؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

میت اپنے وارثان کی دعا اور ایصالِ ثواب کا محتاج ہوتا ہے، چاہے وہ دنیا میں اچھا تھا، یا

بُرا، حتی کہ اگر وہ گنہگار اور فاسق تھا، تب بھی اس پر لعنت کرنا درست نہیں، ہاں اگر میت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے، تو مصلی اس کے لئے دعائیں یہ کہے ”اے اللہ اگر وہ اچھا ہے، تو اس کی اچھائی اور خیر میں اضافہ فرما، اور اگر بُرا ہے، تو اس کی معافی و بخشش تو ہی کر سکتا ہے اور تیرے لئے یہ زیادہ مناسب ہے۔“

”فاخلصوا له الدعاء“ فیہ دلیل علی انه لا يتعين دعاء مخصوص، وانه ينبغي للمصلى على الميت أن يخلص الدعاء له سواء كان محسناً أو مسيئاً، فإن ملابس المعاصي أحوج الناس إلى دعاء اخوانه وافتقرهم إلى شفاعتهم، ولذلك قدموا بين ايديهم وجاءوا به اليهم لا كما قال بعضهم إن المصلى يلعن الفاسق، وتقصر في الملبس على قوله اللهم إن كان محسناً فزده احساناً، وان كان مسيئاً فانت أولى بالعتو عنه. (نيل الأوطار: ۲۸/۳)



